دَورِ حاضر کی بلند پایہ پیشکش

امامت و ملوکیّت

در جواب

خلافت و ملوکیّت

مُصنّفہ

حُجۃ الاسلام والمسلمین استاد العلماء والمجتہدین رئیس المفسرین آیۃ اللہ علامہ حسین بخش مدظلہ العالی

بانی ۔ جامعہ علمیہ بابُ النجفّ جاڑا ضلع ڈیرہ اسماعیل خان

ناشر

مکتبہ انوار النجف دریا خان ضلع بھکر

نام مصنف ——— علامہ حسین بخش جاڑا

نام کتاب ——— امامت وملوکیت

طبع ——— الغدیر پریس سرگودہا

تعداد ——— ایک ہزار —

اشاعت ششم ——— اگست ۱۹۹۱ء

قیمت ———

ناشر

مکتبہ انوار النجف دریا خان ضلع بھکر

سالانہ برسی علامہ صاحب

———

$\frac{15}{16}$ شوال۔ بمقام درسگاہ امامیہ ڈیرہ روڈ دریا خان ضلع بھکر

پیش لفظ

خلافت و ملوکیت جب الگ کتابی صورت میں شائع ہوئی تو علمی حلقوں میں اس کا بڑا چرچا ہوا۔ مودود
سے نظریاتی اختلاف رکھنے والے بعض اہلسنت حضرات پر یہ کتاب بجلی بن کر گری چنانچہ اس کی تردید میں
جوابات لکھے گئے۔ شیعہ حضرات نے اس کتاب کو خوب سراہا۔ بالخصوص جہاں کتاب مذکور میں اموی خلفا
کی گئی شیعوں کے لیئے اس نے نوید مسرت کا کام کیا۔ مجھے میرے محترم دوست سید محمد علی شاہ، خلف الرشید سید
شاہ مرحوم چک ۲۱ تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا نے اس کتاب کے مطالعہ کی دعوت دی شاید انہیں یہ توقع ت
میں بھی کتاب مذکور کو الہامی دستاویز قرار دے کر مصنف کی تحقیق انیق اور اس کے اچھوتے انداز کی داد دیتے
ہوئے اس کے مداحوں میں شامل ہو جاؤں یا کم از کم اس کی توثیق کر دوں۔ لیکن شاہ صاحب کی حیرت کی حد نہ ر
جب میں نے کتاب مذکور کے مطالعہ کے بعد اس کتاب کو ملت جعفریہ کے لئے سم قاتل قرار دیا۔ اور میں نے اسی وقت
کہہ دیا کہ اس کی تردید واجب و لازم ہے ورنہ کالج کی فضا میں پلنے والے نوخیز و خالی الذہن شیعہ نوجوان اس سے
متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے اور پھر الجھے ہوئے اذہان کا رو بہ اصلاح ہونا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو
جائے گا۔ چنانچہ شاہ صاحب موصوف نے کتاب مذکور کا جواب باصواب لکھنے کی پرزور تاکید فرمائی اور اس
کی طباعت و اشاعت کے جملہ مصارف کے برداشت کرنے کا بھی وعدہ فرمایا۔ اور جب متعدد پڑھے لکھے شیعہ
طبقہ سے تبادلہ خیالات کا اتفاق ہوا تو میں نے اکثر شیعہ نوجوانوں کو خلافت و ملوکیت اور اس کے مصنف کی
تحقیق و تدقیق اور طرز نگارش کا مداح پایا۔ بس میں نے عزم صمیم کر لیا کہ اس کی تردید ضرور کی جائے تاکہ متوہم
خطرہ مستقبل قریب میں حقیقت کا لباس نہ پہن لے۔ میں نے جواب میں غیر ضروری بحثوں میں وقت ضائع کرنے
سے پوری طرح گریز کیا ہے صرف مقام اختلاف کو نہایت تہذیب و متانت کے لہجہ میں واضح کیا ہے۔ اور
مودودی صاحب کے نظریات کو ان کی اپنی تحقیق کی روشنی میں باطل ثابت کیا ہے۔ نہ مضامین میں اس قدر طول
ہے کہ طبیعتوں کے لئے باعث ملول ہو اور نہ اس قدر اختصار ہے کہ مطلب فہمی مشکل ہو جائے۔ خدا کرے قارئین
کرام اس کو سمجھنے اور اس میں سنجیدگی سے غور کرنے کی کوشش کریں اور جہاں میری دلیل میں سقم ہو مجھے مطلع
فرما دیں کیونکہ میں اپنے آپ کو غلطی سے بالاتر نہیں سمجھتا۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

(علامہ) حسین بخش

پرنسپل دارالعلوم محمدیہ بلاک نمبر ۱۹ سرگودھا

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسانی تمدّن اور نظریہ توحید

وجود انسانی میں جذب و دفع اور محبت و نفرت کے فطری تقاضے نفوس زکیہ و عقول صحیحہ کے لئے دعوتِ فکر و عمل کے دائمی محرک ہیں اور تمدنی زندگی کی راہوں کو ہموار کرنے کے لئے انہی فطری تقاضوں کو بنیادی حیثیت دے کر آگے بڑھنا پڑتا ہے اور چونکہ افکار و انظار میں اتحاد و یگانگت بھی فطرتِ انسانیہ کے خمیر سے بالکل بیگانہ ہے لہٰذا تمدنِ انسانی میں عادلانہ روش کی تلاش نہایت مشکل مرحلہ ہے۔ پس وہ مرکز جس پر تمام عقول و افکار کی تگ و دو کی انتہاء ہو اور وہ واحد نقطہ جس پر جہات مختلفہ سے سوچ و بچار کے خطوط آکر جمع ہوں۔ وہ صرف نظریہ توحید ہے۔

قرآن مجید نے تمدن انسانی کے توازن کو قائم کرنے اور برقرار رکھنے کے لئے جن سیاسی خطوط کی نشاندہی کی ہے ان سب میں عقیدہ توحید کو بنیادی حیثیت حاصل ہے وہ اللہ جو تمام مخلوق کا خالق ہے۔ فرش سے عرش تک تمام کائناتِ علویہ و سفلیہ کا موجد ہے اور ہر ذی روح و غیر ذی روح کو خلعتِ وجود عطا کرنے والا ہے جس طرح وہ خلق و تدبیر میں یکا و تنہا ہے اسی طرح حکومت و سلطنت میں بھی لاشریک ہے وہ جس طرح تکوینی نظام میں اختیاراتِ کلیہ کا حامل ہے اسی طرح انسانوں کے تشریعی امور میں بھی حق حکومت صرف اسی کی ذات میں محصور ہے اور انسان کی زندگی کے اختیاری شعبوں میں اگرچہ وہ بزور اپنی حکومت کو مسلّط نہیں کرتا تاہم اس میں شک نہیں کہ انسانی تمدن اور اس کی بقا اور ارتقا کے لئے جو قوانین و ضوابط اس کی طرف سے مقرر ہوں گے وہ لافانی مصالح پر مشتمل ہونے کے ساتھ ساتھ ایسے عادلانہ اور منصفانہ نظامِ عمل کے خطوط ہوں گے جن پر چلنے والا انسان کبھی بھی زندگی کی دشوار گذار گھاٹیوں میں ٹھکنے نہ پائے گا اور ان کو اپنانے والا معاشرہ کبھی مشکلات و مصائب میں مایوسیوں کا شکار نہ ہو گا۔ ان میں مساوات بھی ہو گی اور حقوق کی نگہداشت بھی ہو گی۔ وہاں مساوات کا تصور حقوق کی برقراری سے متصادم نہیں ہوتا اور حقوق کی حفاظت مساوات سے ٹکر نہیں لیتی۔ طبقاتی زندگی میں ہر طبقہ فرائض و احکام کی بندشوں میں ایسی مضبوطی سے جکڑا ہوا ہوتا ہے کہ زبردست و زبردست بھائی بھائی نظر آتے ہیں۔ آقا۔ آقا ہونے کے باوجود غلام کو اس طرح سینے سے لگاتا ہے کہ اس میں احساسِ کمتری پیدا ہی نہیں ہونے پاتا اور غلام غلام ہونے کے باوجود اپنے آقا کے

بدوش بدوش معاشرتی معاملات میں اس کا ہاتھ بٹاتے ہوئے اپنے اندر فخر کی ایسی جھلک محسوس کرتا ہے کہ وہ اسے غلامی کے تصور سے بے نیاز رکھتی ہے اور ایسی پرسکون اور اطمینان بخش زندگی ایسے نظامِ عمل کے سوا ناممکن ہے۔

وجوہِ اختلاف فطری طور پر جذبۂ تسخیر موجودات جو انسان کے اندر موجود ہے وہ قوتِ فکر و ادراک کو علومِ مناسبہ اور فنونِ لائقہ میں دسترس حاصل کرنے کے لئے بے چین رکھتا ہے تاکہ تسخیر کی راہیں ہموار ہو سکیں اور یہی جذبہ انسانی قویٰ و مشاعر کو ہمیشہ متحرک رکھتا ہے۔

نیز جذب و دفع کے جذبات بھی فطری ہیں کہ ہر انسان اپنے لئے محبوب و مرغوب کی تحصیل کا خواہاں اور مکروہ و ناپسند سے گریزاں ہوتا ہے پس یہی فطری جذبات جہاں ایک آدمی کو آگے بڑھنے کی دعوت دیتے ہیں وہاں اُسے راستہ روکنے والی ہر طاقت سے ٹکرانے کی پیش کش بھی کرتے ہیں اور تحصیل مرغوب و محبوب کا جذبہ فطری طور پر کسی شریک کو پسند نہیں کرتا پس ہر وہ انسان جو دوسرے انسان کی محبوب و مرغوب چیز میں شریک ہونے کی کوشش کرے وہ اس کا دشمن قرار پاتا ہے اور جو شخص کسی کی مرغوب و محبوب چیز کی تحصیل میں مدد کرے وہ اس کا دوست ہوتا ہے۔ پس فطری طور پر ہر انسان چاہتا ہے کہ دنیا کی ہر اچھی چیز میرے لئے ہی ہونی چاہیے اور جو بھی اس خواہش میں میرا شریک بننا چاہے یا میرا راستہ روکنا چاہے اس کے ساتھ الجھنا لڑنا اور اس کو راستہ سے ہٹانا میرا فطری حق ہے کیونکہ ہر انسان کا جذبۂ خود پسندی اس امر کا مقتضی ہے کہ جو چیز وہ اپنے لئے پسند کرے اس میں اس کا کوئی شریک نہ ہو۔

اس کے ساتھ ساتھ انسان میں ایک قوت حاکمہ بھی موجود ہے جسے قوتِ عاقلہ کہا جاتا ہے وہ ان جذب و دفع کی قوتوں پر کنٹرول کرنے پر قادر ہے اور وہی انسانیت کا جوہر اور باقی حیوانات سے امتیازی نشان ہے۔ پس جہاں اپنی ذات کے لئے طلب منفعت اور استخدام موجودات کی طرف پیش قدمی کی دعوت انسان کے جذبۂ فطرت کی آواز ہے وہاں تجاوزِ حدود سے اجتناب شرافت و دیانت کی رعایت تمدنی مساوات اور اتحاد و یگانگت صلح و آشتی اور عدل و انصاف کے اصولوں سے تمسک عقلِ فطری اور اس کی صالح ضمیر کا فیصلہ ہے۔ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰهَا (اس نے نفس انسانی کو برائی اور نیکی کا الہام کر دیا ہے) اور انسان کے مدنی الطبع ہونے کا یہی مقصد ہے افرادِ انسانی چونکہ قوت و ضعف میں یکساں نہیں ہیں اور جس طرح ان کی ظاہری قوتوں میں فرق ہے اسی طرح ان کے باطنی مشاعر یعنی دل و دماغ اور حس و شعور وغیرہ میں بھی کافی اختلاف ہے۔ پس جذبہ

فطرت اگرچہ سب میں یکساں ہے لیکن اس کی طرف اقدام کرنا اور حدِ کامیابی تک پہنچنا ہر ایک کے بس کی
بات نہیں۔ ہر شخص اپنی ظاہری قوت اور دماغی صلاحیت کے ماتحت اپنی ہمت کے قدموں پر چل کر
مقصود تک رسائی پا سکتا ہے اور ہر طاقتور اپنے راستہ میں حائل ہونے والے ہر کمزور کو کچل کر
بڑھنے کی فکر میں ہوتا ہے۔ اور جب جذبات اُبھر جائیں اور خواہشات طشت از بام ہو جائیں تو عقل
کے فتویٰ پر عمل کرنا مشکل ہوتا ہے بلکہ عقل کا تو ایسے حالات میں ناطقہ بند ہو جاتا ہے پس وہ کنجِ تنہائی
میں سر منہ ڈھانپے ہوئے بے بس قیدی کی طرح خواہشات و جذبات کے پنجرہ میں محبوس ہو کر رہ جاتی
ہے۔ اور انسانیت شترِ بے مہار کی طرح ظلم و جور کی تاریک اور گھناؤنی وادیوں میں سرگرداں ہو کر اپنی
ہلاکت کے اسباب مہیا کرنے لگتی ہے۔ کسی طرف ظالمانہ گرج اور جابرانہ شور بلند ہوتا ہے اور کہیں مظلومانہ
آہیں اور پُر درد کراہتی ہوئی آوازیں گونجنے لگتی ہیں۔ اس بے راہ روی اور جور و اعتساف سے بچنے کے
لئے دو حل تلاش کئے گئے ہیں۔ ۱۔ تعلیم و تربیت۔ ۲۔ قانون۔

قانون سازی میں نظریاتی اختلاف

عقول انسانیہ امزجہ و طبائع کے اختلافات جذب و دفع کے تقاضوں میں کشمکش اور تمدنِ انسانی کے
غیر تسلی بخش حالات کا جائزہ لیتے ہوئے جہاں تعلیم و تربیت کو ضروری قرار دیتی ہیں وہاں قانون کی بالادستی
کی افادیت پر بھی یقین کامل رکھتی ہیں لیکن قانونی نوعیت کیسی ہو اور اس کی تشکیل و ترویج کے لئے بنیادی
حیثیت کس نظریہ کو دی جاتے یہ ایک ایسا ٹیڑھا مسئلہ ہے جس کو حل کرنے میں عقول و افکار مسلسل طولانی
جنگ کر رہے ہیں اور بظاہر اس کا صحیح نتیجہ پر ان کا پہنچ جانا بھی محالات میں سے ہے اور یہ ایک ایسا عقدۂ
لاینحل ہے جس کو تدبیر کے ناخنوں سے کھولا نہیں جا سکتا جب تک اصل بنیادی غلطی کا سراغ نہ لگایا جائے
اس کی بھی مثال یوں سمجھئے کہ جس طرح مختلف الخیال لوگوں پر مشتمل ایک قافلہ کسی دور دراز منزل
کی طرف کسی مقصد کی خاطر زادِ راہ اور ضروری لوازمِ سفر ساتھ لے کر گامزن ہو اور اثنائے راہ میں ضروریات
و لوازم کی کمی بیشی یا طریق استعمال میں اختلافِ آراء کے پیشِ نظر ان کے درمیان پھوٹ پڑ جائے اور
حالات بگڑتے بگڑتے یہاں تک عزت لوٹ کھسوٹ مار دھاڑ اور قتل و غارت تک نوبت پہنچ جائے
اور اس قسم کے ناگفتہ بہ حالات کا جائزہ لیتے ہوئے اربابِ حل و عقد اپنی عزت و ناموس اور جان و مال کی
حفاظت اور پورے قافلہ والوں میں امن و سلامتی اور اتحاد و یگانگت کی راہیں ہموار کرنے کے لئے آپس میں
سر جوڑ کر مجلسِ مشاورت منعقد کریں اور متفقہ طور پر ایک ایسے دستور العمل کی تشکیل کریں جو قافلہ کے ہر فرد
کے لئے قابلِ قبول ہونے کے علاوہ ان کی جان و مال و عزت کے تحفظ کا ضامن بھی ہو اور سکون و اطمینان

اور امن وسلامتی کا علمبردار بھی ہو تو بنیادی طور پر صرف دو نظریے ہی سامنے آتے ہیں جو قانون کی اصل و
اساس قرار دئے جا سکیں۔ ایک یہ کہ قافلہ کے ہر فرد کی شخصی ملکیت کو ختم کر دیا جائے اور اس کی انفرادی خصوصیت
کو نظر انداز کرتے ہوئے ہر چیز اور ہر حق میں مساوات کا علم بلند کیا جائے۔ اور ہر شے پر ہر شخص کو حقِ تصرف
دے دیا جائے تاکہ سفر کا بقیہ وقت امن وسکون سے پاس ہو کیونکہ ہر شخص کو پتہ ہے کہ منزلِ مقصود
پر رسائی کے بعد لوازمِ سفر اور ضروریاتِ راہ کی افادیت ختم ہو جائے گی اور ہر فرد ان سے بے نیاز ہو
جائے گا لہٰذا شخصی ملکیت اور انفرادی تخصص کو سرے سے ہی ختم کر دیا جائے جو باہمی رفاقت اور
امن وآشتی کے لئے باعثِ خطرہ ہے۔ اور یہ ہے نظریہ اشتراکیت اور اس کے مقابلہ میں دوسرا نظریہ
ہے کہ ہر شخص کی انفرادی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے ضابطۂ قانون کو ایسے خطوط پر مرتب کیا جائے
کہ ہر شخص اپنی اپنی متعینہ حدود کا پابند ہو جائے اور باہمی ہمدردی اور رواداری کی مدد سے سفر کی باقی
منازل کو چین وآرام سے گذارنے کا بندوبست کیا جائے۔

وجہ اشتباہ

ان ہر دو نظریات میں خواہ کس قدر ہی خلوص کا جذبہ کارفرما ہو۔ آخر قوانین وضوابط
کا ڈھانچہ تیار کرنے والے پھر بھی وہی انسان ہیں جن کو جذبِ منفعت اور دفعِ
مضرت کے فطری جذبہ سے مستثناء نہیں قرار دیا جا سکتا اور سابق ہر دو نظریے اس مبنیٰ پر قائم ہیں کہ انسانی
زندگی صرف دنیاوی چند لمحات پر منحصر ہے اور اس کے بعد کچھ نہیں۔ پس مبداء ومعاد کی حقیقت سے ناواقفیت
یا چشم پوشی ہی زندگی کے ہر شعبہ میں انسانی ذہن کی تشویش کی موجب ہوتی ہے اور عقیدۂ توحید سے انحراف
اور غرضِ خلقت سے روگردانی کبھی تمدن انسانی میں سکون وچین کو جنم نہیں دے سکتی۔ ہزار قانون بنائے
جائیں لاکھ ضابطے تیار کئے جائیں لیکن حرص وہوس، جذبات وخواہشات اور خود غرضی ونفس پرستی
کے افسوس ناک نتائج سے محفوظ رہنا ناشدنی امر ہے اور جور واعتساف اور ظلم واستبداد کی ناخوشگوار
فضا سے باہر نکلنے کا تصور اور انسانیت کے لئے امن وسکون کے مقام کی تلاش صرف خوش فہمی بلکہ خود فریبی
کے مترادف ہے۔ بے شک قہر وغلبہ سے نچلے طبقہ کو دبایا جا سکتا ہے ان کی زبانوں پر پہرہ بٹھایا جا
سکتا ہے اور ان کو اپنی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی قلبی ہم آہنگی اور سچی وفاداری
حاصل کرنا صرف مشکل ہی نہیں بلکہ محال امر ہے اور جس نظریے کے حامیوں کے ہاتھ اقتدار پر اپنی گرفت کو
مضبوط کر لیں ان کا قانونی شکنجہ تمام ماتحت افراد کو اگرچہ بے راہ روی سے روکنے میں موثر ثابت ہو
سکتا ہے لیکن حکمران گروہ اور برسرِ اقتدار طبقہ کو بدعنوانیوں سے روکنے والا کون سا قانون ہو گا جب کہ
قانون ساز بھی وہ خود ہیں اور قانون باز بھی وہی اور ایسے حالات میں اگر رعایا میں کچھ حس وشعور ہو تو وہ

کیونکہ حکمرانوں سے مطمئن ہوں گے اور حکمران اگر دانا ہوں تو وہ کیوں اس فریب میں رہیں گے کہ اس رعایا کا ہر فرد حکومت سے مطمئن ہے؟

پس جب تک یہ تصور نہ ہو کہ ہمیں کوئی پوچھنے والا بھی ہے اور اس عارضی زندگی کے بعد ہمیں ایک ذات کے سامنے جواب دہ بھی ہونا ہے اور ہمارے لئے نیکی کی جزا اور بدکرداری اور بے راہ روی کی سزا بھی ہے تو یقیناً تمدن میں اعتدال پیدا نہیں ہو سکتا پس توازن و اعتدال اور سکون و اطمینان کی فضائیں تب ہی پیدا کی جا سکتی ہیں جب عقیدۂ توحید پر اس ساری عمارت کی بنیاد کھڑی کی جائے۔ عوام کو بھی خدا کے سامنے جوابدہ ہونے کا خوف ہو تاکہ حقوق معاشرہ حقوق نفس اور حقوق تمدن کی ادائیگی میں حکومت سے بھرپور تعاون کرنا اپنا ایمان سمجھیں اور حکمران طبقہ کو بھی یہی خوف دامن گیر ہو کہ ہم نے اپنی ہر بے راہ روی پر اللہ کے سامنے جوابدہ ہونا ہے پس وہ اپنے فرائض منصبیہ کی ادائیگی کو اپنا ایمانی فریضہ سمجھیں اور حکومت کی کلیدی اسامیوں پر تعیناتی حکومت کے نکتہ نگاہ سے نہیں بلکہ خدمتِ خلق کے پیش نظر قبول کریں ایسی صورت میں ناممکن ہے کہ رعایا حکومت سے مطمئن نہ ہو یا حکومت رعایا کے تعاون سے محروم ہو۔

اسلامی آئین انسان کے مدنی الطبع ہونے کے پیش نظر اجتماعی زندگی کے لئے قابل قبول اُصول کی تشکیل میں نظریات کا باہمی تصادم ہر دور کے عقلاء کے لئے باعث تشویش و اضطراب بنا رہا اور دانشور طبقہ ہمیشہ انسان کی فلاح و اصلاح ، بقا و ارتقا کے لئے کامیاب و پُرسکون اجتماعی زندگی کے نظامی قوانین و ضوابط پیش کرتا رہا لیکن روز اول سے قیامت تک کے لئے اسلام نے انسان کی تمدنی زندگی کا جو نظام پیش کیا ہے وہ تمام عقلائی تدابیر اور امکانی مصالح پر حاوی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ انسانیت نے پرچم اسلام کے نیچے جو سکون پایا وہ اسے اور کہیں نہ مل سکا۔

اشتراکیت کا نظریہ بھی انہی نظریات میں سے ہے جو سیاست مدنیہ اور ریاست ملکیہ میں اجتماعی نظام زندگی کے لئے اچھے اور موثر اصول نافذ کر کے انسانی افراد کے لئے امن و آشتی کی راہیں ہموار کرے۔ اس کا بنیادی نقطۂ نظریہ ہے کہ دنیا کی ہر شے ہر ایک کے لئے ہے اور ہر چیز میں ہر فرد برابر کا شریک ہے۔ اس نظریے میں صرف انسان کا حیواناتی پہلو ملحوظ رکھا گیا ہے اور اس کے امتیازی نشان کو سرے سے نظر انداز کیا گیا ہے کیونکہ ہر شی کا ہر ایک کے لئے ہونا مسلم طور پر حیوانی متخیلات میں سے ہے حیوان کے نظریے میں زمین کی کسی پیداوار پر شخصی ملکیت کا دعویٰ ناجائز ہے وہ ماکول و مشروب اور ازدواجی تعلقات کے معاملہ میں تخصیصات کے دشمن ہیں لیکن بخلاف اس کے انسان میں عقل و ادراک کا جوہر اور شعور و امتیاز کا ملکہ جو حیوانی زندگی میں اشتراکی نظریے کو خوب سمجھتا ہے

اس نے شخصی ملکیت کے نظریہ کو اپنایا اور عقلائے زمانہ اسی نظریہ کے ماتحت تمدن واجتماع کی اصلاح وفلاح کے لئے ہمیشہ سے قوانین مرتب کر کے نافذ کرتے رہے۔

لیکن انسان خواہ کس قدر دانا اور دانشمند ہی کیوں نہ ہو انسانی اجتماعی زندگی کے اچھے اور بُرے تمام پہلوؤں پر محیط نہیں ہو سکتا۔ لہذا نہ وہ ہر پیش آمدہ خرابی کا سد باب کر سکتا ہے اور نہ ہر امکانی مصلحت وخوبی کے نفاذ کا پروگرام تیار کر سکتا ہے کیوں کہ انسان کے انفرادی واجتماعی جملہ مصالح ومفاسد پر کلی اطلاع اس کے دائرہ امکان سے باہر ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ عقلاء زمانہ کے وضع کردہ قوانین ہر دور میں تنسیخ وترمیم کی زد میں آتے رہے اور ایک وقت میں جو قانون انتہائی سوچ بچار اور بحث وتمحیص کے بعد مبنی بر اصلاح قرار پا کر نافذ ہوا وہی چند دنوں کے بعد ردی ناقص اور نقصان دہ ثابت ہو کر منسوخ ہو گیا اور جو قانون ساز اسمبلی اُسے چار دن پہلے مفید سمجھ کر نافذ کرا رہی تھی۔ وہی اسمبلی اس کے پیش آمدہ نقصانات سے مطلع ہو کر اُسے منسوخ کر کے ملک بدر کرنے کا حکم صادر فرما رہی ہوتی ہے اور اس جوڑ توڑ کے سیلاب رواں کا کوئی کنارہ نہیں ہے۔

اور اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ہر مقنن اپنے ذاتی جذبات ورجحانات کے ماحول میں تمدن کی اصلاح سوچتا ہے اور متعدد افراد کے جذبات ورجحانات میں وحدت ویگانگت بھی نہایت مشکل ہے۔ پس ایک دور میں جب یک گونہ جذبات میں اکثریت آگئی تو اقلیتی جذبات ان کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے اور قانون وہ پاس ہوا جو اکثریتی خواہشات کا آئینہ دار تھا اور اسے اجتماعی قانون قرار دیا گیا پھر تھوڑے عرصہ بعد جب اقلیت اپنے اثر ورسوخ سے یا معقول ردعمل سے اکثریت کا روپ دھارنے میں کامیاب ہو گئی تو سابق پاس شدہ قانون کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے دوبارہ مجلس مشاورت کے انعقاد کی دعوت دی گئی اور اکثریتی خواہشات کا ترجمان قانون سابق قانون کی جگہ مسند اقتدار پر براجمان ہو گیا اور عوام کی حیثیت بے بس بھیڑوں کی سی ہوتی ہے جب پہلے قانون کی لاٹھی سے ان کو ہانکا جاتا رہا تو ان میں سر اٹھانے کی مجال نہ تھی اب جو دوسرے قانون کی لاٹھی ان کے سروں پر بلند ہوئی تو وہ ویسے کے ویسے سہمے ہوئے نظر آئے۔ پس قانون تمدن جذبات کے اکثریتی میلان کا نام ہے خواہ اشتراکیت ہو یا ملکیت اور جمہوریت ہو یا شخصیت۔ قانون سازی کی رفتار اسی نہج پر رہی ہے اور لطف یہ کہ برسر اقتدار جماعت کی طرف سے ذاتی مفاد کی خاطر اور اپنے تئیں اس کی زد سے بچانے کی خاطر قانون میں بعض شقیں ایسی رکھ دی جاتی ہیں جو بوقت ضرورت کام میں لائی جا سکیں۔

اسلامی قوانین چونکہ خالق کائنات کی طرف سے وضع شدہ ہیں جو عالمی مصالح پر حاوی بھی ہیں اور جذبات وخواہشات کے ماحول سے بلند وبالا بھی ان میں یہ امکان نہیں کہ کسی قانون میں کوئی مصلحت عمداً جذباتی طور پر یا سہواً یا لاعلمی سے نظر انداز کر دی گئی ہو تاکہ تنسیخ یا ترمیم کی اس میں گنجائش پیدا کی جا سکے۔ البتہ رفتارِ زمانہ کے پیش نظر مصالحِ عامہ میں تبدیلی ناگزیر ہے جو موجب ترمیم یا تنسیخ ہو سکتی ہے اور ادیانِ سابقہ کی یکے بعد دیگرے منسوخ ہونے کی یہی وجہ ہے اور اب اسلام چونکہ آخری اور مکمل دین ہے لہٰذا اس کے قوانین وضوابط میں ایسی پختگی اور لازوال مصالح کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ ادوار و ازمنہ کا تفاوت ان کو قابل نسخ نہ بنا سکے۔ خدائی قوانین میں شخصی جذبات وانفرادی خواہشات کو دخل نہیں ہے اور نہ ان میں ایسی شقیں رکھی گئی ہیں جن سے بوقتِ ضرورت برسرِ اقتدار طبقہ فائدہ مند ہو سکے بلکہ ان میں تو وہ یکسانیت ملحوظ ہے کہ چھوٹے سے لے کر بڑے تک اور فقیر سے لے کر شہنشاہ تک سب کو ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے (اور دَورِ حاضر میں اسلامی مساوات کا نعرہ اگر اسی جذبہ کے ماتحت ہے تو نہایت مبارک ہے لیکن اگر اس کی پشت پناہی حسد کر رہا ہو اور صرف چند سیاسی حریفوں کی تذلیل کا سامان مہیا کر کے پھر رنگ رلیاں منانے کی سوچی سمجھی سکیم کو اپنانے کی راہیں ہموار کی جا رہی ہوں تو یہ محض فریب ہی فریب ہے)

ہر دَور میں برسرِ اقتدار طبقہ کا اکثریتی رجحان اسلامی نقطۂ نگاہ سے باغی رہا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی آئین میں لچک نہیں ہوتی اور ان میں بڑے بڑوں کے بچاؤ کے لئے کوئی استثناء نہیں ہوتا اس لئے وہ تمدنی قوانین میں من مانی کرنے پر مصر ہوتے ہیں تاکہ حکمران طبقہ کے جذبات پر پابندی عائد نہ ہو اور قانون ان کی خواہشات کو کچل نہ سکے اور یہی وجہ ہے کہ قانون نت نئے جنم لیتا ہے اور قانون سازی کی مشین ملک وملت کی تمدنی گاڑی میں نت نئے پُرزے تیار کر کے فٹ کر لیتی ہے۔ جس کی بدولت نہ انسانیت کو سکون نصیب ہوتا ہے اور نہ تمدن واجتماع کا کوئی اصلاحی پروگرام بارآور ہو سکتا ہے بلکہ ہر روز سورج نئے خطرے کا الارم لے کر طلوع کرتا ہے اور انسانیت کے مایوس وبدنما چہرے کا عکس لے کر دامنِ مغرب میں منہ چھپا لیتا ہے۔

اشتراکیت کے خوش نما لیبل سے اگر انسان مرعوب نہ ہو اور پردہ اُٹھا کر ذرہ اندر جھانک لیا جائے تو وہاں بھی خواہشات وجذبات کے پروگرام کی تکمیل کے علاوہ اور کچھ نہیں ملے گا۔ انداز بے شک نیا ہے اور روپ بالکل نرالا ہے لیکن ہوس وخواہش کے نتائج میں کوئی فرق نہیں وہاں بھی بڑے بڑوں کے جذبات کا احترام ہے اور چھوٹے چھوٹوں کی حیثیت ایک کس ... سے زیادہ نہیں ... سمجھ کہ

اشتراکیت ایک مضبوط آہنی پنجرہ ہے جس میں تمام انسانوں کو بے بس پرندوں کی طرح بند کر لیا جاتا ہے اور برسر اقتدار گروہ کو اس پنجرہ سے باہر اس کا نگراں سمجھا جاتا ہے پس قانون اشتراک کے پنجرے کی تاروں میں محبوس انسان حیوانیت کی زندگی گذارنے پر مجبور ہوتا ہے اور جس کے ہاتھ میں وہ پنجرہ ہے وہ ہر حیثیت سے آزاد ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اچھے محل ۔ عمدہ بیویاں ۔ خوبصورت لباس ، اعلیٰ مشروبات ، نفیس کھانے آرام دہ سواریاں اور قیمتی سامانِ آرائش پر صاحبانِ اقتدار کی اجارہ داری قائم رہتی ہے اور انہی لوازم زندگی میں سے ردّی اور ناقص اشیا عوام کے لئے ہوتی ہیں ۔ اور اس کھلے ہوئے فرق کے باوجود داعیان اشتراک ببانگِ دہل اعلان بھی کرتے ہیں کہ ہر شے ہر فرد کے لئے ہے اور ہر انسان کو مساوی طور پر حقوق ملنے چاہئیں

اشتراکیت یا جمہوریت یا آمریت یا شخصی سلطنت کے اندر عمومی اجتماعی زندگی سے وابستہ جملہ تمدنی قوانین میں مذکورہ کمزوریوں کی واحد وجہ یہ ہے کہ اصلاح تمدن کا مرکزی نقطہ نظروں سے غائب اور قانون تمدن کی اصل واساس آنکھوں سے اوجھل ہے اور وہ یہ کہ انسانی زندگی کی فلاح صرف اسی چند روزہ حیات فانی میں مرکوز سمجھی جاتی ہے اور عقیدہ توحید اور تصور مبدا و معاد کو یکسر نظر انداز کیا جاتا ہے ۔ اسلامی آئین کا دائرہ اسی فانی دَور تک محدود نہیں بلکہ اُخروی زندگی اس کا حقیقی مطمح نظر ہے اور دنیاوی زندگی اس کے لئے ایک عبوری دَور ہے پس اسلام اس عبوری دَور کی اصلاح اُس باقی و غیر فانی زندگی کے لئے ضروری سمجھتا ہے کیونکہ وہی انسان کے سکون کی حقیقی منزل ہے ۔ پس اسلام انسانی زندگی کے ہر شعبے میں حدود کو معین کرتا ہے اور چونکہ وہ خدائی قانون ہے لہٰذا ہر انسان خواہ چھوٹا ہو یا بڑا کمزور ہو یا طاقتور حاکم ہو یا محکوم اور ادنیٰ ہو یا اعلیٰ سب کے لئے ان حدود سے تجاوز کرنا ناجائز ہے ۔ پس قانونِ خداوندی میں حلال و حرام اور جائز اور ناجائز کا فرق ہے ۔ اسلام خواہشات وجذبات کو پنپنے کی کھلی اجازت نہیں دیتا بلکہ حدودِ متعینہ کی پابندی کا فریضہ عائد کرتے ہوئے اُسے ترقی کے میدان میں آگے بڑھنے کی دعوت دیتا ہے ۔ اسلام آزادی ضمیر پر پہرہ نہیں بٹھاتا بلکہ اُسے جائز طریقہ اور صحیح راستہ سے سوچنے اور کرنے کی کھلی اجازت دیتا ہے اور دنیا کو آخرت کی کھیتی قرار دے کر انسانی جذبات کو کچلتا نہیں بلکہ جذبات کے لئے صحیح خطوط معین کر کے اپنے اختیار سے ان خطوط پر گامزن ہونے کی دعوت دیتا ہے جو در حقیقت اس کے لئے نفع بخش اور فائدہ رساں ہوتے ہیں اور انہی کی پاسداری میں تمدن انسانی کی کامیابی کا حقیقی راز مضمر ہوتا ہے اور اجتماعی زندگی پرسکون ماحول میں گذر سکتی ہے پس انسان اُخروی زندگی پر نظر رکھتے ہوئے جذبات وخواہشات کی بڑی سے بڑی قربانی دینے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے اور جذبات و ہیجانات پر کنٹرول کرنا باہمی تصادم سے بچا کر انسان کی زندگی کو پرسکون بنا دیتا ہے اور اسلامی نظریہ کے

ماتحت ہر بڑا اپنے سے چھوٹے پر رحم کرنا سیکھتا ہے، اور ہر طاقتور کمزور کی دستگیری کے جذبہ کو اپناتا ہے لہٰذا طبقاتی محبت و انس میں اضافہ ہوتا ہے، چھوٹے کی بڑے سے اور کمزور کی طاقتور سے دوستی بڑھتی ہے اور یہی تمدنی زندگی کا کامیاب باب ہے بلکہ انسانیت کا اسے معراج کہا جا سکتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام میں غرباء طبقہ کے حقوق کی پامالی اسلامی نظریہ سے سخت متصادم ہے۔ اور اشتراکی طرز عمل میں طاقتور کو طاقت سے محروم کر کے اور دولت مند سے دولت غصب کر کے ان کو غرباء کے مساوی کرنا اسلامی تعلیم کے خلاف ہے کیونکہ اسلام تو ایک ایسا عادلانہ اور منصفانہ نظام حیات پیش کرتا ہے کہ پوری انسانیت کی اصلاح کا راز اس کے اُصولوں میں مضمر ہے۔ اسلام نے سرمایہ دار کے مال میں غرباء کے حقوق مقرر کر دئے ہیں اور عدمِ ادائیگی کی صورت میں جہاں اُسے دنیا میں اسلامی حکومت کے سامنے جوابدہ ہونا پڑتا ہے اس سے کہیں زیادہ اس کو روزِ محشر کی سزا کا خوف دلایا جاتا ہے۔ اور اپنے اختیار سے خیرات و سخاوت کا راستہ اختیار کرنے والے کے لئے جنت کی پیش کش کی جاتی ہے تاکہ انسان اپنی آزادیٔ ضمیر کو برقرار رکھتے ہوئے ایثار و سخاوت کے جذبہ سے غرباء پروری کے فریضہ سے سبکدوش ہو کر غرباء کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے اہل ہو۔ طاقتور اور دولت مند کو طاقت و دولت سے محروم کر کے مساوات و اشتراک کا علم بلند کرنے میں غریب طبقے کی ہمدردیاں حاصل کرنے سے زیادہ حسد و کینہ کے جذبات کی تسکین کا راز مضمر ہوتا ہے لہٰذا اسے انسانیت کی صحیح خدمت نہیں کہا جا سکتا۔ پس اسلامی آئین ہی انسانیت اور تمدن کا وہ جامع قانون ہے جس کے اپنائے بغیر کبھی چین و امن کا سانس نصیب نہیں ہو سکتا، اور اسلامی مساوات یہ نہیں کہ صاحبانِ ثروت کی دولت چھین کر ان کے معیارِ زندگی کو گھٹا کر ان کو غریبوں جیسا کر کے سب انسانوں کو غربت و افلاس کے شکنجے میں جکڑ دیا جائے بلکہ اسلامی مساوات یہ ہے کہ غرباء طبقہ کے لئے ترقی کی راہیں ہموار کی جائیں اور بلند طبقہ کی چیرہ دستیوں سے ان کو آزاد کر کے ان کا معیارِ زندگی بلند کیا جائے تاکہ سب انسان احساس کمتری سے بے نیاز ہو کر ایک دوسرے کے دوش بدوش چل سکیں

قرآنی ہدایات

قرآن مجید جو فلاح و اصلاحِ انسانی پر مشتمل مکمل ضابطۂ حیات اور دستورِ زندگی ہے اس کی تعلیمات کا بنیادی گر عقیدۂ توحید ہے۔ قرآن مجید میں بار بار مختلف طرق استدلال سے عقیدہ توحید کو مستحکم کیا گیا ہے کہ کل کائنات کا خالق مدبّر صانع و مُوجد اللہ ہے جو پوری کائنات کی خلقت صنعت تدبیر و احکام میں یکا و تنہا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں اور وہی اپنی ساری مخلوق کا واحد فرمانروا مدبّر اور منتظم ہے اور اس کی حکومت میں نہ کسی کا حصہ ہے اور نہ کسی کا کوئی

حق ہے اس کے ماسوا سب مخلوق اس کی محتاج اور اس کے سامنے نیاز مند ہے۔

۱ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ (انعام) وہ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے۔

۲ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ (رعد) کہہ دیجئے اللہ ہر شے کا خالق ہے۔

۳ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا۔ وہ وہی ہے جس نے تمہارے لئے وہ سب چیزیں پیدا کیں جو زمین میں ہیں۔

۴ اَلَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (البقرہ) وہ جس نے تم کو پیدا کیا اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا۔

۵ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اسی کی ملکیت میں ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔

۶ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ (السجدہ) آسمان سے زمین تک سب کی تدبیر وہی کرتا ہے۔

۷ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ۔ کہہ دیجئے امر (اختیار) سب اللہ کے پاس ہے۔

۸ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ (انعام) وہی اپنے بندوں پر غالب اور دانا و بینا ہے۔

آیاتِ قرآنیہ کے گنوانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ نظامِ کائنات میں کلی حکومت اسی ذات واجب الوجود کو حاصل ہے اور عالم کا پورا تکوینی نظام اسی کی حکومت کے ماتحت چل رہا ہے۔ باقی رہا انسانی زندگی کا تشریعی نظام اور تمدنی و انفرادی پروگرام تو اس میں بھی عقلی طور پر ثابت کیا جا چکا ہے کہ اللہ کی حکومت کے سوا کوئی بھی حکومت سکون و اطمینان کی موجب نہیں بن سکتی پس انسانی زندگی کے اختیاری اعمال و کردار اور اجتماعی یا انفرادی افعال و اعمال کے لئے ضابطۂ حیات اور قانونِ تمدن اسی ذات کا ہی وضع کردہ ہو جو تمام مصالح و مفاسد پر علم کلی و بصیرتِ تامہ رکھنے کی اہل ہے اور انسانیت بھی اپنے معراجِ کمال پر اس وقت پہنچ سکتی ہے جب اپنے خالق و مالک کے پیش کردہ ضابطۂ حیات کو اپنی زندگی کے لئے مشعلِ راہ قرار دے اور قرآن مجید نے اس بارے میں واضح اور غیر مبہم اعلان فرمایا ہے۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاهُ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ۔
حکم اللہ کے سوا کسی کے لئے نہیں ہے اس کا امر ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو اور یہی صحیح دین ہے (یوسف)

اِتَّبِعُوا مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ ۔ پیروی کرو اس کی جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتاری گئی اور اس کے علاوہ دوسرے اولیا کی پیروی نہ کرو۔ (الاعراف)

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (البقرہ) یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں ان سے نہ بڑھو اور جو لوگ اللہ کی مقرر کردہ حدود سے بڑھیں، وہی ظالم ہیں۔

اسی طرح ان حکمرانوں کو کافر ظالم اور فاسق کہا گیا ہے جو اللہ کے حکم کے مطابق فیصلے نہ کریں۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (المائدہ)

اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ فرمان کے مطابق حکم نہ کریں وہ کافر ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (المائدہ)

اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ امر کے مطابق حکم نہ کریں تو وہ فاسق ہیں۔

حاکم کی تعیین

جب یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ بندوں پر حق حکومت صرف اللہ کو ہی حاصل ہے جو کل کائنات کا حاکم و مدبّر ہے اور اسی کا حکم ہی ایسے پائیدار اُصولوں پر مبنی ہو سکتا ہے جن میں کماحقہ انسانیت کی فلاح و اصلاح اور بقا و ارتقا کا راز مضمر ہو۔ اور اسی کی حکومت کے سائے میں ہی بنی نوع انسان امن و چین اور سکون و اطمینان کا سانس لے سکتے ہیں اور اسی کے معین کردہ نظامِ حکومت کے ماتحت ہی عدل و انصاف کا بول بالا ہو سکتا ہے اور ظلم و استبداد اور جور و اعتساف سے انسانیت کو چھٹکارا مل سکتا ہے۔

تو بس نظام حکومت سنبھالنے اور قائم کرنے کے لئے اللہ کی جانب سے نیابت کا حق اسی کو حاصل ہو سکتا ہے جس کو اللہ خود نامزد فرمائے۔ اور جس طرح خدائی نظام کے سرِ تک پہنچنے کا ذریعہ خدا کا رسول ہے اسی طرح اس نظام کا نگران بھی اسی کو ہی ہونا چاہیے پس رسول کو خدا کی جانب سے حکومت میں نمائندہ ہونے کی حیثیت حاصل ہے لہٰذا اس کا حکم عین حکم خدا اس کی اطاعت عین اطاعتِ خدا اور اس کی نافرمانی عین خدا کی نافرمانی شمار ہو گی اور قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس کی وضاحت موجود ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (نساء)

اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لئے کہ باذنِ خدا اس کی اطاعت کی جائے۔

۲ وَمَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (نساء)

اور جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

۳ وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (حشر)

اور جو کچھ تمہیں رسول دے لیں لے لو اور جس سے تم کو روکے پس رک جاؤ۔

۴ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيْمًا (نساء)

تیرے رب کی قسم وہ ہرگز دعوائے ایمان میں سچے نہیں ہو سکتے جب تک کہ تجھے اپنے باہمی جھگڑوں میں حاکم تسلیم نہ کریں اور پھر جو تو فیصلہ کر دے اس پر اپنے دلوں میں حرج بھی محسوس نہ کریں اور اسے اس طرح تسلیم کر لیں جس طرح تسلیم کرنے کا حق ہے۔

۵ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۔ (الاحزاب)

کسی مومن مرد و عورت کو حق نہیں پہنچتا کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو ان کا اس معاملہ میں کچھ اختیار باقی رہ جائے اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے۔ وہ ظاہر بظاہر گمراہ ہے۔

۶ وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَمَا اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۔ (النور)

اور وہ کہتے ہیں ہم اللہ اور رسول پر ایمان لائے اور اطاعت قبول کی پھر ایک فریق ان میں سے اس کے بعد اعراض کر لیتا ہے۔ ایسے لوگ مومن نہیں ہیں اور جب ان کو اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی طرف بلایا جائے تو ان میں سے ایک فریق اعراض کرتا ہے (اس جگہ ان ایمان کے دعویٰ کرنے والوں کی صریح مذمت ہے جو حکومت الٰہیہ کے فیصلوں سے گریز کریں جو اللہ کی طرف سے نمائندگی کرتے ہوئے اس کے رسول نے سنائے)

۷ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (النور)

سوائے اس کے نہیں ایمان لانے والوں کا قول تو یہ ہوتا ہے کہ جب ان کو اللہ اور اس کے رسول کے فیصلہ کی طرف بلایا جائے تو کہہ دیں کہ ہم نے سنا اور مانا اور ایسے لوگ ہی چھٹکارا پانے والے ہیں (اس جگہ ان سچے ایمانداروں کی مدح ہے جو اللہ کے نمائندہ رسول کے حکم وفیصلہ کے آگے سر تسلیم خم کرلیں)

۸ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ (المائدہ ۷)

(حضور کو حکم ہے) کہ جو اللہ نے نازل کیا ہے اس کے مطابق تم لوگوں میں حکم کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔

۹ يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (ص)

اے داؤد ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا پس لوگوں کے درمیان حق کا فیصلہ کرو۔

اسلامی معاشرہ

سابق بیان اور آیاتِ متذکرہ سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ انسانیت کی متوازن بقا کے لئے اسلامی آئین کیوں ضروری ہے اور اسلامی حکومت کے وقوع اور نفاذ کی ضرورت کیوں ہے؟ کیوں کہ اسلام صرف چند کلمات کی زبانی رٹ لگانے کا نام نہیں اور نہ صرف چند رسمی اعمال کی بجا آوری تک اس کی تعلیم محدود ہے بلکہ اپنی انفرادی واجتماعی زندگی کو خدا کے احکام کے مطابق گذارنے اور خدائی نظامِ حکومت سے ہر ممکن تعاون کا نام اسلام ہے۔ چنانچہ سورہ عصر میں صاف اعلان ہے وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ عصر کی قسم۔ انسان خسارے میں ہے مگر وہ جو ایمان لائیں اور نیک اعمال کریں۔ ایک دوسرے کو حق بات کی وصیت کریں اور صبر کی تلقین کریں۔ سورہ مجیدہ میں ہر انسان پر چار قسم کے فرائض سے عہدہ برآ ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے جن کے بغیر انسانیت خسارہ سے نجات نہیں پاسکتی۔

۱ **ایمان**۔ اللہ اور اس کی توحید پر ایمان انسانی کامیاب وفتح مند زندگی کا بنیادی نقطہ ہے۔ پس انسان کو چاہیے کہ اس کی حکومت کو تسلیم کرے اور اس کی جانب سے جملہ نمایندگان انبیاء ورسل پر ایمان لائے اور اللہ کا رسول جو عقائد پیش کرے ان کو من وعن تسلیم کرے۔

۲ **عملِ صالح**۔ جب انسان نے اللہ کی توحید پر ایمان کو مستحکم کرلیا تو اس پر لازم ہے کہ زندگی کے جملہ لوازم میں اسی کی رضا کو ملحوظ رکھے پس اعمال نفس اُمورِ خانگی اور حقوق معاشرہ میں اپنے آپ کو مطلق العنان اور خود مختار نہ سمجھے بلکہ اس کا ہر عمل ہر قول اور ہر اقدام اللہ کے جاری کردہ قوانین کی بندشوں میں گھرا ہوا ہو اور اس کی معین کردہ حدود سے تجاوز نہ کرے۔

۳۔ وصیتِ حق۔ اس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے داخل ہیں یعنی خود بھی اپنی زندگی کو اسلامی آئین کے سانچے میں ڈھالے اور اپنے دائرۂ اثر و رسوخ تک اسلامی تعلیمات کی توسیع میں تا حدِ امکان حصہ بھی لے پس لوگوں کو ہر بھلائی پر آمادہ کرے اور ہر برائی سے ان کو روکے خواہ اس کا تعلق نفسِ فاعل سے ہو یا خانگی اصلاح سے ہو یا معاشرتی زندگی سے ہو۔ پس حکومتِ اسلامیہ سے ہر ممکن تعاون اور قوم و ملت سے عملی و لسانی خدمت ہر انسان کے فرائضِ زندگی میں شامل ہے۔

۴۔ وصیتِ صبر:۔ مشکلات و مصائب کے مقامات میں خود بھی صبر کا دامن تھامے رہے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرے تاکہ فساد و غلط کاری کی طرف اقدام نہ ہو اور جہاں دوسروں کے جذبات ابھرے ہوئے ہوں وہاں بھی صبر و ضبط کی تلقین کرکے معاشرہ کی اصلاح کا فرض ادا کرے تاکہ ظلم و جور اور فساد و اختلافات کی بجائے انسانوں میں صلح و آشتی کی فضا پیدا ہو جائے۔ وصیتِ حق کے بعد وصیتِ صبر کا ذکر اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ وصیتِ صبر وصیتِ حق کی فرع ہے کیونکہ جو لوگ اعلائے کلمۂ حق کو اپنا شعار بنائیں انہیں نااہلوں کی جانب سے ہر قسم کے مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے لہٰذا اس قسم کے صبر آزما حالات میں صبر و استقلال کا دامن تھامے رہنا اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کرنا ان کے فرائض میں شامل ہے جس طرح کہ پہلے فقرہ میں عملِ صالح کو ایمان کی فرع قرار دیا گیا ہے۔

اگر انسانی معاشرہ کا ہر فرد خدائے حکیم کے پیش کردہ اس چار نکاتی پروگرام کو اپنی زندگی کے سفر کے لئے مشعلِ راہ قرار دے کر آگے بڑھتے تو کیوں نہ انسانیت حضیضِ ناسوت سے بلند ہو کر اوجِ ملکوت سے ہمکنار ہونے کی سعادت حاصل کرے؟

اسلامی حکومت کا سربراہ

جب انسانی معاشرہ کا ہر فرد ایک گونہ ذمہ داریوں میں گھرا ہوا ہے تو حکومتِ اسلامی کا سربراہ وہ شخص ہو سکتا ہے جو ان ذمہ داریوں سے خود بھی عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت و جرأت رکھتا ہو اور تمام مصالح و مفاسد سے پوری طرح خبردار ہوتے ہوئے حکمِ خداوندی کے نفاذ میں بلند ضمیر، بلند ہمت اور بلند کردار کا مظاہرہ کر سکے۔ وہ خدا کی جانب سے وضع کردہ انسانی ضابطۂ حیات کی ہر جزئی کا پورا قدردان ہو اور اس سلسلہ میں ذاتی اغراض نفسی مقاصد اور ماحول کے روتے اس کے ارادوں پر حاوی نہ ہو سکیں اور وہ اللہ کے ہر حکم کے نفاذ میں بلا لومۃ لائم بلند حوصلگی کا مظاہرہ کرے اور ایسا شخص جو جذباتِ نفسیہ اور خواہشاتِ ذاتیہ کی سطح سے بلند ہو کر فلاح و اصلاحِ انسانیت کی خاطر مسندِ اقتدار پر قدم رکھے وہ وہی ہو سکتا ہے جس کو اللہ زیورِ عصمت اور خلعتِ طہارت سے آراستہ فرمائے اور وہی حکومتِ اسلامیہ کا سربراہ اور خدا کی جانب سے نامزد نمائندہ ہو گا۔

پس خدا کا رسولؐ ہی ایسی حکومت کے سنبھالنے کا اہل ہے یا وہ جس کو خدا کا رسولؐ اپنے بعد کے لئے نامزد کرے کیوں کہ خدا کا رسولؐ چونکہ جذبات و خواہشات سے بلند ہو کر اسلامی نظام کا سربراہ اور

اس کا محافظ و نگران ہوتا ہے لہٰذا وہ اپنے بعد کے لئے ایسے ہی فرد کا انتخاب کرے گا جس کو اسلامی نظام کے نفاذ و استحکام کے متعلق تمام تر ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے لائق سمجھے گا۔ اور اس کے بعد یہ سلسلہ نامزدگی سے ہی انجام پاتا رہے گا۔

ارشادِ خداوندی ہے۔ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (نسا) اے ایمان والو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان کی جو تم میں سے اولوالامر ہوں۔

آیت مجیدہ میں اللہ نے تمام انسانوں پر حقِ حکومت کی وضاحت فرمائی ہے کہ اللہ اور رسول اور اولوالامر کو تم پر حقِ حکومت حاصل ہے اللہ کو بذاتِ خود اور رسول و اولوالامر کو اس کی جانب سے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے۔ پس مومنوں پر واجب ہے کہ اللہ کی اطاعت کریں اور رسول و اولوالامر کی اطاعت کریں کیونکہ ان کی اطاعت ہی درحقیقت اللہ کی اطاعت و فرماں برداری ہے۔ اور رسول و اولوالامر کی اطاعت کا اللہ کی اطاعت پر عطف۔ عطفِ تفسیری ہے۔

جس طرح اللہ انتخاب سے نہیں بنتا لہٰذا لوگوں پر اللہ کا بنانا واجب نہیں بلکہ اس کا پہچاننا اور اس کو حاکم مان کر اس کی اطاعت کرنا اور اس کے ہر فیصلہ کے سامنے سرنگوں رہنا انسانوں پر فرض ہے اسی طرح رسول انتخاب سے نہیں بنتا پس لوگوں پر رسول کا بنانا فرض نہیں بلکہ اس کا پہچاننا اور اللہ کی جانب سے اس کی نمائندگی کو تسلیم کرکے اس کی ہر انفرادی و اجتماعی مسئلہ میں اطاعت کرنا مومنوں پر فرض ہے۔

پس اسی طرح اولوالامر بھی انتخابات سے نہیں بنا کرتے اور نہ لوگوں پر ان کا بنانا ضروری ہے بلکہ باذنِ پروردگار رسول کی جانب سے نامزد افراد کو پہچاننا اور ہر معاملہ میں ان کی اطاعت کرنا صاحبانِ ایمان کا فریضہ ہے۔

آیتِ مجیدہ میں رسول اور اولوالامر کی اطاعت کا مطلق اور بلا استثناء حکم دیکر قرآن مجید نے واضح کردیا ہے کہ جس طرح رسُول کے حکم میں غلطی یا کسی فروگذاشت کا امکان نہیں ہوتا اسی طرح اولوالامر بھی وہی ہوگا جس کے کسی حکم میں غلطی کا امکان نہ ہو اور رسول کی طرح اولوالامر کو بھی جذبات و خواہشات نفسانیہ کی سطح سے بلند ہونا چاہیئے ورنہ اگر ان میں جذبات و خواہشات کی اتباع کا امکان ہوتا تو خدا کی جانب سے ان کے مطلق فرمانروا ہونے کا اعلان نہ ہوتا اور عوام الناس کو بلا استثناء ان کی اطاعت کا حکم نہ دیا جاتا بلکہ حکم اس طرح ہوتا کہ تمہارے اولوالامر اگر خدا و رسول کے احکام کے

مطابق تم کو حکم دیں تو ان کی اطاعت کرو ورنہ جذبات و خواہشات کی رَو میں بہ کر ناجائز اور حرام کا حکم دینے والے حکمرانوں کے خلاف احتجاج کرو اور کلمۂ حق کو بلند رکھو۔ پس خدا نے چونکہ بلا استثناء رسول کی طرح اولوالامر کی اطاعت کا حکم دیا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ رسول کی طرح اُولوالامر بھی خدا کی حکومت میں اس کی پُوری طرح نمایندگی کے اہل ہیں اور ان کا حکم خدا کا حکم اور ان کی نافرمانی خدا کی نافرمانی اور ان کی اطاعت خدا کی اطاعت شمار ہوتی ہے پس جس طرح انتخابات سے کسی کو رسالت کا عہدہ دستیاب نہیں ہوسکتا اسی طرح چناؤ سے رسول کی نیابت اور حکومتِ الٰہیہ میں نمایندگی کا عہدہ بھی نہیں مِل سکتا۔

پس انسانوں پر حقِ حکومت صرف اللہ کو حاصل ہے اور اس کی طرف سے نمایندہ اس کا رسول حکومتِ اسلامیہ کا سربراہ ہوسکتا ہے اور رسول کے بعد حکومتِ اسلامیہ کا سربراہ وہی ہوسکتا ہے جو انسانیت کی قدروں سے صحیح واقف ہو اور اللہ کی جانب سے حکومت کی نمایندگی کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اور ایسے شخص کا علم رسول کے نامزد کرنے سے ہوسکتا ہے نہ کہ الیکشن سے۔ کیونکہ الیکشن خواہ کس قدر ہی نیک نیّتی سے ہو اور افرادِ انسانیہ میں اچھے چناؤ کی اہمیّت کا احساس کتنا ہی قوی ہو تاہم کسی کی ظاہری خوبیوں کی بنا پر ہی اسے چنا جائے گا خواہ اس کی باطنی برائیاں ظاہری خوبیوں سے زیادہ ہی کیوں نہ ہوں اور ہوسکتا ہے کہ اس کی باطنی برائیاں بے بسی کے پردہ میں چھپی ہوئی ہوں۔ اور اقتدار حاصل کرنے کے بعد بے بسی کا پردہ الٹ جانے سے وہ بے نقاب ہوکر اس کی تمام ظاہری خوبیوں کو اپنے وسیع دامن میں پردہ پوش کردیں۔

پس وہ اللہ جو ظاہری و باطنی جملہ صفاتِ حسنہ و سیئہ سے خبردار ہے وہ ہر شخص کی صالح ضمیری سے کماحقہ واقف ہے لہٰذا حکومتِ اسلامیہ کی سربراہی کے لئے موزوں ترین فرد کا صحیح انتخاب وہی کرسکتا ہے پس اس کا رسول اس کے اذن سے جس کا اعلان کرے وہی درست اور بجا ہوگا۔

قرآن میں جمہوریت کی تردید

سب سے پہلے زمین کی پہلی خلافت و حکومت کی تشکیل کا مسئلہ قرآن مجید میں بارہا دہرایا گیا ہے جب اللہ نے اپنی حکمت و مشیت سے آدم کو نامزد فرمایا تو فرشتوں کے اجماعی بورڈ نے اس پر صدائے احتجاج بلند کی۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (البقرہ)

جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ

وَنُقَدِّسُ لَكَ (البقرہ)

فرشتوں نے کہا کیا ایسے شخص کو زمین میں بناتا ہے جو اس میں فساد و خونریزی کرے گا حالانکہ ہم تیرے تسبیح گذار اور تقدیس بیان کرنے والے ہیں۔

حضرت آدم کے ظاہری خمیر سے ان کو اس سے سرزد ہونے والی امکانی برائیوں کا اندازہ ہو گیا تھا لیکن اس ظاہری خمیر کے اندر باطنی خوبیوں کے اندازہ سے بے خبر تھے پس انہوں نے اپنے ظاہر کی خوبی جتلا کر آدم کے ظاہری سقم کی بنا پر زبانِ احتجاج کھولی اور دبی زبان سے اپنا استحقاق پیش کیا لیکن خدا نے اِنِّیْ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے کہہ کر ان کو خاموش کر دیا اور مقامِ امتحان میں کھڑا کر کے آدم کی باطنی خوبی "جوہرِ علم" کو ظاہر کیا پس فرشتوں کو اس باطنی مصلحت سے خبردار کر کے آدم کے سامنے سجدہ ریز اور سرنگوں ہونے کا حکم صادر فرمایا اور خلافت و حکومت کے لئے یہ معیار واضح کر دیا کہ میں ظاہر و باطن کی جملہ مصلحتوں کو خوب جانتا ہوں۔ لہذا میرے فیصلہ پر کسی کو احتجاج کرنے کا کوئی حق نہیں ہے فرشتوں نے آدم کے سامنے جھک کر اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا اور ہمیشہ کے لئے اپنی خواہش سے دستبردار ہو گئے۔

۲ حضرت موسےٰ علیہ السلام کے بعد جب بنی اسرائیل گرد و نواح کے سلاطین کے جور و استبداد سے تنگ آئے تو انہوں نے اپنے دور کے نبی سے حکومت کے سربراہ کے تعین کی درخواست کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہ اس سے پہلے وہ انتخابی تجربہ کر چکے تھے جو انہیں راس نہیں بیٹھتا تھا ورنہ سرداران بنی اسرائیل کو نبی سے درخواست کرنے کی کیا ضرورت تھی آپس میں الکیشن لڑ کر ایک کو اقتدار سونپ دیتے اور دشمن سے نپٹ لیتے۔

قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ط قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ط قَالَ اِنَّ اللهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ط وَاللهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ط وَاللهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۔ (البقرہ)

ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ نے طالوت کو تمہارے لئے بادشاہ مقرر کیا ہے تو کہنے لگے اس کو ہم پر حکومت کہاں سے ہو سکتی ہے حالانکہ ہم حکومت کے اس سے زیادہ سزاوار ہیں اس کو کشائشِ مال تو دی ہی نہیں گئی (نبی نے) کہا تحقیق اللہ نے اس کو تم پر چن لیا ہے اور اسے علم و جسم میں زیادہ کیا ہے اور اللہ جسے چاہے اپنی حکومت عطا فرمائے اور اللہ صاحب وسعت و علم ہے۔

دیکھئے اللہ کی جانب سے نبی نے طالوت کا اعلان کیا تو اس وقت کے سیاسی لیڈروں نے صدائے احتجاج بلند کی اور اپنا استحقاق پیش کیا اور اس کی مالی کمزوری کو محلِ طعن قرار دیا لیکن نبی نے ان کی ایک نہ سُنی اور اللہ کے فیصلہ کو بدلنا گوارا نہ کیا اور حضرت طالوت کی باطنی خوبیوں کو بیان کیا کہ وہ علم وجسامت میں تم سب سے زیادہ ہے لہٰذا وہ ہی حکومت کا اہل ہے نیز اللہ اپنی جانب سے حکومت کی سربراہی جس کو عطا فرمائے اس کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔

۳ جہاں اولوالامر کی اطاعت کا حکم صادر فرمایا۔ ارشاد ہُوا۔ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (النساء) پس اگر تمہارا کسی بات میں جھگڑا ہو جائے تو اللہ و رسول کی طرف اس کو پلٹاؤ۔ اگر تم اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو۔

مرنے والا ہر روشن ضمیر انسان اپنے پس ماندگان کے لئے کسی نہ کسی کو سربراہ نامزد کر کے جاتا ہے تو رسول جو خدا کی جانب سے پُورے معاشرہ انسانی کی اصلاح کے لئے حکومتِ الٰہیہ کا نمائندہ ہوتا ہے وہ سارے انسانوں کو بغیر سربراہ کے تعیّن کے چھوڑ کر کیسے جاسکتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ اپنی زندگی میں پُوری اُمّت کے لئے سربراہ کو نامزد کر کے جائیں تاکہ پیدا ہونے والے جھگڑے کا سدِ باب ہو جائے اور اُمّت پر واجب ہے کہ رسول کی ہدایت کو اپنے لئے مشعل راہ قرار دے۔

خلافت کا انتخاب بجائے خود ایک نزاعی معاملہ ہے اگر اس کا فیصلہ خود رسول کی زبانی ہو جائے تو ٹھیک ورنہ اگر الیکشن سے اس کا فیصلہ ہو اور ایک اُمیدوار کامیابی سے مسندِ اقتدار پر قابض ہو جائے تو چونکہ اس کی اندرونی خامیوں کی اطّلاع کسی کو نہیں ہوتی لہٰذا اقتدار کے زور سے اس کے غلط فیصلے بھی منظرِ عام پر آئیں گے اور اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ (لوگ بادشاہوں کے دین کے تابع ہوتے ہیں) کے ماتحت اکثریت اس کے ہر فیصلے کا خیر مقدم کرے گی اور اس کا نتیجہ بالآخر افسوسناک حالت میں ہی ظاہر ہوگا۔ چنانچہ مودودی صاحب نے پُوری کتاب "خلافت و ملوکیت" میں اسی کا رونا رویا ہے کہ جمہوری خلافت رفتہ رفتہ اسلامی تقاضوں سے کنارہ کش ہوتے ہوتے ملوکیت کے روپ میں رونما ہو گئی تو اس ملوکیت کے ذمہ دار درحقیقت وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلامی حکومت کی سربراہی کے لئے رسول کی نامزد شخصیت کو ہٹا کر من مانے طریقے سے مسندِ اقتدار پر قبضہ کر لیا اور بالآخر اسلامی طرزِ حکومت کی ناؤ کو ڈبو کے ہی رہے۔

اور اس انتخاب میں ایک خرابی یہ بھی ہے کہ جمہوری فیصلہ ہمیشہ ایک نئے نزاع کو منظرِ عام پر لاتا ہے کیونکہ اکثریت کا نمائندہ چونکہ نفسی وخواہشاتی وجذباتی فطری تقاضوں سے بالاتر تو ہوتا نہیں

لہٰذا اس کے فیصلوں میں غلطیوں کا ہونا ممکن اور قرینِ قیاس ہے اور اس کے غلط فیصلوں کو مان لینا اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے لہٰذا حکمران طبقہ اور رعایا میں نزاع کا نیا دروازہ کھل جاتا ہے۔ جناب مودودی صاحب "خلافت وملوکیت" کے صنہ پر رقمطراز ہیں۔

چھٹا قاعدہ جس پر یہ ریاست قائم کی گئی تھی یہ تھا کہ حکومت کی اطاعت صرف معروف میں واجب ہے۔ معصیت میں کسی کو اطاعت کا حق نہیں پہنچتا۔ دوسرے الفاظ میں اس قاعدے کا مطلب یہ ہے کہ حکومت اور حکام کا صرف وہی حکم ان کے ماتحتوں اور رعیت کے لئے واجب الاطاعت ہے جو قانون کے مطابق ہو۔ قانون کے خلاف حکم دینے کا نہ انہیں حق پہنچتا ہے اور نہ کسی کو اس کی اطاعت کرنی چاہیے۔

اور اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید میں جن اولوالامر کی اطاعت مطلقہ کا حکم دیا گیا ہے وہ خطا سے معصوم ہیں اور عصمت چونکہ باطنی صفت ہے جس کا علم صرف علام الغیوب کو ہی ہو سکتا ہے لہٰذا اُمت کے لئے حکومت کی سربراہی کے لئے کسی کو نامزد کرنا اسی کا ہی حق ہے اور باہمی نزاعات کا قلع قمع سوائے اس کے نہیں ہو سکتا۔

اللہ کا رسول

ہمارے نزدیک رسول اللہ کی حیثیت صرف مذہبیات میں راہنمائی تک محدود نہیں بلکہ وہ انسانیت کے مصلحِ اعظم تھے وہ اصلاحِ نفس۔ تدبیرِ منزل اور سیاستِ مدنیہ کے جملہ شعبوں میں انسان کے لئے رہبر کامل تھے وہ جہاں اخلاق وکردار میں انسان کو حیوانیت کی سطح سے اٹھا کر اوجِ رفعت کے بلند ترین کنگروں پر لے جانے کا پروگرام لے کر آئے تھے۔ وہاں اصلاح و فلاحِ معاشرہ تمدنی اُصول اور سیاسی تنظیم کے ذریعے سے انسانوں کیلئے پُرامن و پُرسکون زندگی بسر کرنے کی دعوت بھی لے کر آئے تھے وہ جس طرح مسلمانوں کے اندرونی معاملات میں قائد و پیشوا تھے اسی طرح خارجی و سیاسی اُمور میں بھی وہ ہادی و مرشد تھے پس دینی و دنیاوی ہر دو اقتدار کی مسند کے مالک تھے اور ان کا فیصلہ ہر حیثیت سے واجب الاذعان اور واجب الاتباع تھا۔

لہٰذا ان کے بعد مملکت اسلامیہ کا سربراہ وہی ہو سکتا ہے جو ہر دو لحاظ سے موزونیت تامہ رکھتا ہو۔ پس جہاں وہ سلطنت ملکیہ اور سیاست مدنیہ پر کنٹرول کرنے کا اہل ہو۔ وہاں اپنے نفس کے جذبات وخواہشات پر بھی پوری طرح قابو پا سکتا ہو تا کہ اس کا کوئی فیصلہ اور کوئی اقدام جذبات ذاتیہ کا ترجمان نہ ہو اور اس کا ہر سانس ملک وملت کی فلاح و بہبود کا غماز و عکاس ہو۔ نیز وہ قرآنی علوم کا ماہر ترین فرد ہو تا کہ مسندِ اقتدار کے ساتھ ساتھ وہ مسندِ علم کا بھی مالک ہو اور

جس طرح رسول کے لئے ضروری ہے کہ اپنی پوری امت سے اعلم وافضل واکمل ہو، اسی طرح اس کے بعد اُمّت کے سربراہ میں ان اوصاف کا ہونا ضروری ہے تاکہ رعایا صرف اس کے اقتدار کے خوف سے سہمی ہوئی نہ ہو بلکہ اس کے علمی وعملی تفوق کے پیش نظر بدل وجان اس کی قدردان بھی ہو۔ اور وہ اس کو اپنا دینی واسلامی ہادی بھی سمجھتی ہو۔ پس اس کی اطاعت خدا ورسول کی اطاعت سمجھی جائے اور اس کی نافرمانی خدا ورسول کی نافرمانی قرار دی جائے۔

مسلکِ شیعہ کی رو سے جناب رسالت مآبؐ کے بعد پوری اُمت میں حضرت علی علیہ السّلام ہی وہ شخصیت ہے جس کو دینی وسیاسی ہر لحاظ سے اُمّت کے لئے رہبر کامل اور مصلح اعظم قرار دیا جا سکتا ہے پس وہی رسول کی مسند کا صحیح وارث اور اُمّتِ اسلام کا حقیقی قائد اور حکومتِ الٰہیہ میں خدا و رسول کی جانب سے صحیح نمائندہ ہے اور اس کی اطاعت خدا ورسول کی اطاعت اور اس کی نافرمانی خدا ورسول کی نافرمانی ہے اور حجۃ الوداع سے واپسی پر جناب رسولِ کریم نے باذنِ خدا ان کی نامزدگی کا اعلان فرما دیا تھا اور بالتواتر یہ روایت کتب اہل سنت سے ثابت ہے حتیٰ کہ بعض متعصب مزاج سُنّی علماء نے بھی حدیث غدیر کا اعتراف کیا ہے اور اس کے بعد ہر پہلا امام بعد والے کو نامزد کرتا رہا شیعی اصطلاح میں نیابت رسول کے عہدہ کو امامت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور آئمہ کی تعداد بارہ ہے اور اسی بنا پر شیعوں کو اثنا عشری بھی کہا جاتا ہے۔

مسلک شیعہ کی رُو سے جناب رسالت مآبؐ کی وفات سے ہی اقتدار بٹ گیا، دینی اقتدار حضرت علی علیہ السّلام کے پاس رہا اور دنیاوی اقتدار پر خلافت کے نام سے ملوکیت نے قبضہ کر لیا پس امامت و ملوکیت کے دونو راستے اسی وقت سے الگ الگ ہو گئے حالانکہ دورِ رسالت میں قیادت ایک تھی اور رسُولِ کریم اس کے سربراہ تھے۔

جمہوری خلافت

وفاتِ پیغمبرؐ کے بعد منبر رسول کو سنبھالنے اور نیابت نبوی کے عہدۂ جلیلہ پر متمکن ہونے کے لئے سقیفۂ بنی ساعدہ میں مہاجرین وانصار کے درمیان جو رسہ کشی ہوئی اس میں طرفین کے دلائل کتب سیر و تاریخ میں جلی قلم سے لکھے جا چکے ہیں۔ کافی لے دے کے بعد کامیاب ہونے والے اُمیدوار سے جب حضرت امیر المومنین علی علیہ السّلام کی اس سلسلہ میں گفتگو ہوئی اور حضرت علیؑ نے اپنا استحقاق واحتجاج پیش کیا تو اس کے طرفداروں کی طرف سے دلائل میں لاجواب ہونے کے بعد قتل کی دھمکی دی گئی پس آپ کی خاموشی کو دلیلِ بیعت قرار دے کر اجماعی کونسل کی کاروائی میں اسے حرفِ آخر کی حیثیت دے دی

گئی۔ اور چونکہ اس طرزِ عمل کی بنا پر جسے چن لیا گیا اُسے صحیح نائب رسول سمجھ لیا گیا لہٰذا برسرِ اقتدار جماعت کی خوشنودی کے پیش نظر مذکورہ طریقِ انتخاب کو بھی شرعی حیثیت دے دی گئی چنانچہ اہلِ سنّت کا مشہور عالم ابن قتیبہؒ دینوری اپنی کتاب الامامۃ والسیاسۃ میں رقمطراز ہے۔

پھر (سقیفائی الیکشن کمیٹی کے فیصلہ کے بعد) حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو حضرت ابوبکر کے پاس لایا گیا تو آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے۔ میں اللہ کا بندہ اور اس کے رسول کا بھائی ہوں۔ پس آپ سے ابوبکر کی بیعت کے لئے کہا گیا تو آپ نے فرمایا میں تم سے خلافت کا زیادہ حقدار ہوں (لہٰذا تم کو میری بیعت کرنا چاہیے) میں تمہاری بیعت نہیں کروں گا تم نے نبی کریمؐ سے اپنی قرابتداری کو بطور دلیل پیش کیا ہے اور ہم سے خود غصب کرنے کو تیار ہو (کیونکہ تمہاری بہ نسبت ہم ان کے زیادہ قرابت دار ہیں۔

کیا تم نے انصار سے یہی بات نہیں کہی کہ چونکہ حضرت محمدؐ ہم میں سے تھے لہٰذا ہم تم سے اس کے زیادہ حقدار ہیں پس انہوں نے تمہاری بات کو تسلیم کر لیا اور خود دست بردار ہو گئے پس میں تم پر وہی حجت پیش کرتا ہوں جو تم نے انصار پر پیش کی کہ ہم زندگی میں اور مرنے کے بعد بھی رسول کے زیادہ قریبی ہیں پس اگر تم میں کچھ ایمان ہے تو ہمارے ساتھ انصاف کرو، ورنہ تمہارا یہ ظلم دیدہ ودانستہ ہوگا۔ یہ سن کر حضرت عمر بولے بیعت کے بغیر تمہارے لئے کوئی چارہ کار نہیں ہے پس حضرت علیؑ نے فرمایا کہ اس (خلافت کی اونٹنی) کا دودھ تو بھی اچھی طرح نکال لے کیونکہ اس میں تیرا بھی حصہ ہے پس آج اس کی حکومت کو پختہ کر لو کیونکہ کل اسی چیز کو وہ تیری طرف پلٹائے گا۔ پس آپ نے فرمایا اے عمر! بخدا میں تیری بات ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں اور نہ میں اس کی بیعت کرتا ہوں یہ سنتے ہی حضرت ابوبکر بولے اگر آپ ہماری بیعت کرنا پسند نہیں کرتے تو میں مجبور نہیں کروں گا۔

ابوعبیدہ بن جراح (جو ایک نہایت جہاندیدہ انسان تھا اور الیکشن کمیٹی کا رکن رکین تھا کرسئ اقتدار کی طرف سے وکالت کرتے ہوئے) حضرت علیؑ سے یوں مخاطب ہوا۔ اے ابن عم! تو نو عمر آدمی ہے اور یہ لوگ تیری ہی قوم کے سن رسیدہ بزرگوار ہیں۔ تجھ

ؒ ابن قتیبہ کے متعلق مودودی صاحب کا نظریہ صفحہ ۶۵ پر ملاحظہ ہو۔ (کتاب ہذا)

میں ان جیسا تجربہ اور معاملہ فہمی نہیں ہے اور میرے خیال میں ابوبکر تیری بہ نسبت (اس منصب
جلیل سے عہدہ برا ہونے کے لئے) زیادہ مضبوط صاحب برداشت اور حوصلہ مند
ہے لہذا مناسب یہی ہے کہ تم خود دست بردار ہو کر اس معاملہ کو ابوبکر کے ہی سپرد کر دو
پھر اگر زندگی رہی اور وقت نے مہلت دی تو فضل۔ دین۔ علم، فہم سبقت اسلامی
قرابت، دامادیٔ رسول وغیرہ خصوصیات کی بنا پر تم ہی اس امر (خلافت ونیابت پیغمبرؐ)
کے سزاوار وحقدار ہوؔ (ابوعبیدہ کی تقریر سن کر)
حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنی جوابی تقریر میں ارشاد فرمایا۔ اللہ سے ڈرو۔ اے گروہ
مہاجرین۔ محمدی اقتدار کو اس کے گھر اور مکان سے نکال کر اپنے گھروں اور مکانوں کی طرف
نہ لے جاؤ اور اس کے اہل بیت کو اس کے مقام اور حق سے دور نہ کرو جو لوگوں میں واضح ہے
پس خدا کی قسم اے گروہ مہاجرین بہ نسبت اور لوگوں کے ہم رسول کی نیابت کے زیادہ حقدار
ہیں کیونکہ ہم اس کے اہل بیت بھی ہیں اور منصب خلافت کے سزاوار بھی اس لئے کہ اللہ کی
کتاب کا قاری اللہ کے دین کا فقیہ اور رسول اللہ کی سنت کا عالم ہم میں ہے ساامور
رعایا کا واقف کار ان کے مصائب ومشکلات میں ان کی دستگیری کرنے والا اور ان
میں حقوق کو برابر تقسیم کرنے والا خدا کی قسم ہم میں ہی ہے پس تم لوگ خواہشات کے پیچھے
نہ جاؤ ورنہ اللہ کے راستہ سے گمراہ ہو جاؤ گے پس حق سے دور تر ہوتے جاؤ گے (ان تمام
تقریروں کو سننے اور ان میں موازنہ کرنے کے بعد) بشیر بن سعد انصاری نے مختصر سی تقریر
کی پس وہ کہنے لگا۔ اے علی اگر ابوبکر کی بیعت سے پہلے ہم لوگوں نے آپ کا بیان سن لیا ہوتا
تو انصار میں سے دو آدمی بھی آپ کے خلاف نہ ہوتے الخ (الامامۃ والسیاسۃ طبع مصر ص ۱۲ ج ۱)
پس یہ مجلس بلا نتیجہ ختم ہوئی اور ہر شخص اپنی منزل کی طرف چلا گیا۔ لیکن اقتدار اعلیٰ سنبھالنے کے
بعد حضرت ابوبکر کے دل میں حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کا اختلافی نظریہ خار بن کر چبھنے لگا ادھر

ؔ ابوعبیدہ کی تقریر سے صاف واضح ہے کہ اوصاف ذاتیہ اور خصائص نفسیہ کے لحاظ سے حضرت علی منصب خلافت کے
سزاوار تھے اور حضرت ابوبکر میں سوائے سن رسیدہ ہونے کے اور کوئی ذاتی صفت ایسی موجود نہ تھی جس کی بنا پر اس کو
اس عہدۂ جلیلہ کے لئے موزوں قرار دیا جاتا۔ گویا ایک سوچی سمجھی سکیم تھی جس کو موقع پا کر عملی جامہ پہنا دیا گیا
اور حصول اقتدار کے بعد اس کو شرعی حیثیت دے دی گئی۔

انعقادِ خلافت کے غیر موزوں طریق کار پر ناپسندیدگی کا اظہار کرنے والے گوشۂ عزلت کو چھوڑتے ہوئے اور مہرِ سکوت کو توڑتے ہوئے حضرت علی کے ہمنوا ہو گئے اور جنہوں نے جناب رسالت مآبؐ کی لرزہ خیز خبرِ وفات سننے کے بعد اچانک اور غیر متوقع طور پر انعقادِ خلافت کا شور سنا اور بدحواسی کے عالم میں شور و غل سے متاثر ہو کر ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بلا سوچے سمجھے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیعت کنندگان کے زمرہ میں شامل ہو گئے تھے، دفنِ پیغمبرؐ کے بعد حضرت علیؑ کی زبانِ حق ترجمان سے انعقادِ خلافت کے طریق کار پر تنقید سنی کہ اگر نیابت و خلافتِ رسولؐ کی بنیاد قرابتداری پہ ہے تو میں تم سے زیادہ قرابت رکھتا ہوں اور اگر ذاتی اوصاف و خصائص اس کا معیار ہیں تو علمِ قرآن، علمِ فقہ، علمِ سنت امورِ رعایا کی دیکھ بھال مشکلات میں ان کی دستگیری اور عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا یہ صفات ہم ہی میں موجود ہیں اور تم لوگ کسی صورت میں ہمارے ہم پلہ نہیں ہو سکتے چنانچہ سرکاری وکیل ابو عبیدہ جراح نے بھی اس امر کا اعتراف کیا کہ حضرت علی ہی معیارِ خلافت پر پورا اترنے والے ہیں اور ابو بکر کو سن رسیدہ ہونے کی بنا پر ہی اقتدار سونپ دیا گیا ہے۔ پھر جونہی وقت گذرتا گیا حقیقت کا چہرہ بے نقاب ہوتا چلا گیا پس لوگ انتخاب کے طریق کار سے بیزار ہوتے گئے اور دھڑا دھڑ حضرت علی کے ہمنوا بنتے گئے یہاں تک کہ حضرت علیؑ کے مکان کو کرسئی اقتدار سے اختلاف رائے رکھنے والے صحابہ کے لئے مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی لیکن کرسئی اقتدار کے پاسبانوں کے لئے یہ چیز ناقابلِ برداشت تھی کیونکہ اس میں زوالِ اقتدار کا خطرہ یقینی تھا اور اس اختلاف کو دلائل سے تو ختم نہیں کیا جا سکتا تھا پس تشدد کے ہاتھوں سے اس اختلاف کو دبا دینے کی تجویز پر غور کیا گیا۔ ابن قتیبہ دینوری نے اس معاملہ کے چہرہ سے نقاب کشائی اس طرح کی ہے۔

کیف کانت بیعۃ علی بن ابی طالب کرم اللہ وجھہ۔

جن لوگوں کو ابو بکر کی بیعت سے اختلاف تھا معلوم ہوا کہ وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے گھر میں جمع ہیں پس ان کی طرف عمرؓ کو روانہ کیا چنانچہ اس نے پہنچ کر ان کو بلایا اور وہ واقعاً حضرت علی کے گھر میں تھے لیکن انہوں نے باہر آنے سے انکار کر دیا پس اس (عمر) نے لکڑیاں منگوائیں اور قسم کھا کر کہا نکلو ورنہ میں اس گھر کو ان تمام آدمیوں سمیت جو اس میں گھسے ہوئے ہیں جلا دوں گا۔ کسی نے کہا اے ابو حفص (عمر) اس گھر میں تو جناب فاطمہ بھی موجود ہے کہنے لگے ہو تو ہوا کرے [1] پس اس شدید دھمکی سے متاثر ہو کر حضرت علیؑ

---

[1] یہ تھی صحابہ کے دلوں میں آلِ رسولؐ کی منزلت و عزت اور یہ ہے آپس میں شیر و شکر ہونے کی حقیقت (باقر رضا)

کے علاوہ باقی تمام آدمیوں نے نکل کر بیعت کر لی۔ اور حضرت علی نے فرمایا میں نے قسم اٹھائی ہے کہ اس وقت تک باہر نہ آؤں گا اور نہ کندھے پر ردا ڈالوں گا جب تک قرآن کو جمع نہ کر لوں۔

اس وقت جناب فاطمہ دروازہ پر کھڑے ہو کر یہ فرما رہی تھیں۔ آنے والوں میں تم لوگوں سے بدترین انسان آج تک ہمارے اس دروازہ پر نہیں آیا تم نے رسولِ کریمؐ کا جنازہ ہمارے پاس چھوڑ دیا[2] اور معاملہ خلافت کو آپس میں طے کر لیا تھے کہ نہ ہم سے مشورہ لیا اور نہ ہمیں اپنا حق دیا۔

حضرت علی علیہ السلام کے تشریف نہ لے جانے اور بیعت نہ کرنے کا عمر کے دل میں بہت قلق تھا، پس وہ حضرت ابوبکر کے پاس آکر (جذباتی لہجہ میں) کہنے لگا کیا تو اس بیعت نہ کرنے والے سے کوئی باز پرس نہ کریگا، حضرت ابوبکر نے فوری طور پر قنفذ غلام کو حضرت علی کے بلانے کے لئے بھیجا وہ جب درِ دولت پر پہنچا تو آپ نے آنے کی وجہ پوچھی۔ اُس نے جواب دیا آپ کو رسول اللہ کا خلیفہ (ابوبکر) بلاتا ہے آپ نے فرمایا بہت جلد تم نے رسول اللہ پر جھوٹ باندھا ہے[3] پس اس نے واپس آکر حضرت علی کا جواب سنایا جس کو سن کر ابوبکر پر کافی دیر تک گریہ طاری رہا پھر عمر نے دوبارہ (تند لہجہ میں) کہا اس بیعت نہ کرنے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸ - بخاری شریف باب مناقب فاطمہ میں جناب رسالت مآبؐ سے مروی ہے فَاطِمَةُ سَيِّدَةُ نِسَاءِ أَهْلِ الْجَنَّةِ، یعنی فاطمہ جنت میں جانے والی تمام عورتوں کی سردار ہے اور مسور بن مخرمہ سے مروی ہے آپ نے فرمایا فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِنِّي فَمَنْ أَغْضَبَهَا فَقَدْ أَغْضَبَنِي (فاطمہ میرا ٹکڑا ہے جس نے اس کو ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا۔

[1] یہ تھی اسلام میں جمہوری طرزِ حکومت کی پہلی داغ بیل اور منصفانہ رائے طلبی، نیز ڈرا دھمکا کر گھروں کو جلا دینے کی قسمیں کھا کر پرچم نبوت کی پاسبانی اور مملکتِ اسلامیہ کی نگرانی کے لئے سربراہِ حکومت پر براجمانی کا اجماعی طریقہ اور دھونس و دھاندلی کی قابلِ تقلید مثال اور مقتدائے اُمت کی حیثیت سنبھالنے والے کی عادلانہ روش سوچنے کے لئے فکرِ سلیم سمجھنے کے لئے فہمِ مستقیم اور فیصلہ کے لئے قلبِ صمیم چاہیے۔

[2] جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کے ان کلمات سے صاف عیاں ہے کہ منصب خلافت کے حصول کی تگ و دو میں الیکشنی پارٹی نے جناب رسالت مآبؐ کے جنازہ اور ان کے کفن و دفن کی اہمیت بالکل نظر انداز کر دی تھی کسی نے خوب کہا ہے ؎ چوں صحابہ حُبِّ دنیا داشتند - مصطفیٰ را بے کفن بگذاشتند

[3] حضرت علی کے نزدیک ان کا خلیفۂ رسول کہلانا رسول پر بہتان و افترا تھا اور خلیفہ نے بھی اپنے عمل سے اس کو تسلیم کر لیا کیونکہ جب دوبارہ قنفذ کو بھیجا تو اس کو ہدایت کر دی کہ مجھے خلیفہ رسول نہ کہنا بلکہ امیر المومنین کے خطاب سے یاد کرنا

والے کو مہلت نہ دیجئو تو ابو بکر نے دوبارہ قنفذ کو جانے کا حکم دیا اور یہ ہدایت کی کہ خلیفہ رسول کہنے کے بجائے ان کو آپ کو امیر المومنین نے بیعت کے لئے طلب کیا ہے۔ پس قنفذ نے جب پیغام پہنچایا تو آپ نے بلند آواز سے ازراہِ تعجب سبحان اللہ کا کلمہ زبان پر جاری فرمایا اور کہا اس نے ایسی چیز کا دعویٰ کیا ہے جس کا وہ اہل نہیں ہے[1] پس قنفذ نے واپس آکر حضرت علی کا جواب سنایا تو ابو بکر کافی دیر تک روتا رہا اس کے بعد عمر خود اٹھا اور ایک جماعت کو لے کر درِ فاطمہ پر پہنچا اور دق الباب کیا۔ جب جناب فاطمہ نے دروازہ پر شور وغل سنا تو دردمند لہجہ میں اپنے باپ کو بآوازِ بلند صدا دی۔ یا ابتاہ یا رسول اللہ ماذا لقینا بعدک من ابن الخطاب وابن ابی قحافۃ۔ اے ابا جان! اے رسول اللہ آپ کے چلے جانے کے بعد مجھے خطاب اور ابو قحافہ کے بیٹوں سے کیا کیا تکلیفیں پہنچی ہیں۔؟

بی بی عالیہ کے بین اور صدائے گریہ کو سن کر کافی لوگ روتے ہوئے واپس پلٹے کہ ان کے دل غم واندوہ سے پھٹ رہے تھے اور جگر پارہ پارہ ہو رہے تھے۔ عمر اور اس کی مخصوص پارٹی اپنی بات پر ڈٹی رہی چنانچہ وہ حضرت علی کو ساتھ لا کر ابو بکر کے پیش ہوئے اور کہنے لگے اس کی بیعت کرو۔ آپ نے فرمایا اگر میں نہ کروں تو کیا ہوگا؟ کہنے لگے اس اللہ کی قسم جس کے سوا اور کوئی الٰہ نہیں ہے تیری گردن اڑا دیں گے[2] آپ نے نہایت اطمینان وسکون سے فرمایا اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اللہ کے عبدِ خاص اور رسول اللہ کے بھائی کو قتل کرو گے؟ عمر نے کہا۔ اللہ کا عبد تو ٹھیک ہے لیکن رسول اللہ کا بھائی ہم نہیں مانتے[3] ابو بکر خاموشی سے یہ سب باتیں سن رہا تھا اور آخر تک چپ بیٹھا رہا عمر نے

---

[1] اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کے نزدیک ان کا امیر المومنین کہلانا بھی ناجائز تھا اور حضرت علی کا جواب سن کر ابو بکر پر گریہ کا طاری ہونا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ خلیفۂ رسول اور امیر المومنین کے خطاباتِ جلیلہ کے لئے اپنے آپ کو ناموزوں سمجھتا تھا اس لئے حضرت علی کی تنقید اسے اپنے غاصبانہ رویہ پر ندامت کی دعوت دیتی تھی پس گریہ میں بے بس ہو جاتا تھا کیونکہ اقتدار کو خیرباد کہنا مشکل تھا۔

[2] یہ ہے منصفانہ اسلامی جمہوریت۔ اسی بنا پر تو سابق صدر پاکستان ایوب خان نے فاطمہ جناح کے مقابلہ میں جیت جانے کے بعد کہا تھا جیسا کہ مشہور ہے دورِ اول کے انتخاب سے اچھا ہوا ہے۔ بہرکیف دورِ اول میں اسلامی راج کے قیام کے لئے منصفانہ رائے طلبی کا طریق کار انتہائی عبرتناک ہے

[3] اقتدار کی ہوس میں حدیث مواخات کا بھی انکار کر دیا جس کو فریقین کے علما نے تواتر سے نقل کیا ہے کہ جناب رسالت مآب نے جب مہاجرین وانصار میں بھائی چارہ قائم کیا تو حضرت علی کو اپنا بھائی نامزد فرمایا (مسند احمد بن حنبل و ترمذی و مستدرک وغیرہ نقلا از دلائل الصدق ج ۲)

اس کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا کیا تم اس کے بارے میں کوئی حکم صادر نہیں کرتے[1] پس ابوبکر نے جواب دیا جب تک فاطمہ اس کے پہلو میں زندہ ہے میں اس کو کسی بات کے لئے مجبور کرنے کو تیار نہیں ہوں[2] پس حضرت علی نالہ وزاری کرتے ہوئے قبر رسول پر پہنچے اور باآواز بلند رسول کریم کو ان کی قبر سے لپٹ کر فریاد سنائی یَابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ وَ کَادُوْا یَقْتُلُوْنَنِیْ اے بھائی جان قوم نے مجھے کمزور سمجھا اور قریب تھا کہ مجھے قتل کر دیں[3]

اور مسلمانوں کے دلوں میں حضرت علی کا وقار تا حیات فاطمہؑ صحیح بخاری میں صراحت سے منقول ہے چنانچہ صحیح بخاری باب غزوہ خیبر میں ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں جب فاطمہ نے ابوبکر سے اپنا حق طلب کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ فَاَبٰی اَبُوْبَکْرٍ اَنْ یَّدْفَعَ اِلٰی فَاطِمَۃَ مِنْهَا شَیْئًا فَوَجَدَتْ فَاطِمَۃُ عَلٰی اَبِیْ بَکْرٍ فِیْ ذَالِكَ فَهَجَرَتْهُ فَلَمْ تُکَلِّمْهُ حَتّٰی تُوُفِّیَتْ وَعَاشَتْ بَعْدَ النَّبِیِّ سِتَّۃَ اَشْهُرٍ فَلَمَّا تُوُفِّیَتْ دَفَنَهَا زَوْجُهَا عَلِیٌّ لَیْلًا وَلَمْ یُؤْذِنْ بِهَا اَبَابَکْرٍ وَصَلّٰی عَلَیْهَا وَکَانَ لِعَلِیٍّ مِنَ النَّاسِ وَجْهٌ حَیَاۃَ فَاطِمَۃَ فَلَمَّا تُوُفِّیَتْ اِسْتَنْکَرَ عَلِیٌّ وُجُوْہَ النَّاسِ۔ حضرت ابوبکر نے حضرت فاطمہ کو کچھ بھی دینے سے انکار کر دیا پس حضرت فاطمہؑ ابوبکر پر اس بات سے ناراض ہوگئیں پس اس سے قطع تعلقی اور قطع کلامی کر لی یہاں تک کہ ان کی وفات ہوگئی اور چھ ماہ رسول کریمؐ کے بعد زندہ رہیں جب ان کی وفات ہوئی۔ تو حضرت علیؑ نے ان کو رات کے وقت دفن کیا اور ابوبکر کو شمولیت کے لئے اطلاع تک نہ دی پس خود ہی ان پر نماز جنازہ

---

[1] غالباً کرسئی اقتدار کی طرف سے علی کے قتل کا حکم صادر کرا کے اپنے دل کی بھڑاس کو علی کے خون سے ٹھنڈا کرنے کا ارادہ تھا جو پورا نہ ہو سکا۔

[2] اس سے صاف ظاہر ہے کہ رسول زادی کی موجودگی کی وجہ سے انہوں نے علی سے الجھنا پسند نہ کیا ورنہ ہر ممکن اقدام سے گریز نہ کرتے اور جناب فاطمہ کا لحاظ بھی اس لئے نہیں کہ ان کا احترام دل میں تھا ورنہ قضیہ فدک میں ان کی دل شکنی نہ کی جاتی جیسا کہ صحیح بخاری باب الخمس اور باب غزوۂ خیبر میں بصراحت مذکور ہے بلکہ عوام الناس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے یہ بات کہہ دی گئی تاکہ وہ یہ باور کر لیں کہ ان کے دلوں میں بنت رسول کا احترام ہے

[3] قرآن مجید میں یہ الفاظ حضرت ہارون کے کلام کی حکایت ہے جب کہ انہوں نے اپنی قوم کی گوسالہ پرستی اور ارتداد کی رپورٹ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے پیش کی تھی اور اس آیت مجیدہ سے تمسک اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ جس طرح حضرت ہارون اپنی قوم کو گوسالہ پرستی کے بعد مرتد سمجھتے تھے اسی طرح حضرت علی بھی ان کو خلافت سازی کے بعد ان جیسا سمجھتے تھے اور حدیث مواخات اور حدیث منزلت جو فریقین (باقی برصفحہ ۳۲)

پڑھی اور حضرت فاطمہؑ کی زندگی میں لوگوں کے درمیان حضرت علیؑ کی آبرو تھی جب ان کی وفات ہوئی تو حضرت علیؑ سے لوگوں کے رُخ پھر گئے (یہ ہے باہمی شیر وشکر ہونے کی حقیقت) (الامامۃ والسیاسۃ)

انعقادِ خلافت میں جلد بازی

وفاتِ پیغمبرؐ سے قبل عامۃ الناس کو ہونے والے الیکشن کی کوئی خبر نہ تھی اور نہ اس راز کو افشاء کیا گیا تھا صرف چند آدمیوں کے ذہن میں یہ بات راسخ تھی جو وفاتِ پیغمبرؐ کی خبر کے نشر ہوتے ہی فوری طور پر عملی جامہ پہن کر منظرِ عام پر آگئی ورنہ اگر یہ تحریک حیاتِ پیغمبرؐ کے زمانہ میں چلائی جاتی تو اس افسوس ناک نتیجہ تک نہ پہنچتی جو بعد میں ظاہر ہوا۔ سقیفائی الیکشنی بورڈ کے سوچے سمجھے منصوبہ کے ماتحت جب حاضر ممبروں میں تحریکِ انعقادِ خلافت پیش ہوئی تو انصار سے سعد بن عبادہ اُمیدوار کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنے استحقاق کے لئے دلائل بھی پیش کئے پس اگر رائے عامہ کو حکم بنایا جاتا اور صحیح الیکشن لڑا جاتا تو یقیناً انصار جیت جاتے کیونکہ ووٹوں میں ان کا پلہ بھاری تھا۔

جن لوگوں نے سوچ سمجھ کر جنازہ رسول کی اہمیت کو نظر انداز کر کے یہ قدم اٹھایا تھا رائے عامہ سے انتخاب کا ہونا یقیناً ان کے مفاد کے خلاف تھا پس انہوں نے انصاری اُمیدوار کو مقابلہ سے دست بردار ہونے کا مشورہ دیا اور اپنی قرابتِ رسول کو پیش کر کے ان سے اپنا استحقاق منوانے کی کوشش کی لیکن جب وہ نہ مانے تو منظم پارٹی کے ایک رکن یعنی حضرت عمر نے ابوبکر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیعت کر لی اور پارٹی کے دوسرے اراکین نے بلا تاخیر یکے بعد دیگرے بیعت کر کے مبارکباد مبارکباد کا غل مچا دیا اور عوام کو دھکیل دھکیل کر بیعت کروالی گئی اور انصاری اُمیدوار کو انتشار پسند کہہ کر اپنی من مانی کاروائی کے راستہ سے ہٹا دیا گیا اور اس جلدی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ قرابت رسول کے جس بہانہ سے انصار کو اپنے راستہ سے ہٹایا جا رہا تھا انہیں معلوم تھا کہ اگر کچھ دیر ہو گئی تو ممکن ہے حضرت علی یا کوئی دوسرا ہاشمی فرد پہنچ کر ہمارے اس استحقاق کو ختم کر کے ہمارے سوچے سمجھے منصوبے کو خاک میں ملا دے پس گلی کوچوں میں پھرنے والے بدوی لوگوں کو ادھر اُدھر سے لا کر بیعت کی کارروائی پختہ کر لیا گیا ——— اور پھر مسجد نبوی میں باقاعدہ اعلان کر دیا گیا اگر پہلے سے لوگوں کو تحریک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱) کی کتابوں میں منقول ہے اس کی رو سے حضرت مشابہ ہارون ٹھہرے اور خلافتِ مذکورہ کے پرستاروں کی مثال گوسالہ پرستوں کی سی ہو گئی۔ حوالہ کتاب ہذا صفحہ ۱۳۳ و صفحہ ۱۳۴ پر ملاحظہ ہو

انتخاب کا علم ہوتا تو انصاری اُمیدوار اپنی پوری قوم کے ساتھ کچھ سوچ کر میدان میں قدم رکھتے تاکہ نتیجہ کی رسوائی سے بچ جائیں نیز مقام انتخاب سقیفہ بنی ساعدہ نہ ہوتا بلکہ یہ فیصلہ مسجد نبوی کی چار دیواری کے اندر ہوتا اور حضرت علی اور دیگر افراد بنی ہاشم اس میں باقاعدہ حصّہ لیتے۔

مودودی صاحب کی دیدہ دلیری بلکہ واقعات وحقائق سے اعلانیہ روگردانی ہے۔ جو اس نے "خلافت وملوکیت" کے صہ۸ پر انتخابی خلافت کے عنوان سے تحریر کیا ہے (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کے لئے حضرت ابوبکر کو حضرت عمر نے تجویز کیا اور مدینے کے تمام لوگوں نے (جو درحقیقت اس وقت پورے ملک میں عملاً نمایندہ حیثیت رکھتے تھے) کسی دباؤ یا لالچ کے بغیر خود اپنی رضا و رغبت سے انہیں پسند کر کے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔

کس قدر غلط بیانی ہے کہ مدینے کے تمام لوگوں نے بیعت کی حالانکہ جناب فاطمہ بنت رسولؐ (جس کو بقول بخاری حضورؐ نے اپنا ٹکڑا بَضْعَةٌ مِنِّیْ فرمایا) نے تازیست نہ بیعت کی اور نہ خلیفہ تسلیم کیا اور بقول ابن قتیبہ دینوری تازیست ہر نماز کے بعد ان پر نفرین کرتی رہی۔ اسی طرح حضرت علی علیہ السلام نے بیعت سے صاف انکار کر دیا اور خلیفہ کہلانے والے کو غاصب خلافت قرار دیا اور خلیفہ رسول یا امیر المومنین کے خطابات بھی ان کے لئے ناجائز قرار دیئے جیسا کہ الامامۃ والسیاسۃ کے حوالہ سے ابھی گذر چکا ہے۔ اسی طرح تاریخ کافی ایسے لوگوں کا پتہ دیتی ہے جنہوں نے بیعت سے انکار کر دیا چنانچہ مذکور ہو چکا ہے۔

نیز یہ کہنا کہ مدینے کے لوگ عملاً تمام ملک میں نمایندہ حیثیت رکھتے تھے۔ دعویٰ بلا دلیل ہے امرِ خلافت کو اگر جمہوری نہج پر طے کرنا ہے تو مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کے گوشوں میں جہاں بھی مسلمان آباد ہیں اور ان میں معاملہ فہمی کی استعداد موجود ہے ان تمام کو رائے زنی کا حق حاصل ہے۔ خواہ مکی ہوں یا مدنی بلکہ عربی ہوں یا عجمی البتہ اگر پیغمبرؐ نے کہیں نص کی ہو کہ مدنیوں کی رائے تمام عالم اسلام پر حاوی ہے تو تسلیم کرنے سے کوئی عذر نہیں لیکن پیغمبر نے ایسا کبھی نہیں فرمایا اور نہ اس فیصلہ کو عقل سلیم قبول کرتی ہے بلکہ خود مودودی صاحب بھی دوسرے مقام پر اس کو قبول نہیں کرتے چنانچہ کتاب مذکور کے صہ۳۵ پر سورہ نور کی آیۃ استخلاف سے استشہاد کرتے ہوئے رقمطراز ہیں (اس فقرہ کی رو سے اہل ایمان کی جماعت کا ہر فرد خلافت میں برابر کا حصّہ دار ہے کسی شخص یا طبقہ کو عام مومنین کے اختیاراتِ خلافت سلب کر کے انہیں اپنے اندر مرکوز کر لینے کا حق نہیں ہے) بنابریں تمام افرادِ ملت سے اختیارِ خلافت چھین کر صرف بعض اہل مدینہ کے اندر مرکوز کرنا کب جائز ہو سکتا ہے؟ (مودودی صاحب اپنے فیصلہ پر نظر ثانی فرمائیں)

(اب رہی یہ بات کہ مدینہ والوں نے کسی دباؤ یا لالچ کے بغیر خود اپنی رضا و رغبت سے انہیں پسند کر کے ان کے ہاتھ پر بیعت کی) یہ فقرہ عامۃ الناس کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے تاریخ کا منہ چڑانے کے مترادف ہے اگر رضا و رغبت سے اور بغیر کسی دباؤ کے بیعت کا انعقاد تھا تو حضرت علی کے گھر میں جمع ہونے والوں کو نذرِ آتش کرنے کی دھمکی کس لئے دی گئی اور حضرت علی کو برسرِ عام قتل سے خوف زدہ کرنے کی کوشش کیوں کی گئی۔ اس بات سے انکار نہیں کہ عامۃ الناس کو منظم الکشنی کمیٹی کے ارکان نے بیعت کے لئے بلایا تو وہ ہاؤ ہو سے متاثر ہو کر اور انجام سے بے نیاز ہو کر ہاتھ پر ہاتھ رکھتے گئے اور ہمیشہ ایسے لوگوں کی کثرت ہوا کرتی ہے جنہیں اپنی رائے کی قدر و قیمت کا احساس تک نہیں ہوتا۔ البتہ معاملہ فہم اور خواص کا طبقہ پہلے دن سے اس انتخاب کے مخالف تھا اور آخر تک رہا اور بے سوچے سمجھے جلد بازی سے کام لیتے ہوئے جنہوں نے بیعت کر لی ان میں سے بھی سنجیدہ طبقہ اس دھاندلی کی حقیقت کھلنے کے بعد اپنے کئے پر نادم ہوا چنانچہ حضرت علی کا احتجاج اور دلائل سننے کے بعد بشیر بن سعد انصاری کا نظریہ مذکور ہو چکا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت علی نے بر وقت خلافت کے لئے اپنا نام پیش کیوں نہ کیا اس کا جواب اولاً تو یہ ہے کہ انتخاب کی کاروائی ایک منظم سازش کے ماتحت اچانک طور پر عمل میں لائی گئی اور کاروائی تکمیل ہونے کے بعد مسجد نبوی میں اس کا اعلان کیا گیا اور ثانیاً یہ کہ یہی سوال انصار کی طرف سے حضرت علی کے احتجاج کے فوراً بعد بھی کیا گیا تھا جس کا جواب حضرت علیؑ نے خود دے دیا تھا چنانچہ الامامۃ والسیاسۃ مطبوعہ مصر صفحہ ۱۲ پر ابن قتیبہ دینوری رقمطراز ہے۔

رات کے وقت حضرت علی جناب فاطمہ کو سواری پر سوار کر کے انصار کی مجالس میں نصرت طلبی کے لئے جاتے تھے تو وہ لوگ یہی جواب دیا کرتے تھے۔ اے بنت رسولؐ اب تو ہم اس شخص کی بیعت کر چکے ہیں اگر تیرا شوہر اور ابن عم پہلے آواز بلند کرتا تو ہم یقیناً اس سے عدول نہ کرتے تو حضرت علی ان کا سوال سن کر یہ جواب دیتے تھے کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی میت کو دفن کئے بغیر اپنے گھر میں چھوڑ کر نکل پڑتا۔ اور لوگوں سے حکومت و سلطنت کے لئے جھگڑتا؟ اور جناب فاطمہ ان کی تائید میں یہی فرماتی تھیں کہ ابو الحسن نے جو کچھ کیا ہے انہیں ایسا ہی کرنا چاہیے تھا البتہ جو کچھ ان لوگوں نے کیا ہے اللہ ان سے حساب لے گا۔

اس سوال و جواب سے اس حقیقت کی قلعی بھی کھل گئی کہ حضرت علی اور جناب فاطمہ کے نزدیک

خلافت کا انعقاد غلط تھا اِسی لئے توانہوں نے انصار سے تعاون کی اپیل کی اور یہ بھی ثابت ہوا کہ انصار نے بھی اندھا دھند بیعت کرلی تھی اور معاملہ فہمی کے بعد وہ اپنے کئے پر نالاں تھے جیساکہ ان کے جواب سے صاف ظاہر ہے۔

یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہوچکی ہے کہ حضرت علیؑ نے دعویٰ خلافت کے ثبوت کے لئے صرف قرابتداری کو ہی پیش نہیں کیا تھا بلکہ وہ ان کا اقناعی و الزامی جواب تھا کہ تم نے جس دلیل کی بنا پر انصار کو پیچھے ہٹایا ہے کہ ہم رسول کے قرابتدار ہیں میں اسی دلیل کو تم پر پیش کرتا ہوں کہ تمہاری بہ نسبت ہم رسول کے زیادہ قرابتدار ہیں لہٰذا خلافت ہمارا حق ہے بلکہ آپ نے ہر لحاظ سے اپنا احق ہونا ثابت کیا جیساکہ گذر چکا ہے۔

سیاست ملکیہ کا مسلم قانون اور ہر دور کا رائج الوقت اٹل اور ناقابلِ انکار دستور ہے کہ کرسئ اقتدار جس طریقہ سے حاصل ہوجائے اُسے صحیح اقتدار مانا جاتا ہے اور تمام برسرِ اقتدار افراد اُسے صحیح حکومت تسلیم کرلیا کرتے ہیں اور کرسئ اقتدار کے ہوا خواہ ہر ممکن طریقہ سے اُسے جائز اور آئینی ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کرتے ہیں دھونس دھاندلی اور ناجائز ذرائع کا استعمال اس وقت تک قابلِ اعتراض ہوتا ہے جب اس کا تعلق کسی دوسرے سے ہو ورنہ کامیابی حاصل کرنے والا اُمیدوار خواہ وہ کسی طریق کار سے کامیاب ہوا ہو وہ کبھی اپنے طریق انتخاب کو غلط نہیں کہتا۔ اور نہ اس کی مخصوص پارٹی اس کو غیر آئینی اقتدار قرار دیتی ہے۔

سقیفائی انتخابی فیصلہ کے بعد سرکاری وکیل ابوعبیدہ بن جراح نے جب حضرت علی کا الزامی جواب سُنا تو اس نے بنیتر ابدلا اور دلیل کا رُخ دوسری طرف پھیرتے ہوئے کہا کہ آپ نوجوان ہیں اور یہ بوڑھے تجربہ کار ہیں فی الحال آپ خاموش ہوجائیں اور اگر موت نے مہلت دی اور وقت نے ساتھ دیا تو فضل دین علم، فہم سبقت اسلامی، رشتہ داری اور دامادیٔ رسول کے شرف کی بنا پر آپ ہی خلافت کے حقدار و سزاوار ہیں۔ اب اس بیان سے صاف واضح ہے کہ ابوعبیدہ بن جراح بلکہ پُورے ایوانِ اقتدار پر یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں تھی کہ رشتہ داری معیارِ خلافت نہیں اور نہ بڑھاپا موجب ترجیح ہے بلکہ خلیفۂ رسول کو ذاتی اوصاف و کمالات کی بنا پر منصب خلافت کے لئے اہل و موزوں ہونا چاہیئے اور وہ یہ بات اچھی طرح سمجھتا تھا کہ ابوبکر بلکہ جملہ صحابہ اس بارے میں حضرت علی کا مقابلہ نہیں کرسکتے پس حضرت ابوبکر کی خلافت کے جواز کیلئے اور حضرت علی کو خاموش کرنے کے لئے یہی عذر بارد پیش کردیا کہ وہ بزرگ تجربہ کار ہیں بس ان کو اب رہنے دیجئے ورنہ درحقیقت دینی لحاظ

اور اوصاف و کمالات ذاتیہ کے اعتبار سے آپ ہی موزوں تر ہیں۔ گویا دبے لفظوں میں اپنی دھاندلی کا اعتراف کرتے ہوئے اس پر سن رسیدگی کے عذر بارد کا غلاف ڈال کر اپنے غلط اقدام کو چھپانا چاہا تاکہ عوام الناس پر اس انتخاب کے ناجائز ہونے کی حقیقت نہ کھل سکے اور یہ بھی واضح کر دیا کہ ان کا اقتدار دنیاوی سلطنت تک محدود ہے کیونکہ ان کی سوجھ بوجھ کا تعلق سیاستِ ملکیہ سے ہے نہ کہ دینی معاملات سے، پس دینی لحاظ سے تو آپ کا ہم پلہ کوئی نہیں اور وہ اقتدار آپ کے لئے ہی مخصوص ہے البتہ وقت نے مہلت دی تو دنیاوی سلطنت میں بھی آپ کا نمبر آ ہی جائے گا۔ اور حضرت علی علیہ السلام نے بھی اپنی جوابی تقریر میں مہاجرین کے سامنے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا کہ رشتہ داری کے لحاظ سے بھی ہم باقی تمام لوگوں سے زیادہ حقدار ہیں کیونکہ ہم اہل بیت ہیں اور خلافت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے لئے بھی ہم موزوں تر ہیں کیونکہ قاریٔ قرآن دین اللہ کے فقیہ اور سنتِ رسول کے عالم ہم ہی ہیں نیز اُمور رعایا میں معاملہ فہم ان کی مشکلات میں ان کے ہمدرد اور تقسیم حقوق میں مساوات کے علمبردار بھی ہم ہیں۔ تم لوگ خواہشات کے پیچھے نہ پڑو ورنہ گمراہ ہو گے اور راہِ حق سے دُور ہوتے چلے جاؤ گے۔

اس بیان میں آپ نے اپنا استحقاقِ خلافت اوصاف و کمالاتِ ذاتیہ کے لحاظ سے بیان کیا جس کا رد یا انکار کرنے کی جُرأت حکومتی جماعت میں نہ تھی آپ نے اُمور شرعیہ اور معاملات سیاسیہ دونو میں اپنا ماہر ترین اُمت ہونے کا دعویٰ کیا جس پر کسی نے لب کشائی کی جرأت نہ کی اور آخر میں آپ نے سقیفائی انتخاب کو ناجائز قرار دیتے ہوئے صاف طور پر فرمایا کہ اس انتخاب کے طریقہ کار کی داعی صرف خواہش نفسانی ہے لہذا بطور نصیحت فرمایا کہ خواہشِ نفس کے پیچھے نہ جاؤ ورنہ گمراہ ہو گے۔ اور راہِ حق سے دُور ہوتے جاؤ گے اور حاضرین میں سے آپ کے اس فقرہ کی تردید بھی کسی نے نہ کی۔

بنابریں مودودی صاحب کا حضرت علی کے متعلق یہ نظریہ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے "کہ وہ اپنے آپ کو خلافت کے لئے احق سمجھتے تھے لیکن کسی قابلِ اعتبار تاریخی روایت سے ان کے متعلق یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ انہوں نے خلافت حاصل کرنے کے لئے کبھی کسی درجہ میں کوئی ادنیٰ سی کوشش بھی کی ہو[1]" البتہ حکومتِ عثمان کے دَور میں کنبہ پروری اور اقربا نوازی کی بدولت جب ہر طرف سے بغاوت کا دھواں بلند ہونے لگا اور قلادہ حکومت کانٹوں کا ہار بن گیا تو وفاتِ عثمان کے بعد حضرت علی نے اقتدارِ حکومت کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا بالآخر لوگوں کے پرزور اصرار سے بدلِ ناخواستہ اسے قبول کر لیا۔

---

[1] خلافت و ملوکیت صہ ۱۸۹

مودودی صاحب نے حضرت سعد بن عبادہ انصاری کے اختلاف رائے کو قبائلی عصبیت پر محمول کرنے کی جرأت کر کے آزاد محقق ہونے کے دعوے کے باوجود کرسئی اقتدار کی جانبداری اور آبائی تقلید کا تقاضا پورا کیا ہے اور حضرت علی علیہ السلام اور جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کے اختلاف رائے کو ظاہر کرنا تو آبائی تقلید کے منافی سمجھتے ہوئے مناسب ہی نہ سمجھا اسی طرح ان اشخاص کے اختلاف رائے کو بھی ہضم کر گئے جنہوں نے حضرت عمر کی جلانے کی دھمکی سے متاثر ہو کر رسمی بیعت کر لی اور یہ سب اس لئے تاکہ کرسئی اقتدار پر قابض ہونے والی جماعت کو حق بجانب کہنے میں آسانی ہو اور ہم پہلے سے کہہ چکے ہیں کہ اقتدار جس طریقہ سے بھی حاصل ہو جائے برسر اقتدار پارٹی اسے حق بجانب اور جائز و مبنی بر انصاف ثابت کرنے کے لئے ہر ممکن ذریعہ استعمال کرتی ہے اور خوشامدی لوگوں کی کسی دور میں کمی نہیں ہوتی۔ وہ حزب اختلاف کی ہر تنقید کو غلط رنگ میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں جس طرح سعد بن عبادہ انصاری کے اختلاف کو مودودی صاحب نے قبائلی عصبیت سے تعبیر کیا اور ہر دور میں تاریخ نویس لوگ حکمران طبقہ کی خوشامد کے لئے حزب اختلاف کی سر برآوردہ شخصیتوں کو بھی نظر انداز کر دیا کرتے ہیں تاکہ یہ تاثر پیدا کیا جائے کہ وہ ہر طبقہ و قوم اور ہر فرد ملت کے ہر دلعزیز حکمران تھے اور ساری رعایا کے لئے وہ مقبول قائد تھے۔ چنانچہ اسی نظریہ کے ماتحت مودودی صاحب بلکہ اس گروہ کے اکثر و بیشتر مصنفین نے حضرت علی کے اختلاف رائے کو ذکر تک نہیں کیا حالانکہ الامامۃ والسیاسۃ کی پیش کردہ روایت ببانگ دھل حضرت علی و فاطمہ کے بیعت نہ کرنے کا اعلان کر رہی ہے۔

مودودی صاحب انتخابی خلافت کے زیر عنوان حضرت عمر کی خلافت کے انعقاد کے متعلق یوں رقمطراز ہیں ص۸۴۔

> حضرت ابوبکر نے اپنی وفات کے وقت حضرت عمر کے حق میں وصیت لکھوائی اور پھر مسجد نبوی میں لوگوں کو جمع کر کے اس کی نامزدگی کا اعلان کر دیا پس لوگوں نے اسے قبول کیا۔
>
> (بحوالہ طبری تاریخ الامم والملوک)

حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام نے جب ابوبکر کے انتخاب کو چیلنج کیا تھا اور عمر نے آپ سے ابوبکر کی بیعت کا تقاضا کیا تھا تو بقول ابن قتیبہ دینوری آپ نے فرمایا تھا کہ خلافت کی اونٹنی کا دودھ اچھی طرح نکال لو کیونکہ اس میں تیرا بھی حصہ ہے آج اس کی حکومت کو پختہ کر لو کیونکہ کل اس کو وہ تیری طرف پلٹائے گا، پس آپ کا فرمان من و عن صحیح ثابت ہوا اور خلافت کی کھچڑی گھر ہی گھر میں پکا لی گئی اس نے جس کا نام تجویز کیا تھا اس نے اس کو نامزد کر دیا۔ اور لطف یہ کہ انعقادِ خلافت کے اس

طریق کار کو اپنے لئے جائز قرار دے کر باقی تمام اُمت کے لوگوں کے لئے ناجائز قرار دے دیا اور ہم نے ابھی ذکر کیا ہے کہ سیاستِ ملکیہ کا ہر دَور میں یہی دستور چلا آیا ہے کہ جس دھاندلی کو دوسروں کے لئے ناجائز سمجھا جاتا ہے اپنے حق میں اُسے جائز کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسلامی مساوات کا تقاضا یہ ہے کہ ایک طریق کار اگر بعض کے لئے درست اور مبنی برانصاف ہے تو اس کو سب کے لئے درست قرار دینا چاہئے۔ مودودی صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں صفحہ ۸۴

"حضرت عمر کی زندگی کے آخری سال حج کے موقع پر ایک شخص نے کہا کہ " اگر عمر کا انتقال ہوا تو میں فلاں شخص کے ہاتھ پر بیعت کر لوں گا کیونکہ ابوبکر کی بیعت بھی اچانک ہی ہوئی تھی اور آخر وہ کامیاب ہوگئی۔" اس کا اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ حضرت عمر نے سقیفہ بنی ساعدہ کی مجلس میں اچانک اُٹھ کر حضرت ابوبکر کا نام تجویز کیا تھا اور ہاتھ بڑھا کر فوراً ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی ان کو خلیفہ بنانے کے معاملے میں پہلے کوئی مشورہ نہیں کیا تھا۔"

(اس اچانک تجویز کا پس منظر مختصر طور پر ہم پہلے بیان کر چکے ہیں)

حضرت عمر کو اس (شخص کے قول) کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے کہا میں اس معاملہ پر ایک تقریر کروں گا اور " عوام کو اُن لوگوں سے خبردار کروں گا جو اُن کے معاملات پر غاصبانہ تسلط قائم کرنے کے ارادے کر رہے ہیں" چنانچہ مدینے پہنچ کر انہوں نے اپنی پہلی تقریر میں اس قصے کا ذکر کیا اور بڑی تفصیل کے ساتھ سقیفہ بنی ساعدہ کی سرگذشت بیان کر کے یہ بتایا کہ اس وقت مخصوص حالات تھے جن میں اچانک ابوبکر کا نام تجویز کر کے میں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اس سلسلے میں انہوں نے فرمایا " اگر میں ایسا نہ کرتا اور خلافت کا تصفیہ کئے بغیر ہم لوگ مجلس سے اٹھ جاتے تو اندیشہ تھا کہ راتوں رات لوگ کہیں کوئی غلط فیصلہ نہ کر بیٹھیں اور ہمارے لئے اس پر راضی ہونا بھی مشکل ہو اور بدلنا بھی مشکل۔ یہ فعل اگر کامیاب ہوا تو اسے آئندہ کے لئے نظیر نہیں بنایا جا سکتا۔ تم میں ابوبکر جیسی بلند و بالا اور مقبول شخصیت کا اور آدمی کون ہے؟ اب اگر کوئی شخص مسلمانوں کے مشورے کے بغیر کسی کے ہاتھ پر بیعت کرے گا تو وہ اور جس کے ہاتھ پر بیعت کی جائے گی دونوں اپنے آپ کو قتل کے لئے پیش کریں گے۔

تاریخ کے صفحات پر وہ مخصوص حالات طشت ازبام کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان میں ایسی کوئی پیچیدگی نہیں کہ مودودی صاحب جیسا محقق اس کی تہ تک نہ پہنچ سکے۔ واقعات کا نظر غائر سے جائزہ لے کر ایک عام انسان بھی حقیقت کے چہرہ سے نقاب الٹ سکتا ہے۔ پیغمبرؐ کی خبر وفات سن کر منظم سازشی جماعت جب سقیفہ بنی ساعدہ میں پہنچی اور تحریکِ خلافت کی قرارداد پیش ہوئی تو سعد بن عبادہ

انصاری نے انصار کا استحقاق جتلاتے ہوئے انتخاب لڑنے کا اعلان کر دیا انہوں نے جب دیکھا کہ عام انتخابات کے ذریعے ہماری کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے اور سعد بن عبادہ بھی دست بردار ہونے پر کسی طرح راضی نہیں اور تاریخ اسلام میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا لہذا لوگ اس امر سے غافل تھے کہ ایسے حالات میں کن کن ہتھکنڈوں سے کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے اور کون کون سے ذرائع ایسے مواقع پر بروئے کار لائے جا سکتے ہیں۔ پس اس معاملہ میں تاخیر ہونے سے ایک طرف تو انصاری اُمیدوارِ خلافت کا مقابلہ مشکل تر ہو جانے کا خطرہ تھا اور دوسری طرف بنی ہاشم کے پہنچ جانے سے قرابتِ رسول کا بہانہ خود بخود بے کار ہو جاتا اور عام الیکشن میں کامیابی قطعاً ناممکن ہو جاتی پس عوام کی ناتجربہ کاری اور غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نیا حربہ نکالا وہ یہ کہ رائے شماری اور جمہوری انتخاب کے طریقہ کو بالائے طاق رکھ کر اچانک حضرت ابوبکر کا نام پیش کر دیا اور سب سے پہلے خود کھڑے ہو کر اس کی بیعت کر لی اس کے بعد پارٹی کے جملہ ارکان یکے بعد دیگرے بیعت کرتے چلے گئے۔ پس عوام الناس اور غیر جانبدار لوگوں نے بھی انجام سے بے نیاز ہو کر دیکھا دیکھی بیعت کر لی اس معاملہ میں کسی صاحبِ رائے کو سوچنے کا موقع ہی نہ دیا گیا کہ کون حقدار ہے اور کون نہیں۔ پس بیعت بیعت کا شور بلند ہو گیا اور مسجد نبوی میں جا کر اعلان کر دیا گیا۔ پھر بچے کھچے لوگوں کو اکادکا لا کر بیعت کو قانونی حیثیت دے دی گئی اور اب بھی جو لوگ انکار پر ڈٹ گئے یا جنہوں نے تنقید پر لب کشائی کی انہیں دھونس و دھاندلی سے شریک بیعت کر لیا گیا جس طرح ہمارے ملک پاکستان میں سابق صدر ایوب نے مارشل لا لگا کر بنیادی جمہوریتوں کی داغ بیل ڈال دی اور پھر تمام ممبروں سے اپنے حق میں ووٹ لے لئے۔ اقتدار کے ذریعے نہ کسی کو مزید سوچنے کا موقعہ دیا اور نہ مقابل اُمیدوار بننے کی کسی کو اجازت دی پس متفقہ طور پر اس کا انتخاب ہو گیا اور وہ بلا مقابلہ کامیاب صدر بن گیا۔

یہ تھے وہ مخصوص حالات جن کی بنا پر حضرت عمر نے حضرت ابوبکر کا نام فوری طور پر تجویز کر کے بیعت میں جلدی سے کام لیا اور اگلے لفظوں میں اسی خطرہ کا اظہار بھی موجود ہے کہ اگر ہم ایسا نہ کرتا اور خلافت کے تصفیہ کئے بغیر ہم لوگ مجلس سے اُٹھ جاتے تو اندیشہ تھا کہ راتوں رات لوگ کہیں کوئی غلط فیصلہ نہ کر بیٹھیں اور ہمارے لئے اس پر راضی ہونا بھی مشکل ہو اور بدلنا بھی مشکل سیاستِ ملکیہ کا قدیمی دستور ہے کہ کرسئ اقتدار پر قابض ہونے والا ہمیشہ اپنی اہلیت کا اعلان کیا کرتا ہے۔ اور مقابل کے ناکام اُمیدواروں کو اس کے لئے اَن فٹ اور نااہل قرار دیا کرتا ہے اور یہی فقرہ دہراتا ہے کہ ہم لوگ اقتدار پر قابض نہ ہوتے تو کوئی دوسرا نااہل اور غلط کار اس پر قابض ہو جاتا پس ہم نے

اقتدار پر قبضہ کر کے ملک وملت کے ناموس کو بچا لیا ہے۔ حضرت عمر کے الفاظ بعینہ اسی سیاسی چال کی ترجمانی کر رہے ہیں کہ ہم یہ فیصلہ نہ کرتے تو راتوں رات کوئی غلط فیصلہ ہو جاتا یعنی یا تو سعد بن عبادہ اپنی جمعیت بڑھا کر اقتدار سنبھال لیتا اور یا حضرت علی اپنی صفات ذاتیہ و کمالات نفسیہ اور وصیت نبویہ کی بنا پر اقتدار کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لیتے۔ اِس کے علاوہ اور کوئی تیسری شق نہ تھی اور چونکہ اقتدار کے یہ دونو راستے حضرت عمر کے لئے مفید نہ تھے اس لئے ان کو غلط فیصلہ قرار دے دیا جس طرح سعد بن عبادہ اور حضرت علی کی نظروں میں ان کا فیصلہ غلط اور ناجائز تھا اور حضرت عمر کے لئے انصار یا بنی ہاشم کی خلافت پر راضی ہونا بھی مشکل تھا اور اس کا بدلنا بھی مشکل رہی طرح کہ انصار اور بنی ہاشم کے لئے موجودہ صورت میں حضرت ابوبکر کے انتخاب پر راضی ہونا بھی مشکل ہو گیا اور بدلنا بھی مشکل۔

حضرت عمر کا یہ کہنا کہ "یہ فعل اگر کامیاب ہوا تو اسے آیندہ کے لئے نظیر نہیں بنایا جا سکتا" غور طلب بلکہ انصاف طلب ہے کیونکہ اگر اس فعل کی کامیابی کو شرعی حیثیت حاصل ہے تو اسے آیندہ کے لئے بھی نظیر بنا کر اُسے شرعی حیثیت دی جا سکتی ہے اور اگر اس فعل کی کامیابی کو شرعی حیثیت حاصل نہیں بلکہ صرف دھاندلی ہے تو بے شک اُسے آیندہ کے لئے نظیر تو نہیں بنایا جا سکتا لیکن اس غیر شرعی حیثیت سے حاصل ہونے والی خلافت کو کیسے جائز و شرعی خلافت کہا جا سکتا ہے؟

اس کے بعد حضرت ابوبکر کی شخصیت کی مقبولیت کا اعلان اس لئے بجا ہے کہ برسر اقتدار پارٹی کا یہی قدیمی دستور ہے اور اسی طریقہ سے اپنی کامیابی کو جواز کی حیثیت دی جایا کرتی ہے کہ جس کو ہم نے چنا ہے اس جیسا کوئی اور انسان نظر ہی نہیں آتا۔

حضرت عمر نے انتخاب کے اس طریق کار کو بعد میں اپنانے والوں پر فتوائے قتل بھی صادر فرمایا۔ اب اگر کوئی شخص مسلمانوں کے مشورے کے بغیر کسی کے ہاتھ پر بیعت کرے گا تو وہ اور جس کے ہاتھ پر بیعت کی جائے گی۔ دونو اپنے آپ کو قتل کے لئے پیش کریں گے اور مودودی صاحب نے مسند احمد سے یہ الفاظ نقل کئے ہیں "جس شخص نے مسلمانوں کے مشورے کے بغیر کسی امیر کی بیعت کی اس کی کوئی بیعت نہیں اور نہ اس شخص کی کوئی بیعت ہے جس سے اس نے بیعت کی اور فتح الباری سے ان کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ جس شخص کو مشورے کے بغیر امارت دی جائے اس کے لئے اس کا قبول کرنا حلال نہیں ہے۔ ص۸۵

منصف مزاج لوگ اگر حضرت عمر کے ان فرامین میں غور کریں تو صاف ظاہر ہے کہ ان کا ذاتی فعل ان کے قول کا دشمن ہے اور ان کا قول ان کے ذاتی فعل کی شرعی حیثیت کو چیلنج کرتا ہے کیونکہ ان کے نظریہ

میں مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی کی بیعت درست نہیں پس نہ اس قسم کی بیعت بیعت ہے اور نہ اس قسم کا امیر امیر ہے۔ بس ان کے اپنے فتوے کی رو سے چونکہ انہوں نے مسلمانوں کے مشورے کے بغیر اچانک حضرت ابوبکر کی بیعت کی تھی لہٰذا ان کی بیعت بیعت رہی اور نہ ان کی بیعت سے بننے والا خلیفہ شرعی خلیفہ رہا اور اگر مخصوص حالات کا عذر ان کے ذاتی فعل کو صحیح قرار دے سکتا ہے تو ان کے بعد اسی طریقہ کار سے منتخب ہونے والا ہر حکمران ان جیسے مخصوص حالات کا بہانہ پیش کر سکتا ہے مودودی صاحب نے اپنی تحقیق کے پیش نظر حضرت عثمان کی غلط پالیسی پر جرأت مندانہ تنقید کرتے ہوئے جس طرح صد۱۶ پر صاف لکھ دیا ہے (کہ غلط کام بہرحال غلط ہے خواہ وہ کسی نے کیا ہو) کاش وہ انعقادِ خلافت کی غلط روش پر پردہ نہ ڈالتے بلکہ جرأت سے کہہ دیتے کہ حضرت ابوبکر کا طریقِ انتخاب غلط اور غیر شرعی تھا اور تاقیامت اس قسم کا انتخاب ہر ایک کے لئے ناجائز اور غلط ہے پس اس قسم کی بیعت بھی غلط ہے اور اس قسم کا امیر بھی غلط کار ہے (اور غلط کام بہرحال غلط ہے خواہ وہ کسی نے کیا ہو

مودودی صاحب کی محققانہ روش

مودودی صاحب جہاں ایک طرف بعض مقامات پر بے لاگ تبصرہ کرنے کے بعد آزادانہ اپنی رائے بلا خوف لومۃ لائم پیش کرنے میں ذرا بھر جھجک محسوس نہیں کرتے وہاں دوسری طرف آبائی تقلید میں اندھا دھند مقامِ تحقیق سے بہت دور چلے جاتے ہیں اور پیچھے مڑ کر دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے تاکہ انہیں معلوم ہو سکے کہ میرے نظریات میں باہمی تصادم ہو رہا ہے جس طرح حضرت عمر کا نظریہ اپنے عمل سے متصادم تھا۔

بعینہٖ مودودی صاحب بھی اِسی قسم کے چکر میں پھنسے ہیں ان کی کورانہ آبائی تقلید کا تقاضا یہ ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر و عثمان کو صحیح خلیفہ رسول تسلیم کر لیا جائے اور ان کے چناؤ پر کوئی تنقید نہ کی جائے اور اِسی بنا پر انہوں نے تاریخی حقائق سے چشم پوشی کرتے ہوئے تینوں خلیفوں کو صحیح اجماعی اور اسلامی جمہوری خلیفے تسلیم کر لیا حتےٰ کہ حضرت علیؑ اور جناب فاطمہؑ کے اختلافِ رائے کا تذکرہ تک نہ کیا حالانکہ کتبِ صحیحہ میں واضح الفاظ سے اس کا ذکر موجود ہے اور سعد بن عبادہ انصاری کے اختلاف کو قبائلی عصبیت کا نتیجہ قرار دے دیا صد۹ لیکن اسلامی جمہوریہ کے دستور و اصول بیان کرتے ہوئے یہ خیال تک نہ رہا کہ ان سے آبائی تقلید سے حاصل شدہ عقیدۂ خلافت کے خوشنما محل کی بنیادیں کھوکھلی ہو جائیں گی چنانچہ

آیہ استخلاف کے ذیل میں صفحہ ۳۵ پر فرماتے ہیں "اس فقرے کی رُو سے اہل ایمان کی جماعت کا ہر فرد خلافت میں برابر کا حصہ دار ہے۔ کسی شخص یا طبقہ کو عام مومنین کے اختیارات خلافت سلب کر کے انہیں اپنے اندر مرکوز کر لینے کا حق نہیں ہے نہ کوئی شخص یا طبقہ اپنے حق میں خدا کی خصوصی خلافت کا دعویٰ کر سکتا ہے، یہی چیز اسلامی خلافت کو ملوکیت، طبقاتی حکومت اور مذہبی پیشواؤں کی حکومت سے الگ کر کے اسے جمہوریت کے رُخ پر موڑتی ہے" اس قاعدہ کی رُو سے اہلِ مدینہ کو کوئی حق حاصل نہیں کہ عام مومنین کے اختیاراتِ خلافت سلب کر کے اپنے اندر مرکوز کر لیں اور جسے چاہیں خلیفہ منتخب کر کے تمام مومنین کے لئے اس کو واجب الاطاعت حکمران مقرر کر دیں اور نہ حضرت عمر کو حق پہنچتا ہے کہ اپنی ذاتی تجویز سے حضرت ابوبکر کو آگے بڑھا دیں اور اس کی بیعت کر کے لوگوں کو ایسا کرنے کی دعوت دیں۔ اور اس کے بعد قاعدہ مذکورہ کی رو سے حضرت ابوبکر کو حق نہیں پہنچتا کہ اپنے بعد کے لیے حضرت عمر کو نامزد کر کے تمام اُمت کے لئے اس کو واجب الاطاعت فرمانروا مقرر کر دیں اسی طرح حضرت عمر کو قطعاً حق نہیں پہنچتا کہ تمام رُوئے زمین پر پھیلے ہُوئے مسلمانوں کے اختیاراتِ خلافت چھین کر صرف اہلِ مدینہ میں سے چھ آدمیوں کے حوالہ کر کے سب کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں۔ آیت استخلاف سے استنباط کردہ قاعدہ کی رُو سے یہ تینوں خلافتیں اسلامی جمہوری نہیں بلکہ ان پر ملوکیت اور طبقاتی حکومت کا رنگ غالب ہے اور ان کو کسی طرح بھی شرعی جواز کی حیثیت نہیں دی جا سکتی اور نہ وہ شرعی طور پر واجب الاطاعت دینی حکمران قرار دئے جا سکتے ہیں۔ خدا جانے مودودی صاحب کو یہ قاعدہ بہت جلد کیوں فراموش ہو گیا کہ صفحہ ۸۳ پر انتخابی خلافت کے ذیل میں لکھ دیا "حضرت ابوبکر کو حضرت عمر نے تجویز کیا اور مدینے کے تمام لوگوں نے (جو درحقیقت اس وقت پُورے ملک میں عملاً نمایندہ حیثیت رکھتے تھے) کسی دباؤ یا لالچ کے بغیر خود اپنی رضا و رغبت سے انہیں پسند کر کے ان کے ہاتھ پر بیعت کی" سچ ہے حب الشی یُعمی ویُصم۔ یعنی انسان کو کسی شے کی محبت اس کے عیوب دیکھنے سے اندھا اور نقائص سُننے سے بہرہ کر دیا کرتی ہے۔

"صفحہ ۵۵ پر تھیاکریسی (مذہبی پیشواؤں کی حکومت) اور اسلامی ریاست کے درمیان فرق بیان کرتے ہُوئے ارشاد فرماتے ہیں وہ (اسلامی ریاست) حاکمیت کو خدا کے لئے خالص کرنے کی حد تک تھیاکریسی کے بنیادی نظریہ سے متفق ہے مگر اس نظریے پر عمل درآمد کرنے میں اُس کا راستہ تھیاکریسی سے الگ ہو جاتا ہے مذہبی پیشواؤں کے کسی خاص طبقے کو خدا کی خصوصی خلافت کا حامل ٹھہرانے اور حل و عقد کے سارے اختیارات اس طبقے کے

حوالے کردینے کے بجائے وہ حدود ریاست میں رہنے والے تمام اہل ایمان کو (جنہوں نے
رب العالمین کے آگے سر تسلیم خم کرنے کا شعوری عہد کیا ہے) خدا کی خلافت کا حامل قرار
دیتی ہے اور حل و عقد کے آخری اختیارات مجموعی طور پران کے حوالے کرتی ہے "
"صلہ ۵۶ پر فرماتے ہیں۔ وہ (اسلامی ریاست) ایک ایسی ریاست ہے جو رنگ، نسل
زبان یا جغرافیہ کی عصبیتوں کے بجائے صرف اُصول کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے زمین کے ہر گوشے
میں نسل انسان کے جو افراد بھی چاہیں ان اُصولوں کو قبول کر سکتے ہیں اور کسی امتیاز و تعصب
کے بغیر بالکل مساوی حقوق کے ساتھ اس نظام میں شامل ہو سکتے ہیں دنیا میں جہاں بھی
ان اُصولوں پر کوئی حکومت قائم ہوگی وہ لازماً اسلامی حکومت ہی ہوگی۔ الخ "
اب ان ہر دو نظریوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے حضرت ابوبکر و عمر و عثمان کے انتخاب پر بھی ذرا
طائرانہ نظر ڈالئے یقیناً مودودی صاحب کے یہ نظریے آبائی تقلید کے تحت تسلیم کردہ خلافت کے
انتخاب کو اسلامی جمہوریت قطعاً نہیں بننے دیتے ایک طرف یہ کہدیا کہ " مذہبی پیشواؤں کے کسی خاص
طبقے کو خدا کی خصوصی خلافت کا حامل ٹھہرانے اور حل و عقد کے سارے اختیارات اس طبقے کے
حوالے کردینے کے بجائے وہ (اسلامی ریاست) حدود ریاست میں رہنے والے تمام اہل ایمان
کو خدا کی خلافت کا حامل قرار دیتی ہے اور حل و عقد کے آخری اختیارات مجموعی طور پران کے حوالے
کرتی ہے " اور دوسری طرف لاکھوں فرزندانِ اسلام کے اختیارات خلافت سلب کرکے اور ان سے حل و
عقد کے سارے اختیارات چھین کر اہلِ مدینہ کے حوالے کردیے۔ ایک طرف یہ کہہ دیا کہ نسل انسانی کے
سب افراد زمین کے ہر گوشے میں کسی امتیاز و تعصب کے بغیر بالکل مساوی حقوق کے ساتھ اس نظام
میں شامل ہو سکتے ہیں اور دوسری طرف یہ کہنے میں ذرہ بھر ہچکچاہٹ محسوس نہ کی کہ صرف اہلِ مدینہ کو
حق حاصل ہے کہ کسی شخص کو ساری اُمت کی گردنوں پر سوار کردیں کیونکہ حل و عقد کے پورے اختیارات
ان ہی میں محدود تھے۔ ایک طرف کہہ دیا خدا کی خصوصی خلافت کا کوئی فرد حامل نہیں ٹھہرایا جاتا۔ اور
دوسری طرف حضرت ابوبکر کا عمر کو نامزد کرکے خلیفہ مقرر کردینا اور اسے واجب الاطاعت سمجھنا بھی ذکر
کردیا۔ یہ سب اندھی تقلید کے افسوسناک نتائج ہیں کہ عقل دلائل و براہین کے ذریعے سے جو نظریات
متعین کرتی ہے کورانہ تقلید مقام عمل میں ان کو نظر انداز کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

......٭......

ملوکیت ہی ملوکیت

آبائی کورانہ تقلید کی بدولت مذہب کا جو راستہ ملا ہے مودودی صاحب نے اُس کی تصحیح کے لئے جن جن تکلفات کا ارتکاب کیا ہے وہ ناقد بصیر پر واضح وعیاں ہیں۔ اُنہوں نے کتب سیر و تاریخ کا مطالعہ کیا اور ہر کتاب سے اپنے مطلب کا فقرہ لیتے ہوئے اپنے زورِ قلم سے اُسے اپنے متعین راستے کی تائید و تصحیح کے لئے خوب نمک مسالہ لگا کر پیش کر دیا اور بعض اوقات اسی کوشش کے نتیجہ میں انہیں متضاد نظریوں کو یا ایسے نظریوں کو جن کا لازمہ تضاد ہے اپنانے میں کوئی باک نہ رہا۔ چنانچہ آپ کتاب خلافت و ملوکیت کا نظرِ غائر سے مطالعہ فرمائیں گے تو جہاں ایک طرف ان کی جدّت پسندی وسیع النظری مطلب فہمی جودتِ طبعی دقّتِ مزاجی اور سلاستِ بیانی کے ساتھ شانِ اجتہادی کی داد دینی ہوگی وہاں دوسری طرف ان کے ذہنی تشویش نظریاتی آویزش مقلدانہ روش اور متضاد نگارش کو دیکھ کر آپ دریائے حیرت میں غوطہ لگائے بغیر نہ رہ سکیں گے جس کا مشتے نمونہ از خروار یا قطرہ از بحر ذخار و ذرہ از ریگزار آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

خلافت و ملوکیت کے صـ۲۴۹ پر امام ابوحنیفہ کی رائے یہ لکھی ہے "پہلے بزور اقتدار پر قبضہ کرنا اور بعد میں دباؤ کے تحت بیعت لینا اُس کے انعقاد کی کوئی جائز صورت نہیں ہے۔ صحیح خلافت وہ ہے جو اہل الرائے لوگوں کے اجتماع اور مشورے سے قائم ہو۔ ابن ابی ذئب کا قول یہ نقل کیا ہے "حقیقت یہ ہے کہ خلافت اہل تقوے کے اجتماع سے قائم ہوتی ہے اور جو شخص خود اس پر قبضہ کرے اس کے لئے کوئی تقوے نہیں ہے۔

صـ۱۵۹ پر دورِ ملوکیت کی جبری بیعت کا رونا روتے ہوئے فرماتے ہیں "لوگ مسلمانوں کے آزادانہ اور کھلے مشورے سے نہیں بلکہ طاقت سے برسرِ اقتدار آتے رہے بیعت سے اقتدار حاصل ہونے کے بجائے اقتدار سے بیعت حاصل ہونے لگی"

آبائی تقلیدی عقیدہ سے غض بصر کرتے ہوئے بنظر انصاف خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر کی انعقادِ خلافت کی تفصیلی تاریخی رپورٹ کا دقتِ فکر اور امعانِ نظر سے مطالعہ کریں کیا دورِ ملوکیت کی دھاندلی سے اس میں کچھ کمی تھی تاریخی ماخذ میں کانٹ چھانٹ اور کتر بیونت سے مطلب براری کرنے کے بجائے آزادانہ غیر جانبداری سے فیصلہ کریں کہ کیا حضرت ابوبکر کی بیعت سقیفائی مجلس میں اہل رائے لوگوں

کے اجتماع ومشورے سے قائم ہوئی تھی؟ یا بقول ابن ابی ذئب اہل تقوےٰ کے اجتماع سے قائم ہوئی تھی؟ اگر جواب نفی میں ہے تو بعد والی ملوکیت اور اس ملوکیت میں کیا فرق ہے یہ خلافت کیوں ہے اور وہ ملوکیت کیوں ہے؟ اور اگر جواب اثبات میں ہے تو سعد بن عبادہ انصاری اور اس کی جماعت حضرت علی حضرت زبیر۔ عبداللہ بن عباس۔ مقداد بن اسود اور حضرت سلمان وغیرہ جیسے معتمد اور معززاصحاب پیغمبرؐ کو اہل رائے اور اہل تقویٰ کیوں نہ قرار دیا گیا؟ اور یہ اجتماع مسجد نبوی کے بجائے سقیفہ بنی ساعدہ میں کیوں کیا گیا؟۔

خدا[16] پر فرماتے ہیں " بڑا ظلم کرے گا وہ شخص جو ان دونو کو ایک درجے میں رکھ دے۔ اور دعویٰ کرے کہ اسلام میں یہ دونو طریقے یکساں جائز ہیں ایک محض جائز نہیں بلکہ عین مطلوب ہے اور دوسرا اگر جائز ہے تو قابل برداشت ہونے کی حیثیت سے ہے نہ کہ پسندیدہ ومطلوب ہونے کی حیثیت سے۔

کیا حضرت ابوبکر کے اقتدار پر قبضہ جمالینے کے بعد حضرت علی وجملہ بنی ہاشم (جو ان کے گھر میں جمع تھے) جلا دینے کی دھمکی دے کر بیعت پر مجبور نہیں کیا گیا تھا؟ کیا حضرت علی کو بیعت نہ کرنے پر قتل کی دھمکی حضرت عمر نے نہیں دی تھی؟ (جیسا کہ سابقاً حوالہ دیا جا چکا ہے) پس بڑا ظالم ہے وہ شخص جو اس قسم کی حاصل شدہ خلافت اور ملوکیت میں فرق کرلے۔

خود حضرت عمر کا یہ کہنا کہ ابوبکر کی خلافت کے انعقاد کا جو طریقہ ہم نے ایجاد کیا تھا وہ آیندہ کے لئے ناجائز ہے جیسا کہ مودودی صاحب کے حوالہ سے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ بعد میں اس طریق کار سے جو حکومت برسر اقتدار ہو گی وہ ملوکیت ہو گی اور اسی طریق کار سے جو ہم نے حکومت بنائی ہے وہ خلافت ہے۔ مودودی صاحب کا فرمان ہے کہ نصب خلافت کا صحیح طریقہ وہ ہے جو خلافت راشدہ کے انعقاد کے لئے اختیار کیا گیا اور اس کے مقابلہ میں وہ طریقہ ہے جس کو معاویہ اور اس کے بعد والے لوگوں نے اختیار کیا پہلے طریقے کی اسلام نے ہمیں ہدایت کی ہے اور دوسرا طریقہ مجبوراً صرف قابل برداشت ہے نہ کہ پسندیدہ۔ اور ہم نے واضح کر دیا ہے کہ پہلے طریقے اور دوسرے طریقے میں دھاندلی کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں اگر فرق ہے تو صرف اتنا کہ پہلا طریقہ جو حضرت عمر نے اختیار کیا چونکہ حضرت عمر نے اختیار کیا لہذا وہ اسلامی ہے اور وہی طریقہ جو بعد والے لوگوں نے اختیار کیا چونکہ بعد والوں نے اختیار کیا لہذا غلط ہے اسی فرق کی بنا پر پہلا موجب خلافت ہے۔ اور دوسرا اساس ملوکیت پہلے طریقہ میں حضرت عمر نے تحریک کی بغیر کسی مشورہ کے اچانک۔ پھر بیعت کر

لی اور چند آدمیوں نے اس کی تائید کردی پھر باقیوں کو اقتدار کے زور سے تابع کر لیا گیا اور یہی طریقہ معاویہ اور بعد والے لوگوں کا بھی رہا۔ اس کے بعد مرنے سے پہلے اکابر صحابہ کے مشورہ کے بغیر حضرت ابوبکر نے حضرت عمر کی تجویز کی اور باقیوں سے منوالی گئی پھر کسی سے مشورہ لئے بغیر حضرت عمر نے پوری اُمت کے اختیارات چھ آدمیوں میں بند کردئے اور خلیفہ کا انتخاب ہو گیا۔ اسی طرح دوسرے طریقے کا ردعمل ہے۔ قضیہ دومۃ الجندل میں تحکیم کے موقعہ پر عمرو عاص نے معاویہ کا نام تجویز کر لیا۔ معاویہ کے طرفداروں نے اس کی تائید کردی۔ پھر حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد پوری اُمت سے بزورِ اقتدار بیعت لے لی گئی اور دوسرے خلیفے کی طرح معاویہ نے قبل از مرگ یزید کو نامزد کردیا اور ہوا خواہوں نے تائید کردی پھر باقی اُمت بزورِ شمشیر تابع کرلی گئی۔ اور یزید کے بعد اموی شورائی کمیٹی نے مروان کو منتخب کرلیا۔ تاریخ کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی سمجھ سکتا ہے کہ ان ہر دو صورتوں میں طریق کار ایک ہی ہے پس منصف مزاج آزادیٔ فکر و رائے رکھنے والے انسان پر مخفی نہیں رہتا کہ رسالت مآب کے بعد سے ہی ملوکیت کا دَور شروع ہو گیا تھا اور آزادیٔ ضمیر کو کچلنے والی حکومتوں کے لئے راستہ یہیں سے ہموار کر لیا گیا تھا جو رفتہ رفتہ تدریجاً صحبت پیغمبرؐ کے اثرات سے دُور ہوتے ہوتے افسوسناک حالات تک جا پہنچا۔ شروع شروع میں چونکہ لوگوں کی اکثریت اخلاقِ نبوی اور کردارِ اسلامی سے مانوس تھی پس حکمرانوں نے بھی نظامِ اسلامی اور کردارِ نبوی کو امکانی حدود تک رائج رکھا اور خود بھی ظاہری طور پر اسی کے پابند رہے اور برسرِ اقتدار پارٹی کے ہوا خواہ پُورے زور و شور سے ان حکومتوں کو خلافتوں کا نام دیتے رہے اور خلفا سے سرزد ہونے والی غلطیوں کو دامنِ تاویل میں چھپاتے رہے اور اختلاف رائے رکھنے والے اکابرِ دین کو ہدفِ تنقید بناتے رہے اور ان کے اختلافات کو سیاسی اختلاف کہہ کر حکومت کو اسلامی حکومت کے نام سے پکارتے رہے لیکن جُوں جُوں وقت گذرتا گیا اور صحبتِ نبوی کا زمانہ پُرانا ہوتا گیا اسلامی نقوش دلوں سے محو ہوتے گئے حکومتی مشینری کے پُرزے اقتدار کی ہوا اور دولت کی نمی سے زنگ آلود ہوتے گئے حتی کہ کرسیٔ اقتدار سے ہونے والی غلطیوں کی تاویل حامیانِ اقتدار کے بس سے بھی باہر ہو گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا، کہ حکومت کے بہی خواہ بھی حکومت کو خلافت کا نام دیتے ہُوئے شرمانے لگے پس مجبُوراً اس کو ملوکیت کا نام دے دیا حالانکہ ملوکیت کی ابتداء سقیفائی کمیٹی کے فیصلے سے ہی ہو گئی تھی۔ حضرت علی علیہ السلام نے پہلے دن سے حکومتِ وقت کو متنبہ کردیا تھا کہ یہ تمہاری قائم کردہ حکومت ملوکیت ہے نہ کہ خلافت اور آپ نے حاکمِ وقت کے لئے نہ خلیفہ رسول کا لقب جائز قرار دیا اور نہ امیر المومنین کہلانا جائز سمجھا جیسا کہ ابن قتیبہ دینوری کی کتاب الامامۃ والسیاسۃ سے حوالہ دیا جا چکا ہے اور حضرت علی علیہ السلام نے جب اپنے متعلق

اپنے ذاتی کمالات اور علم وفضل وفہم وجملہ اوصاف کی بنا پر استحقاق خلافت کا دعوٰی کیا تو حکمران پارٹی میں سے کسی نے آپ کے استحقاق کی تردید نہ کی اور نہ آپ کے دلائل کا کسی کے پاس جواب تھا بلکہ سرکاری وکیل حضرت ابوعبیدہ بن جراح نے اتنا ہی کہا کہ یہ لوگ سن رسیدہ بزرگوار ہیں آپ ان کے خلاف قدم نہ اٹھائیں اگر زندگی باقی رہی تو اوصافِ ذاتیہ وکمالات نفسیہ اور قرابت نبویہ کے پیش نظر آپ کا زیادہ حقدار ہونا مسلّم ہے۔ ابوعبیدہ کے اس قول میں دبی زبان سے انتخاب کی غلطی اور حضرت علی کے دعوٰی کی صداقت کا اعتراف موجود ہے۔ اور بقولِ ابن قتیبہ حضرت عمر کا یہ کہنا کہ اگر آپ نے بیعت نہ کی تو سر قلم کر دیا جائے گا حضرت علی کے استدلال کا اپنے پاس جواب نہ رکھنے کا کھلا اعتراف ہے۔

علامہ تفتازانی نے شرح عقائد نسفیہ (مطبع مجتبائی صنا۱) میں وجوب نصب امام کی تین دلیلیں بیان کی ہیں (۱) حضور کا فرمان ہے مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَعْرِفْ اِمَامَ زَمَانِهٖ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً جو شخص امام زمان کی معرفت کے بغیر مر جائے وہ جاہلیت کی موت مرتا ہے (۲) اُمّت کا اجماع ہے۔ کہ وفاتِ پیغمبر کے بعد سب واجبات میں سے اہم نصب امام ہے چنانچہ صحابہ نے دفنِ پیغمبرؐ پر بھی نصب امام کو مقدم کیا (۳) بہت سے واجبات شرعیہ کی ادائیگی کا دار و مدار چونکہ امام پر ہے اس لئے اس کا نصب کرنا ضروری ہے اور متنِ عقائد میں ہے کہ مسلمانوں پر امام کا متعین کرنا واجب ہے تاکہ وہ ان میں احکام نافذ کرے اور حدّیں قائم کرے وغیرہ اور بالعموم جنازۂ رسولؐ کو پسِ پشت ڈال کر نصب خلیفہ کی جلدی کا عذر بھی بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن مودودی صاحب نے صنہ۲۵ پر امام ابوحنیفہ کا قول نقل کیا ہے جب کہ انہوں نے منصور خلیفہ عباسی کے انتخاب کو چیلنج کیا تھا۔

"آپ پر اہل فتوٰی لوگوں میں سے دو آدمیوں کا اجتماع بھی نہیں ہوا حالانکہ خلافت مسلمانوں کے اجتماع اور مشورے سے ہوتی ہے۔ دیکھئے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ چھ مہینے تک فیصلے کرنے سے رکے رہے جب تک کہ اہل یمن کی بیعت نہ آگئی"

امام ابوحنیفہ کے اس قول سے نصب امام میں جلدی کرنے کے اس بہانے کی قلعی بھی کھل گئی ۔ کہ خلافت ابوبکر کو قائم کرنے کی جلدی اس لئے کی گئی کہ نظام اُمت درہم برہم نہ ہو۔ ان کے مقدمات واحکام میں نفاذ کی تاخیر نہ ہو۔ پس بقول امام ابوحنیفہ اگر ایسا ہو تا تو یمنیوں کی بیعت کی اطلاع پہنچنے تک حضرت ابوبکر نے پورے چھ ماہ تک خلافت کے کاموں کو معطل کس لئے رکھنا تھا؟ پس خلافت میں جلدی کی وجہ وہی ہے جو مودودی صاحب نے حضرت عمر کی زبانی بیان کی ہے کہ ہم ایسا نہ کرتے تو اقتدار کسی اور کے ہاتھ میں چلا جاتا جس کو نہ ہم رد کر سکتے اور نہ قبول۔ پس مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر ہم نے یہ کام کر دیا ہے لیکن اگر

کوئی اور کرے گا تو ناجائز ہوگا اور بایں ہمہ یہ دعویٰ بھی ہے کہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے والے بنی آدم کے تمام افراد کو اظہار رائے کا حق حاصل ہے۔ العجب۔

خلافتی الیکشن کا پس منظر

جناب علامہ مودودی صاحب نے تو حقائق کے چہرہ پر گرد ڈالتے ہوئے اپنی حق گوئی کا فریضہ ادا کر دیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں" نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی جانشینی کے لئے حضرت ابوبکر کو حضرت عمر نے تجویز کیا اور مدینے کے تمام لوگوں نے جو درحقیقت اس وقت پورے ملک میں عملاً نمائندہ حیثیت رکھتے تھے کسی دباؤ یا لالچ کے بغیر خود اپنی رضا و رغبت سے انہیں پسند کر کے ان کے ہاتھ پر بیعت کی" خلافت و ملوکیت صہ ۸۳

اس میں شک نہیں کہ کورانہ تقلید کا عادی تو اس اعلان کو سُن کر بالکل مطمئن ہو جائے گا لیکن تاریخ کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی جس کے حساس دل میں حق طلبی کی شوق ہو وہ ایسی بے تکی ہانکنے والے کے منہ میں حقائق و واقعات کی لگام دینے سے گریز نہ کرے گا کیونکہ صحابہ کی ایک بہت بڑی جماعت نے دھونس اور دھاندلی سے منعقد ہونے والی خلافت کو سراسر ناجائز بلکہ ایک ڈھونگ قرار دیا ہے ان مقتدر صحابہ میں عشرہ مبشرہ کے چار افراد بھی شامل ہیں حضرت علیؑ حضرت طلحہؓ حضرت زبیرؓ اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص۔ حوالہ کے لئے تاریخ طبری۔ سیرت بن ہشام و دیگر کتب تاریخ ملاحظہ ہوں

آل محمدؐ کا نظریہ

حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ۔ ابن قتیبہ دینوری کی مفصل رپورٹ سے حضرت علی علیہ السلام کی پوزیشن واضح ہے کہ آپ خلیفہ کے انتخاب کو جائز نہیں جانتے تھے ملاحظہ ہو کتاب ہذا از صہ ۲۵ تا صہ ۳۳ اور خلافت کے متعلق مزید تسلی کرنے کے لئے (نہج البلاغہ) میں آپ کا خطبۂ شقشقیہ کافی ہے لَقَدْ تَقَمَّصَهَا ابْنُ اَبِي قُحَافَةَ وَهُوَ يَعْلَمُ اَنَّ مَحَلِّي مِنْهَا مَحَلُّ الْقُطْبِ مِنَ الرَّحٰى یعنی بزور ابن ابی قحافہ (ابوبکر) نے قمیص خلافت کو پہن لیا حالانکہ اسے معلوم تھا کہ میری (علی کی) نسبت خلافت سے وہی ہے جو میخ آسیہ کو آسیہ سے ہے۔

يَنْحَدِرُ عَنِّي السَّيْلُ وَلَا يَرْقٰى اِلَيَّ الطَّيْرُ مجھ سے علوم، سیلاب بن کر جاری ہوتے ہیں اور میرے مناقب کی بلندیوں تک پرندہ بھی پرواز کر کے نہیں پہنچ سکتا۔ سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا فَصَبَرْتُ وَ فِي الْحَلْقِ شَجًى وَفِي الْعَيْنِ قَذًى پس میں نے صبر سے کام لیا حالانکہ حلق میں سوزش اور آنکھ میں تنکا موجود ہے (نہج البلاغہ) اس کے بعد آپ کا یہ سارا خطبہ آپ کے نظریات کا آئینہ دار اور انصاف طلب آنکھوں کے لئے سرمۂ معرفت

ہے باقی رہی آپ کی حکومتِ وقت سے رواداری اور ان سے حسبِ ضرورت تعاون تو وہ ان کی رضامندی کی دلیل نہیں بلکہ ملک و ملت کے وسیع و عظیم تر مفاد کی خاطر آپ کی وسعتِ قلبی اور دریا دلی کا مظاہرہ ہے

(۲) جناب خاتونِ جنت فاطمہؑ بنت محمدؐ۔ خلافتِ جمہوریہ کے انعقاد پر جناب فاطمہؑ کی ناراضی کا واقعہ ابنِ قتیبہ دینوری کی زبانی دھرایا جا چکا ہے۔

علاوہ ازیں جو صحابہ اس اچانک ہونے والے اور دھونس و دھاندلی سے جیتے ہوئے خلافتی الیکشن کو کالعدم قرار دیکر حضرت علیؑ کے لئے بیعت کے مطالبہ پر مصر تھے وہ اس الیکشن کا مکمل بائیکاٹ کر کے احتجاج کے طور پر حضرت علیؑ کے بیت الشرف میں جمع تھے کیونکہ سابق الیکشن میں حضرت ابوبکر کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو ایک سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت منصب خلافت کے لئے اپنا نام پیش کرنے کا موقعہ ہی نہ دیا گیا تھا اور حضرت عمر نے اچانک حضرت ابوبکر کا نام تجویز کر کے ان کے حق میں بیعت طلب کر لی تھی۔ خلافت و ملوکیت ص۸۴ تاکہ بلا مقابلہ الیکشن جیتنے کا سہرا ان کے سر پہ باندھ کر ان کی مقبولیت و ہر دلعزیزی کا ڈھنڈورا پیٹا جا سکے اور یہ یاد رہے کہ آج کل کا ووٹ اور اس زمانہ کی بیعت دونوں ہم معنی چیزیں ہیں۔ وقت کی نزاکت کے باوجود حضرت سعد بن عبادہ انصاری خزرجی نے بھی امیدوارِ خلافت کی حیثیت سے اپنا نام پیش کر دیا لیکن قبیلہ اوس و خزرج کی پرانی قلبی رنجش حضرت عمر کو راس آئی اور قبیلہ اوس کی مکمل حمایت سے اُن کا دھڑا بھاری ہو گیا چنانچہ سعد بن عبادہ پہ دباؤ ڈال کر اس کو اپنا نام لینے پر مجبور کر دیا گیا اس کے بعد اس کی صدائے احتجاج پر کسی نے کان دھرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ اچانک نامزدگی کی بنا پر چونکہ حضرت علی کو اپنا نام پیش کرنے کا موقعہ نہ دیا گیا تھا تو حضرت ابو عبیدہ انصاری جو سرکاری وکیل ہونے کے علاوہ چیف الیکشن کمشنر کی اتھارٹی بھی رکھتے تھے آپ نے اس تک اپنی شکایت پہنچائی لیکن اس نے آپ کی شکایت کو جائز اور صحیح قرار دینے کے باوجود الیکشن مذکور کو کالعدم قرار دینے کی جرأت نہ کی۔

پس صحابہ کے اس احتجاجی جلسے کو منتشر کرنے اور حضرت ابوبکر کے لئے زبردستی "یا بقول مودودی صاحب برضا و رغبت" بیعت لینے کے لئے حضرت عمر نے مقامی پولیس کے ہمراہ حضرت علی کے گھر کا محاصرہ کیا تو جناب فاطمہؑ کو مخاطب کر کے کہا مَا اَحَدٌ اَحَبُّ اِلٰی اَبِیْكِ مِنْكِ وَمَا ذَالِكَ بِمَانِعِی اِنِ اجْتَمَعَ هٰؤُلَاءِ النَّفَرُ عِنْدَكِ اَنْ اٰمُرَتُهُمْ اَنْ يُحَرِّقُوا عَلَيْكِ الْبَابَ۔ کنز العمال ملا علی قاری جلد ۳ ص ۱۴۰ ترجمہ (میں جانتا ہوں) کہ تیرے باپ (رسول اللہ) کو تجھ سے زیادہ کوئی محبوب نہ تھا تاہم یہ بات مجھے اس امر سے نہیں روکتی کہ اگر یہ لوگ تیرے پاس جمع رہے تو میں تیرے دروازہ کو جلانے کا حکم دے دوں گا اور اسی نوعیت کے الفاظ الریاض النضرہ ج۱ ص۱۶۷ اور مروج الذہب اور انساب الاشراف بلاذری جلد ۱ ص ۵۸۶ سے بھی نقل کئے گئے ہیں نیز احراقِ بابِ فاطمہ کی روایت العقد الفرید ج ۳ ص ۶۳ میں بھی موجود ہے۔

ایک روایت میں ہے قَالَتْ فَاطِمَةُ لَتَخْرُجُنَّ اَوْلَاَكْشِفَنَّ شَعْرِىْ وَلَاَعِجَّنَّ اِلَى اللّٰهِ فَخَرَجُوْا تاریخ یعقوبی جلد ۲ صہ ۱۰ علی ما نقل عنہ ۔ ترجمہ: جناب فاطمہ نے لوگوں کے ہجوم سے فرمایا نکل جاؤ ورنہ میں سر کے بال پریشان کر کے بارگاہِ خداوندی میں گڑگڑا کر تمہارے اوپر بد دعا کروں گی پس وہ نکل کھڑے ہوئے الملل والنحل شہرستانی جلد ا صہ ۲۶ سے بی بی عالیہ کے شکم اطہر پر ضرب اور حضرت محسن کی شہادت بھی منقول ہے

صحابہ کا نظریہ

(۱) حضرت عباسؓ ۔ ان کا ابوبکر کی بیعت سے انکار کرنا تمام کتب تاریخ میں موجود ہے

(۲) فضل بن عباسؓ تاریخ یعقوبی ج ۲ صہ ۱۰۳ سے منقول ہے آپ نے گروہ قریش سے خطاب کر کے فرمایا ۔ اے قریشیو! یہ خلافت جس طریق کار سے تم نے حاصل کی تمہارے لئے قطعاً ناجائز ہے تمہاری بہ نسبت ہم اس کے زیادہ حقدار ہیں اور ہمارا ساتھی (علی) تمہاری بہ نسبت اس کا زیادہ حقدار ہے ۔

(۳) عبداللہ بن عباسؓ ۔ ایک دن حضرت عمر اور حضرت ابن عباس کی روبرو گفتگو ہوئی تو حضرت عمر نے کہا تم لوگ کہتے پھرتے ہو کہ ہم سے ظلم و حسد کی بنا پر خلافت چھین لی گئی ہے؟ ابن عباس نے جواب دیا ظلم والی بات تو عالم و جاہل ہر ایک پر عیاں ہے اور حسد کے متعلق میں اتنا کہتا ہوں کہ ابلیس نے آدم پر حسد کیا تھا اور ہم اس کی محسود اولاد ہیں ۔ تاریخ طبری جلد ۲ صہ ۲۸۹ اور وفات فاطمہ تک کسی بھی ہاشمی نے ابوبکر کی بیعت نہیں کی (مروج الذہب ج ۲ صہ ۹۴)

(۴) حضرت سلمانؓ ۔ ابن ابی الحدید جلد ۲ صہ ۱۳۱ سے منقول ہے خلافت کے بلا مقابلہ الیکشن کے بعد آپ نے جیتنے والی پارٹی کو خطاب کر کے کہا اَصَبْتُمُ الْحَيْرَةَ وَاَخْطَاْتُمُ الْمَعْدِنَ تم نے سرگردانی کو پسند کر لیا اور اس ذات سے بھٹک گئے ہو جو علوم نبویہ اور فضائل و مناقب کی کان ہے ۔

(۵) حضرت ابوذر وہ صحابی ہے جس کے متعلق حضرت پیغمبر کا ارشاد ہے کہ زمین کی پشت پر اور فلک نیلگوں کے سایہ میں ابوذر سے زیادہ سچی زبان رکھنے والا کوئی نہیں خلافتی الیکشن کا افسوسناک نتیجہ سن کر آپ نے فرمایا" جو کچھ تم نے کیا سو کیا ۔ اب اس کے عبرتناک انجام کے لئے تیار رہو اور ظالموں کو اپنے ظلم کا بدلہ ضرور ملے گا ۔ مروی از تاریخ یعقوبی صہ ۱۲

(۶) حضرت زبیرؓ ۔ جن صحابہ نے متفقہ طور پر الیکشن اور اس کی مبینہ کارروائی کو غلط قرار دیا تھا اور وہ الیکشن مذکور کو کالعدم قرار دینے کا ریزولیشن پاس کر کے حضرت علیؑ کے گھر میں جمع تھے ۔ ان میں حضرت عباس بن عبد المطلبؓ حضرت زبیرؓ حضرت طلحہؓ حضرت مقدادؓ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بھی تھے جب حضرت عمر نے ان کا محاصرہ کیا تو حضرت زبیرؓ نے صاف لفظوں میں اعلان کر دیا تھا کہ لَا نُبَايِعُ اِلَّا عَلِيًّا یعنی ہم حضرت علی کے علاوہ کسی کی بیعت نہیں کریں گے (تاریخ طبری) پس گرفتاریاں ہوئیں اور ان کو اس وقت تک رہا نہ کیا گیا ۔ جبتک" بقول مودودی صاحب وہ برضا و رغبت بغیر کسی دباؤ و لالچ کے " حلقہ بیعت میں شامل نہ ہوئے پس حضرت زبیرؓ کو ظاہرًا تو خاموش کرا لیا

گیا لیکن ان کے دل کی آواز کو دبایا نہ جا سکا چنانچہ وہ کسی مقام پہ کہہ بیٹھے کہ جب عمر مرے گا تو میں حضرت علیؑ کا نام پیش کر کے ان کے لئے اُسی طریقہ سے بیعت لوں گا جس طریقہ سے حضرت عمر نے حضرت ابوبکر کے لئے لی تھی اور یہی الفاظ حضرت عمر تک پہنچا دیئے گئے۔ چنانچہ انساب الاشراف بلاذری جلد اصد ۵۸۱ سے منقول ہے اِنَّ عمر قَالَ بَلَغَنِیْ اَنَّ الزُّبَیْرَ قَالَ لَوْ قَدْ مَاتَ عمر بَایَعْنَا عَلِیًّا۔ حضرت عمر نے اپنی تقریر میں" فرمایا کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ زبیر کہتا ہے جب عمر مرے گا ہم حضرت علی کی بیعت کر لیں گے اس کے بعد دھمکی دیتے ہوئے فرمایا خبردار فَمَنْ بَایَعَ رَجُلًا عَلٰی غَیْرِ مَشْوَرَۃٍ فَاِنَّھُمَا اَھْلٌ اَنْ یُّقْتَلَا صد ۵۸۴ جس نے بھی مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی کی بیعت کی تو وہ دونوں اس لائق ہیں کہ ان کو قتل کیا جائے۔ جناب مودودی صاحب نے خلافت و ملوکیت میں کسی مخصوص مصلحت کی بنا پر حضرت علیؑ و زبیر کا نام نہیں لیا لیکن روایت مذکورہ کو کتاب کے صد ۸۴ پہ بیان فرما دیا۔

اس سے صاف واضح ہے کہ خلافت نبویہ کے اس پہلے الیکشن میں مبینہ دھاندلی کا حضرت عمر کو اعتراف تھا اور اس دھاندلی کو انہوں نے صرف ناجائز ہی نہیں کہا بلکہ اس کے مرتکب کو واجب القتل بھی قرار دیا خواہ وہ علیؑ و زبیر ہی کیوں نہ ہوں البتہ اپنے لئے اسی دھاندلی کو جائز قرار دینے کی ایک شق نکال لی کہ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو راتوں رات فیصلہ ہماری منشا کے خلاف ہو جاتا جس کو ہم نہ قبول کر سکتے اور نہ ٹھکرا سکتے۔ جس طرح کہ حضرت علیؑ و زبیر وغیرہ صحابہ کے لئے متذکرہ الیکشن کا نتیجہ کہ اس کو قبول کرنا بھی مشکل تھا اور اس کا ٹھکرانا بھی مشکل"

حضرت سعدؓ بن عبادہ خزرجی انصاری۔ سقیفۂ بنی ساعدہ جو خلافتی انتخاب کے لئے پہلا پولنگ اسٹیشن تھا جب وہاں انتخابی کارروائی کا رزلٹ (نتیجہ) مرتب ہوا اور حضرت ابوبکر کے مقابل امیدوار حضرت سعد کو انتخاب لڑنے سے جبراً روک دیا گیا اور اس کی آواز کو بھی دبا دیا گیا تو بلا مقابلہ حضرت ابوبکر کے لئے رائے عامہ کو ہموار کرنے کی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی چنانچہ حضرت خاتون جنت کے گھر کا محاصرہ بھی اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی تھی پس کرسی اقتدار کو جب قدرے استحکام نصیب ہوا تو دوبارہ سعد بن عبادہؓ کی طرف عنانِ توجہ مبذول کی گئی اور ان کے نام حاضر دربار ہو کر" برضا و رغبت" شامل بیعت ہونے کا سرکاری فرمان جاری ہوا لیکن وہ اپنے سابق موقف پر نہایت پامردی سے ڈٹا رہا اور اس نے حکومت کی جانب سے جاری کردہ حکم کو پائے استحقار سے ٹھکراتے ہوئے جواب دیا

اَمَا وَاللّٰہِ حَتّٰی اَرْمِیَکُمْ بِمَا فِیْ کِنَانَتِیْ مِنْ نَبْلٍ وَاَخْضِبُ سِنَانَ رُمْحِیْ وَاَضْرِبُکُمْ بِسَیْفِیْ مَا مَلَکَتْہُ یَدِیْ وَاُقَاتِلُکُمْ بِاَھْلِ بَیْتِیْ وَ مَنْ اَطَاعَنِیْ مِنْ قَوْمِیْ وَاَیْمُ اللّٰہِ لَوْ اَنَّ	خدا کی قسم میں اپنے ترکش کے تمام تیر تم پر برساؤں گا اور اپنے نیزے کی انی کو رنگین کروں گا اور جب تک میرے ہاتھ میں تلوار رہے گی تم پر چلاتا رہوں گا اور اپنے خاندان اور اپنی قوم کے وفادار افراد کو ساتھ ملا کر تم سے بھرپور جنگ کرونگا اور بخدا اگر

الجن اجتمعت لكم مع الانس ما بايعتكم حتّٰى اعرض على ربّى و اعلم ما حسابى. قال عمر لاندعه حتّٰى يبايع. قال بشير ابن سعد انه لج و ابى و ليس بمبايعكم حتّٰى يقتل و ليس بمقتول حتّٰى يقتل معه ولده و اهل بيته و طائفة من عشيرته فاتركوه فليس تركه بضار كم انما هو رجل واحد .... فكان سعد لا يصلى بصلاتهم ولا يجتمع معهم ولا يحج و لا يفيض معهم بافاضتهم فلم يزل كذالك حتّٰى توفّى ابوبکر و ولى عمر طبری جلد۲ صہ ۴۵۹، کنز الاعمال ج۳ صہ ۱۳۴

اگر جن بھی انسانوں کے ساتھ مل کر تمہاری بیعت کرلیں تو میں تمہاری بیعت نہ کروں گا یہاں تک کہ اپنے رب کے پیش ہوکر اپنا حساب سمجھ پاؤں گا۔ عمر نے کہا ہم اس کو بیعت کے بغیر نہ چھوڑیں گے تو بشیر بن سعد اوسی نے کہا چھوڑ دیجئے اس نے ضد اور انکار کر دیا ہے وہ ہرگز تمہاری بیعت نہ کریگا مگر یہ کہ قتل ہو جائے اور وہ تب قتل ہوگا کہ اس کے ساتھ اس کے بیٹے اور سارا خاندان اور اس کے قبیلہ کے چیدہ افراد بھی قتل ہو جائیں پس اسکو چھوڑ دیجئے کیونکہ اس فرد واحد کو چھوڑ دینا تمہیں نقصان نہیں پہنچاتا ..... پس اس کے بعد سعد ان کی جماعت میں اور نہ ان کے ساتھ جمعہ میں شامل ہوتا تھا اور نہ حج و افاضہ ان کے ہمراہ کرتا تھا اور حضرت ابوبکر کی وفات اور حضرت عمر کی تخت نشینی تک وہ اسی دستور پر قائم رہا۔

مروی ہے کہ سعد مذکور ترک وطن کر کے شام چلا گیا حضرت ابوبکر کی وفات کے بعد حضرت عمر نے اس کی طرف بیعت کا آرڈر بھیجا لیکن وہ مرد آہن اپنے انکار پر ڈٹا رہا۔ چنانچہ اس قاصد نے اس کو قتل کر ڈالا۔ العقد الفرید جلد۲ صہ ۶۴

قال المسعودی خرج سعد بن عبادہ ولم یبایع فصار الی الشام فقتل هنالك سنة ۱۵ من الهجرة

مروج الذہب ج۲ صہ ۱۹۴ ترجمہ: مسعودی نے ذکر کیا ہے کہ سعد نے بیعت نہ کی اور شام کی طرف چلا گیا اور ۱۵ھ میں اس کو قتل کر دیا گیا

تائید مزید اس مقام پر نہایت مناسب ہے کہ ایسے دو افراد کی شہادتیں بھی نقل کر دی جائیں جن کو عامۃ المسلمین کے نزدیک بہت بلند مقام حاصل ہے تاکہ اس پہلے اسلامی الیکشن کے جواز کی قلعی کھل جائے جس کو نہایت غیر جانبدارانہ اور مبنی بر انصاف کہتے کہتے محقق دوران تھکتے نہیں اور یہ دو افراد وہ ہیں جن کو شیعیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں بلکہ ان کا دشمن علیؑ ہونا اظہر من الشمس ہے اور وہ ہیں ابوسفیان اور اس کا بیٹا معاویہ امیر شام۔

ابوسفیان ۔ یہ شخص ابوبکر کی بیعت کا سخت انکاری تھا اور اس کو کسی قیمت پر جائز خلیفہ تسلیم کرنے پر تیار نہ تھا اور الیکشن کے مبینہ نتیجہ کے خلاف احتجاج کرنے والوں میں پیش پیش تھا بلکہ اس نے حضرت علیؑ کو سول نافرمانی کی طرف لانے کی کوشش میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن حضرت علیؑ اس کی سابق اسلام دشمنی کے پیش نظر

جانتے تھے کہ یہ شخص مسلمانوں کی خانہ جنگی سے اسلام کو نقصان پہنچانے کی خاطر ہی یہ جتن کر رہا ہے لہذا آپ نے اسکی اس بارے میں ہر پیش کش کو پائے تحقیر سے ٹھکرا دیا۔ ابوسفیان نے الیکشن کا نتیجہ سنتے ہی پہلے دن کہہ دیا تھا اِنِّی لَاَرٰی عَجَاجَۃً لَا یُطْفِئُهَا اِلَّا الدَّم۔ یعنی مجھے ایسی گرد نظر آرہی ہے جس کو خون کے سوا کوئی شی نہ فرو کر سکے گی۔ تاریخ طبری جلد ۲ صـ ۴۴۹۔ ابوسفیان کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

بَنِیْ هَاشِمٍ لَا تُطْمِعُوا النَّاسَ فِیْکُمْ
وَلَا سِیَّمَا تَیْمُ بْنُ مُرَّةَ اَوْ عَدِی
فَمَا الْاَمْرُ اِلَّا فِیْکُمْ وَاِلَیْکُمْ
وَلَیْسَ لَهَا اِلَّا اَبُوْ حَسَنٍ عَلِی

اے بنی ہاشم تم لوگوں سے بالعموم
اور بنی تیم اور بنی عدی سے بالخصوص بھلائی کی امید نہ رکھو
درحقیقت امر خلافت کو تم میں اور تمہاری طرف ہی پلٹنا چاہیے
اور اسکا حقدار سوائے ابوالحسن علی اور

ان تمام باتوں کے باوجود مروی ہے۔ ثُمَّ اَنَّ الْتِقَاهُمْ قَدْ تَمَّ بَیْنَهُمَا وَبَیْنَهٗ بَعْدَ تَعْیِیْنِ اِبْنِهٖ یَزِیْدِ بْنِ اَبِیْ سُفْیَانَ اَمِیْرًا عَلَی الْجَیْشِ الْغَازِیْ۔ یعنی اس کے بعد حضرت ابوبکر اور حضرت عمر نے ابوسفیان کے بیٹے یزید کو مجاہد فورس کا جرنیل مقرر کردیا اور اس سیاسی رشوت کی پیش کش کے بعد ابوسفیان اور ان دونوں کے درمیان باہمی تعاون پر سمجھوتہ ہوگیا۔ تاریخ طبری جلد ۲ صـ ۴۴۹ پس ابوسفیان بھی بقولِ علامہ مودودی صاحب برضا و رغبت حلقۂ بیعت میں شامل ہوگیا۔

معاویہ بن ابی سفیان ۔ معاویہ نے محمد بن ابی بکر کو ایک خط لکھا۔

فَقَدْ کُنَّا وَاَبُوْکَ فِیْنَا نَعْرِفُ فَضْلَ ابْنِ اَبِیْ طَالِب وَحَقَّهٗ لَازِمًا لَنَا مَبْرُوْرًا عَلَیْنَا فَلَمَّا اخْتَارَ اللهُ لِنَبِیِّهٖ مَا عِنْدَهٗ وَاَتَمَّ لَهٗ مَا وَعَدَهٗ وَاَظْهَرَ دَعْوَتَهٗ وَاَبْلَجَ حُجَّتَهٗ وَقَبَضَهُ اللهُ اِلَیْهِ ۔ کَانَ اَبُوْکَ وَفَارُوْقُهٗ اَوَّلَ مَنِ ابْتَزَّهٗ حَقَّهٗ وَخَالَفَهٗ عَلٰی اَمْرِهٖ ۔ عَلٰی ذٰلِکَ اتَّفَقَا وَاتَّسَقَا ثُمَّ اِنَّهُمَا دَعَوَاهُ اِلٰی بَیْعَتِهِمَا فَاَبْطَاَ عَنْهُمَا وَتَلَکَّاَ عَلَیْهِمَا فَهَمَّا بِهِ الْهُمُوْمَ وَاَرَادَا بِهِ الْعَظِیْمَ ۔ ثُمَّ اِنَّهٗ بَایَعَ لَهُمَا وَسَلَّمَ لَهُمَا

ہم اور تیرا باپ ابوبکر مل کر حضرت علی کی فضیلت کا اعتراف کرتے تھے اور ان کا حق اپنے اوپر واجب لازم جانتے تھے جب اللہ نے اپنے نبی کے لئے پسند فرمایا جو وہ چاہتا تھا اور اس نے اپنے نبی کے ساتھ کئے ہوئے وعدے پورے کر دیئے اس کی دعوت کو غالب اور اسکی دلیل کو واضح کر دیا تو اس کو اپنی طرف بلا لیا تیرا باپ اور اس کا ساتھی فاروق پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس کا حق چھینا اور اس کی مخالفت پر کمربستہ ہوئے۔ اسی پر دونو کا اتفاق و اتحاد تھا پھر ان دونو نے اس کو اپنی بیعت کی طرف بلایا تو اس نے گریز کیا اور اپنے اختلافی موقف پر قائم رہا پھر انہوں نے اس کو سخت پریشان کیا اور

وَ اَقَامَا لَا یُشْرِکَانِہٖ فِیْ اَمْرِھِمَا
وَلَا یُطْلِعَانِہٖ عَلٰی سِرِّھِمَا حَتّٰی
قَبَضَھُمَا اللّٰہُ ...... فَاِنْ یَکُ مَا نَحْنُ
فِیْہِ صَوَابًا فَاَبُوْکَ اسْتَبَدَّ بِہٖ وَ
نَحْنُ شُرَکَاءُہٗ وَلَوْ لَا مَا فَعَلَ اَبُوْکَ
مِنْ قَبْلُ مَا خَالَفْنَا ابْنَ اَبِیْطَالِبٍ
وَلَسَلَّمْنَا لَہٗ وَلٰکِنَّا رَاَیْنَا اَبَاکَ فَعَلَ
ذَالِکَ بِہٖ مِنْ قَبْلِنَا فَاَخَذْنَا بِمِثْلِہٖ
فَعِبْ اَبَاکَ بِمَا بَدَالَکَ اَوْ دَعْ ذَالِکَ

مروج الذہب مسعودی جلد ۲ صہ ۳۱۶

اس کے متعلق ایک گھناؤنے اقدام کا ارادہ کیا تو اُس نے (بقول مودودی برضا و رغبت) ان کی بیعت کر لی اور ان سے مصالحت کر لی تاہم وہ اس کو اپنے کسی معاملہ میں شریک نہ کرتے تھے اور نہ اپنے رازوں کی اس کو اطلاع دیتے تھے یہاں تک کہ دونو کو اللہ نے سنبھال لیا ...... پس ہم اب جس موقف پر قائم ہیں درست ہے یا غلط تیرا باپ ہی اس کا موجد ہے اور ہم اس کے شرکا کار ہیں اگر اس سے پیشتر تیرے باپ نے یہ قدم نہ اٹھایا ہوتا تو ہم قطعاً علی بن ابیطالب کی مخالفت نہ کرتے بلکہ اس کے سامنے سر تسلیم خم کر لیتے لیکن ہم نے دیکھا کہ تیرا باپ ہم سے پہلے یہ کام کر چکا ہے (تو ہمارے بھی حوصلے بڑھے) اور ہم اس کے نقش قدم پر چل پڑے اب جو تمہارا جی چاہے بُرا بھلا (اپنے باپ (ابوبکر) کو کہو ورنہ خاموش رہو۔

معاویہ کے اس خط سے انکشاف ہوتا ہے کہ ایک نہایت گہری سازش کے ماتحت حضرت علیؑ کو منصب خلافت سے پیچھے ہٹایا گیا پس انتخابی ڈھونگ بھی اسی سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت تھا جبھی تو تاکید پیغمبر کے باوجود اُسامہ کے لشکر میں شرکت سے پہلو تہی کی گئی۔

دعوتِ انصاف

شیعہ کش اور جمہور نواز حکومتوں کی کڑی نگرانی میں مرتب ہونیوالی اسلامی تاریخ کے وسیع و عریض سمندر کی اتھاہ گہرائیوں سے بھی ڈھونڈنے والوں کو حقیقت و واقعیت کے تاریخی انمول موتی مل جاتے ہیں جو باطل کی ملمع سازی کو طشت از بام کرنے میں کافی معاون ثابت ہوتے ہیں پس شیعہ کا جمہوری خلافت کے متعلق انقلابی نظریہ ان کے بے بنیاد جذبات کی پیداوار نہیں بلکہ نبی کریمؐ کی صحبت سے مہرہ یاب ہونیوالے متذکرہ بالا اصحابہ کو اس میں اولیت حاصل ہے اور تجربہ شاہد ہے کہ کرسٹی اقتدار کی تائید کرنے والوں کی ہر دور میں بہتات ہوتی ہے اور اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ کا مقولہ سو فیصد نہیں تو پچانوے فیصد یقیناً صحیح ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی دستور عام ہے کہ دھاندلی کرنے والے کسی بھی دور میں اپنی دھاندلی کو دھاندلی نہیں کہا کرتے بلکہ اپنی منشاء کے مطابق اس کی ایسی تاویل کر لیا کرتے ہیں جس سے عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکی جا سکے۔

یہ یاد رہے کہ تاریخ نویسی اور احادیث کی ترتیب و تدوین اس دور میں ہوئی جب معاویہ کی قائم کردہ

سنّت کے ماتحت لوگ علانیہ حضرت علیؑ اور شیعان علی کو سب کرنا ثواب سمجھتے تھے اور انتخابی خلافت ان کے نزدیک دینی قیادت تھی۔ لہٰذا خلفاء کے خلاف زبان کشائی کو گناہ عظیم بلکہ کفر تصور کیا جاتا تھا اور نسل در نسل یہ پروپیگنڈا جاری رہا کہ نہایت مبنی بر انصاف چناؤ ہوا۔ اور تمام لوگوں نے برضا و رغبت کسی دباؤ یا لالچ کے بغیر ان کی بیعت کر لی تھی جیسا کہ مودودی صاحب نے بھی برملا کہہ دیا ہے اگر تاریخ اسلام کی تدوین و تالیف کے دور میں شیعانِ علی کی زبانیں تشدد و استبداد کے قفل سے آزاد ہوتیں تو خلافتی الیکشن کے دوران ہونیوالے واقعات کا مزید انکشاف ہوتا۔ تاہم اموی و عباسی پر آشوب دور کے مصنفین کے قلم سے متذکرہ بالا اصحاب پیغمبر کے اختلافی نظریئے کا منقول ہونا بھی حق و صداقت کا واضح معجزہ ہے جو مبیّنہ الیکشن کے پوسٹ مارٹم کے لئے کافی و وافی ہے کیونکہ دور رس نگاہیں اس کی بدولت حق و باطل کے درمیان تمیز کرنے کے لئے حقیقت کی تہ تک بآسانی پہنچ سکتی ہیں۔ بشرطیکہ تقلیدِ سلف کا جُوا گردن میں پڑا ہوا نہ ہو۔ حالانکہ متذکرہ بالا اصحابہ میں سے بعض شیعہ بعض متوسط اور بعض حضرت علیؑ کے مشہور مخالف بھی ہیں

اور اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ حضرت عمرؓ خود بھی نظریاتی طور پر منعقدہ خلافت کے جواز کے قائل نہ تھے چنانچہ انہوں نے ایک مرتبہ فرمایا کہ کَانَتْ بَیْعَۃُ اَبِیْ بَکْرٍ فَلْتَۃً وَقَی اللّٰہُ شَرَّھَا فَمَنْ عَادَ لِمِثْلِھَا فَاقْتُلُوْہ۔ کنز العمال ملا علی قاری جلد ۲ صہ ۱۳۹ یعنی حضرت ابوبکر کی بیعت غیر آئینی تھی اللہ نے اس کے انجام بد سے بچا لیا اگر اس کے بعد کوئی شخص ایسا قدم اٹھائے تو اس کو قتل کر دو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر ان کے نزدیک حضرت ابوبکر کی بیعت کا طریق کار درست ہوتا تو بعد والوں کے لئے امتناعی حکم جاری نہ فرماتے یہ الگ بات ہے کہ ان کا ذاتی عمل ان کے نظریہ سے مطابقت نہیں رکھتا۔ پس ہمارے اس بیان کے بعد ٹوہ لگانے والے افراد کے لئے حق و حقیقت پر پڑی ہوئی باطل کی تہوں کو تحقیق و تدقیق کے تیز ناخنوں سے کرید کر ہٹا لینے کے بعد حق و صداقت کا چہرہ دیکھ لینا نہایت آسان ہے اور کثرت کی ہاؤ ہو آزاد طبع محققین کو کبھی متاثر نہیں کیا کرتی۔ پس شیعان علی کا نظریہ ایک تحقیقی نظریہ ہے جس کو دھونس و دھاندلی یا طمع و لالچ سے کسی دور میں نہیں دبایا جا سکا بلکہ انہوں نے اس نظریہ کے تحفظ کے لئے ہر دور میں بھاری سے بھاری قربانیاں دینے سے بھی کبھی گریز نہیں کیا۔

پس صاف ظاہر ہے کہ ملوکیت (سیاسی حکومت) اور امامت (دینی حکومت) کے دو شعبے وفاتِ پیغمبر کے فوراً بعد سے شروع ہو گئے جب کہ حضرت رسالت مآبؐ ان ہر دو شعبوں میں اللہ کی جانب سے حاکم مطلق کی حیثیت رکھتے تھے اور حضرت علی علیہ السلام نے ابن قتیبہ دینوری کی حکایت کے مطابق اپنے دعویٰ میں ان ہر دو شعبوں میں اپنی اہلیت کا اعلان فرمایا تھا کہ دینی شعبہ کے لحاظ سے میں عالم

قرآن فقیہ اسلام اور سنتِ پیغمبر کا واقف کار ہوں اور سیاسی شعبہ کے لحاظ سے میں رعایا کا ہمدرد اور اُن کے مسائل سمجھنے سلجھانے کی اہلیت رکھنے والا اور ان کے حقوق میں عادلانہ و منصفانہ کردار ادا کرنیوالا ہوں اور حضرت علی کے جواب میں سرکاری وکیل حضرت ابوعبیدہ نے جو تقریر کی اس میں اس نے حضرت ابوبکر وعمر کی سیاسی صلاحیتوں کا ذکر ضرور کیا کہ وہ دونو بزرگوار آپ سے سن رسیدہ اور جہاں دیدہ ہیں لہذا نظامِ حکومت ان کے ہاتھ میں رہنے دیجئے اور خود دست بردار ہوجائیے اگر وقت نے مہلت دی تو اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کی بنا پر آپ ہی اس منصب کے زیادہ سزاوار ہیں۔ حضرت ابوعبیدہ نے حضرت ابوبکر کی دینی برتری کا قطعاً تذکرہ نہیں کیا صرف نظامِ حکومت میں تجربہ کار کہہ کر اس کے حق میں سفارش کر دی اور حضرت علی کی اعلیٰ قابلیت کا صاف لفظوں میں اعتراف کر کے اس بات کو واضح کر دیا کہ دینی اقتدار میں تو آپ سب سے زیادہ حقدار ہیں لہذا دینی حکومت تو آپ کی ہی ہے لیکن سیاسی حکومت اور ظاہری سلطنت فی الحال ابوبکر کے ہاتھ میں رہنے دیجئے اگر وقت نے ساتھ دیا تو اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کے پیش نظر آپ کی باری بھی آجائے گی۔

اس مختصر مگر جامع روداد کے بعد اس قدر اندازہ لگانا تو نہایت آسان ہوگیا کہ وفات پیغمبرؐ کے فوراً بعد ہی مسلمانوں میں اختلاف وانتشار کا بیج لو دیا گیا جس کے نتیجے میں مسلمان دو اہم گروپوں میں تقسیم ہوگئے ایک برسر اقتدار طبقہ اور ان کے ہمنوا وبہی خواہ اور دُوسرا وہ گروہ جنہوں نے اس انتخاب کو غیر قانونی اور غیر شرعی قرار دیا ان کے سربراہ حضرت علی علیہ السّلام تھے۔ پہلا گروہ عامۃ المسلمین کا ہے اور دوسرا گروہ شیعیان علی کا ہے چنانچہ مودودی صاحب فرماتے ہیں "حامیانِ علی کا گروہ ابتدا میں شیعانِ علی کہا جاتا تھا بعد میں اصطلاحاً انہیں صرف شیعہ کہا جانے لگا" صد ۲۱۰

نظریاتی فرق کی وجہ

پہلا گروہ (عامۃ المسلمین) برسر اقتدار جماعت کا حامی تھا بنا بریں ان کی اکثریت متوقع اور فطری ہے دوسرا گروہ (شیعان علی) جو برسر اقتدار طبقہ سے ذہنی طور سے برسرپیکار تھا ان کا قلیل ہونا بعید از قیاس نہیں۔

چونکہ قرب پیغمبرؐ کا زمانہ تھا اور لوگوں میں اسلامی و شرعی اقدار رچ چکے تھے اس لئے اگر برسر اقتدار طبقہ اپنے اقتدار کو اسلامی اقتدار نہ ثابت کرتا تو یقیناً ان کی حکومت پائیدار نہ ہو سکتی لہذا انہوں نے اپنے حاصل کردہ اقتدار کو نیابت پیغمبر خلافت رسول اور امارت مومنین (اسلامی جمہوریت) کا نام دے دیا۔ پس ان کے واعظین و مقررین و خطباء نے بڑے زور شور سے اس کا پروپیگنڈا کیا اور سرکاری جماعت کے بعض اہم ارکان نے اگرچہ غیر شعوری طور پر بعض اوقات اپنے طریق کار کو غلط کہہ دیا جیسا کہ حضرت عمر کا قول گذر چکا ہے لیکن اس کی تہ تک پہنچنے کی کسی نے جرأت نہ کی اور نیابت پیغمبر اور خلافت اسلامیہ کے لیبل سے مرعوب ہو کر عوام نے اس کے جواز و عدم جواز کی بحث کو چھیڑنا ہی پسند نہ کیا۔

برسر اقتدار جماعت نے اپنی غلطی پر گہرا پردہ ڈالنے کے لئے ایک ایسا حربہ استعمال کیا جو اچھے بھلے انسانوں کے لئے بھی حق و باطل میں امتیاز پیدا کرنے کے لئے مستقل الجھن بن کر رہ گیا اور وہ یہ کہ حضور کی طرف ایسی احادیث کی نسبت دے دی گئی جن کو عقلی طور پر کوئی ذی ہوش قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا البتہ اقتدار کی جڑیں ان سے خوب مضبوط ہوئیں۔ مثال کے طور پر چند کا تذکرہ ضروری ہے جو مشہور بین المسلمین ہیں۔

(۱) اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّہِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِھْتَدَیْتُمْ۔ میرے اصحاب آسمانی ستاروں کی طرح ہیں ان میں جس کی تم اقتدا کرو گے ہدایت پاؤ گے (اس میں نیک و بد کی کوئی تمیز نہیں ہے اور یہ چیز یقیناً خلاف عقل ہے لیکن اقتدار کے لئے بہت مفید ہے)

(۲) خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِیْ۔ الخ۔ میرا قرن سب قرنوں سے بہتر ہے۔ الخ۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اس قرن کے تمام انسان خیر ہیں اور ان کا ہر اقدام خیر ہے لیکن عوام کے ذہن نشین یہی کرا دیا گیا کہ اس قرن کے انسانوں میں سے جو انسان جو کام بھی کرے خواہ اچھا یا برا اس پر تنقید نہ کی جائے۔

(۳) حضور کی طرف ایک حدیث منسوب کر دی گئی کہ میرے صحابہ کو برا نہ کہو اور شرح عقائد میں تفتازانی نے کئی اور احادیث کا ذکر بھی کیا ہے۔

یہ اور اس قسم کی بہت سی حدیثیں بالعموم صحابہ کے حق میں پیش کی گئیں اور برسرِ اقتدار لوگوں کی شان میں بالخصوص جو احادیث منظرِ عام پر آئیں اُن کا تو کوئی حساب و شمار ہی نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عام لوگوں میں اچھے و بُرے کی تمیز تک نہ رہی اور کرسئ اقتدار کی طرف ناقدانہ انگشت نمائی ایک بہت بڑی جسارت قرار دے دی گئی اور انتقال اقتدار کی ترتیب کے لحاظ سے افضلیت کا عقیدہ جزوِ ایمان بنا لیا گیا۔ حالانکہ اس پر نہ کوئی حدیث صحیح ناطق ہے اور نہ کوئی عقلی دلیل اس کی پشت پناہی کرتی ہے۔ حضرت ابو حنیفہ کے عقیدہ کی وضاحت مودودی صاحب نے یہی کی ہے "انہوں نے اجتماعی عقیدہ یہی قرار دیا کہ فضیلت کی ترتیب وہی ہے جو خلافت کی ترتیب ہے"، صد ۲۳۲ اور اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کا اقتدار افضلیت کے تابع نہیں بلکہ ان کی افضلیت اقتدار کی تابع اور اس کی مرہونِ منت ہے یا دوسرے لفظوں میں ان کی حکومت پر فضیلت کا سایہ نہیں بلکہ ان کی فضیلت پر حکومت کا سایہ ہے۔ اور صحابہ کے متعلق عقیدۂ طحاویہ سے تفصیل یہ نقل کی ہے کہ "ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے تمام اصحاب کو محبوب رکھتے ہیں ان میں سے کسی کی محبّت میں حد سے نہیں گذرتے اور نہ کسی سے تبرّی کرتے ہیں ان سے بغض رکھنے والے اور بُرائی کے ساتھ ان کا ذکر کرنے والے کو ہم ناپسند کرتے ہیں اور ان کا ذکر بھلائی کے سوا کسی اور طرح نہیں کرتے"، صد ۲۳۳۔

ان عقائد و احادیث مذکورہ کے نتیجے میں صحابہ کو تنقید سے بالاتر کر دیا گیا۔ ان کے اقتدار کی جڑیں خوب مضبوط ہوئیں اور سیاسی برسرِ اقتدار جماعت مذہبی پیشروؤں کی حیثیت اختیار کر گئی اور ان کے نظریات و اقوال جزوِ مذہب قرار پا گئے اور صحابہ کی غلطی کو غلطی کہنا ناجائز سمجھا گیا حتّٰی کہ ایک صحابی اگر دوسرے صحابی کا قاتل ہو گیا تو قاتل و مقتول دونوں کو رضی اللہ عنہ کہہ کر عقیدہ کی لاج رکھ لی گئی۔ جنگ جمل میں ہزاروں کی تعداد میں صحابہ مارے گئے تو عقیدہ یہی رہا کہ مارے جانے والے شہید بھی رضی اللہ عنہم اور مارنے والے مجاہد بھی رضی اللہ عنہم۔ ہم کسی کو بُرا نہیں کہتے جنگ صفین میں ہزاروں کی تعداد میں مارے جانے والے بھی شہید رضی اللہ عنہم اور مارنے والے بھی رضی اللہ عنہم ہو گئے۔ جنگ صفین میں حضرت عمار بن یاسر صحابی رسولؐ کا سر کاٹ کر معاویہ کے پاس لے جایا گیا لیکن ہیں دونوں رضی اللہ عنہما صد ۱۷۔ حضرت حجر بن عدی عابد و زاہد صحابی رسول کو معاویہ نے قتل کرا دیا لیکن دونوں رضی اللہ عنہما رہے اسی طرح معاویہ اعلانیہ منبروں پر کھلے بندوں حضرت علی پر سب و لعنت کرتا اور کرواتا رہا لیکن دونوں رضی اللہ عنہما ہیں صد ۱۶۴ و صد ۱۷۴۔ جناب فاطمہ بنتِ رسولؐ کو ابوبکر نے حق نہ دیا اور وہ بقول بخاری شریف ناراض ہو کر پلٹیں حتی کہ تادمِ زیست ان سے قطع تعلقی جاری رکھی اور بقول ابن قتیبہ دینوری ہر نماز کے بعد ان پر نفرین کرتی رہیں

لیکن دونو عقیدہ کے لحاظ سے رضی اللہ عنہما ہیں۔ اسی طرح حضرت عمرو بن حمق خزاعی جو صحابی رسول تھا حضرت عثمان کے قاتلوں میں ہے اور اُس کا سر کاٹ کر دمشق میں معاویہ کے پاس بھیج دیا گیا لیکن چونکہ سب کے سب صحابی ہیں لہٰذا ان سب کے متعلق عقیدہ اچھا رکھنا ہے اور ان میں سے کسی پر ناقدانہ زبان کھولنا حرام ہے[۱] اور اسی اندھا دھند آبائی تقلید ہی کا نتیجہ ہے کہ مودودی صاحب کی محققانہ جستجو بھی اسی عقیدہ سے جا بجا مرعوب ہے چنانچہ وہ تاریخی دستاویزات میں سے صرف اسی قدر مواد کو نقل کرتے ہیں جو ان کے مقلدانہ عقیدہ سے متصادم نہ ہو اور اسی بنا پر دیدہ ودانستہ انعقادِ خلافت کی دھاندلیوں اور غیر آئینی و غیر شرعی کاروائیوں سے چشم پوشی کرتے رہے ہیں اور اسے شرعی و اسلامی جمہوریت قرار دے کر آبائی تقلید کی لاج رکھتے رہے ہیں لیکن خلفاء کی بے قاعدگیوں اور خلافِ شرع کارستانیوں کو دیکھ کر آخر ان کا پیمانہ صبر جب لبریز ہوا تو عثمان و معاویہ کی اکثر و بیشتر اغلاط پر پردہ ڈالنے کے باوجود بعض کی نشان دہی کر دی اور آبائی تقلید کو اپنی تحقیق کی شہ پر ٹھکراتے ہوئے ان کو غلط کار کہہ دیا ص۱۱۶ و ص۱۵۳ تو پورے ملک میں عامۃ المسلمین کی طرف سے "مودودی کافر ہے"، کے نعرے بلند ہوئے حتیٰ کہ شہروں میں دیواروں پر جا بجا موٹی قلم سے لکھا ہوا یہ فقرہ ہر ایک نے دیکھا حالانکہ مودودی صاحب آبائی تقلید کے پیشِ نظر اس امر میں پورے محتاط ہیں کہ معاویہ کی لاتعداد غلطیاں نقل کرنے کے باوجود اُس کے احترام سے منحرف نہیں ہیں۔

بقول مودودی صاحب معاویہ کی غلط کاریاں

آبائی تقلید کے ماتحت کافی احتیاط بلکہ جنبہ داری کو ملحوظ رکھنے کے باوجود معاویہ کی جن غلطیوں کا خلافت و ملوکیت میں ذکر ہوا ہم ان کا سرسری جائزہ لیتے ہیں اور ان غلطیوں کے باوجود عامۃ المسلمین کا ان کے متعلق نظریہ بیان کرتے ہیں۔

(۱) حضرت عثمان کی شہادت (۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ) کے بعد حضرت نعمان بن بشیر اُن کا خون سے بھرا ہوا قمیص اور ان کی اہلیہ محترمہ حضرت نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں حضرت معاویہ کے پاس دمشق لے

---

[۱] اور اسی تقلید کا نتیجہ ہے کہ دو متحارب آدمیوں یا گروہوں میں سے ایک کو برحق کہنے کے باوجود دوسرے کو ناحق کہنے سے گریز کرتے ہیں چنانچہ امام ابوحنیفہ کا عقیدہ صحابہ کی خانہ جنگی میں یہ نقل کیا ہے "چنانچہ وہ صاف طور پر یہ کہتے ہیں کہ حضرت علی کی جن لوگوں سے بھی جنگ ہوئی (اور ظاہر ہے کہ اس میں جنگ جمل و صفین کے شرکاء شامل ہیں) ان کے مقابلہ میں علی زیادہ برسرِ حق تھے لیکن وہ دوسرے فریق کو مطعون کرنے سے قطعی پرہیز کرتے ہیں" اور یہ واضح رہے کہ جنگ جمل میں حضرت علی کے مقابل شکست خوردہ فریق کی اصل قائد حضرت عائشہ تھیں ص۱۳۱ طلحہ و زبیر دونو حضرت عائشہ کے ہم رکاب تھے اور دونو جنگ جمل میں مارے گئے ص۱۳۰۔

گئے اور انہوں نے یہ چیزیں منظرِ عام پر لٹکا دیں تاکہ اہلِ شام کے جذبات بھڑک اٹھیں یہ اس بات کی کھلی علامت تھی کہ حضرت معاویہ خونِ عثمان کا بدلہ قانون کے راستہ سے نہیں بلکہ غیر قانونی طریقہ سے لینا چاہتے ہیں۔ (الخ صـ۱۳۲)

۲) گورنر ہونے کی حیثیت سے انہیں کوئی حق نہ تھا کہ جس خلیفہ کے ہاتھ پر باقاعدہ آئینی طریقے سے بیعت ہو چکی تھی جس کی خلافت کو ان کے زیرِ انتظام صوبے کے سوا باقی پوری مملکت تسلیم کر چکی تھی اس کی اطاعت سے انکار کر دیتے صـ۱۲۶

۳) حضرت عمار بن یاسرؓ جو حضرت علی کی فوج میں شامل تھے حضرت معاویہ کی فوج سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے حضرت عمارؓ کے متعلق نبیؐ کا یہ ارشاد صحابہ میں مشہور و معروف تھا اور بہت سے صحابیوں نے اس کو حضورؐ کی زبان مبارک سے سنا تھا کہ تَقْتُلُكَ الْفِئَةُ الْبَاغِيَة (تم کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا صـ۱۳۶ متعدد صحابہ و تابعین جو حضرت علی اور حضرت معاویہ کی جنگ میں مذبذب تھے حضرت عمار کی شہادت کو یہ معلوم کرنے کے لئے ایک علامت قرار دے لیا تھا کہ حق پر کون ہے اور باطل پر کون؟ صـ۱۳۷ قتل عمار کے بعد یہ بات ظاہر ہو گئی کہ حق حضرت علی کے ساتھ تھا اور اہل سنت اس بات پر متفق ہو گئے صـ۱۳۸ اس سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ حضرت علی حق پر ہیں اور حضرت معاویہ باغی ہیں صـ۱۳۸ (البدایہ)

۴) جنگ صفین میں معاویہ کی فوج کا حضرت علی کو دھوکہ دینے کے لئے قرآن کو نیزوں پر چڑھانے کے متعلق کہتے ہیں "یہ ایک ان کی جنگی چال تھی قرآن کو حکم بنانا سرے سے مقصود ہی نہ تھا" صـ۱۳۹ جن لوگوں نے اس غلطی کو خطا اجتہادی قرار دیا ان کی تردید میں لکھتے ہیں "بلاشبہ ہمارے لئے رسول اللہ کے تمام صحابہ واجب الاحترام ہیں اور بڑا ظلم کرتا ہے وہ شخص جو اُن کی کسی غلطی کی وجہ سے ان کی ساری خدمات پر پانی پھیر دیتا ہے اور ان کے مرتبے کو بھول کر گالیاں دینے پر اُتر آتا ہے مگر یہ بھی کچھ کم زیادتی نہیں ہے کہ اگر ان میں سے کسی نے کوئی غلط کام کیا ہو تو ہم محض صحابیت کی رعایت سے اس کو "اجتہاد" قرار دینے کی کوشش کریں" آگے چل کر رقمطراز ہیں "لیکن جان بوجھ کر ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق غلط کام کرنے کا نام اجتہاد ہرگز نہیں ہو سکتا" پھر فرماتے ہیں "کوئی غلط کام محض شرفِ صحابیت کی وجہ سے مشرف نہیں ہو جاتا بلکہ صحابی کے مرتبہ بلند کی وجہ سے وہ غلطی اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے" صـ۱۴۳

۵) امعاویہ نے اپنے بیٹے یزید کی ولی عہدی کے لئے خوف و طمع کے ذرائع سے بیعت لی صـ۱۴۸

یزید کی ولی عہدی کے لئے ابتدائی تحریک کسی صحیح جذبے کی بنیاد پر نہیں ہوئی تھی بلکہ ایک بزرگ (مغیرہ بن شعبہ) نے اپنے ذاتی مفاد کے لئے دوسرے بزرگ (معاویہ) کے ذاتی مفاد سے اپیل کر کے اس تجویز کو جنم دیا صفحہ ۱۵۰۔ اسی ضمن میں آگے چل کر لکھتے ہیں "حضرت معاویہ کے محامد و مناقب اپنی جگہ پر ہیں ان کا شرفِ صحابیت بھی واجب الاحترام ہے۔ ان کی یہ خدمت بھی ناقابلِ انکار ہے کہ انہوں نے پھر سے دنیائے اسلام کو ایک جھنڈے تلے جمع کیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُن پر جو شخص لعن طعن کرتا ہے وہ بلاشبہ زیادتی کرتا ہے لیکن ان کے غلط کام کو تو غلط کہنا ہی ہوگا۔ صفحہ ۱۵۳

(۶) وہ خود اپنے زور سے خلیفہ بنے اور جب وہ خلیفہ بن گئے تو لوگوں کے لئے بیعت کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا" اس کے بعد لکھتے ہیں "جس کا مطلب یہ ہے کہ امام حسن کی دست برداری کے بعد خونریزی اور بدنظمی کے خوف سے تمام صحابہ و تابعین و صلحائے اُمت نے ان کی بیعت پر اتفاق کیا اور اس کو "عام الجماعت" اس بنا پر قرار دیا کہ کم از کم باہمی خانہ جنگی تو ختم ہوئی" صفحہ ۱۵۸۔

نوٹ۔ محقق دوران کے اس تہافت کو دیکھئے کہ زور سے اس کا خلیفہ بن جانا اس کی غلطی شمار کی ہے اور چونکہ اس کی اس غلطی کے نتیجے میں لوگ ڈر کے مارے اس کی بیعت کر کے ایک جھنڈے تلے جمع ہو گئے بنا بریں اسی غلطی کو صفحہ ۱۵۳ پر اس کی اسلامی خدمت قرار دیا ہے۔

(۷) زاہد و متقی و صالح اُمت اور صحابی رسول حضرت حجر بن عدی کا قتل اور دیگر ان لوگوں کا قتل جو علی سے برأت کا اظہار نہ کرتے تھے صفحہ ۱۶۵۔

حسن بصری فرماتے ہیں حضرت معاویہ کے چار افعال ایسے ہیں کہ اگر کوئی شخص ان میں سے کسی ایک کا ارتکاب بھی کرے تو وہ اس کے حق میں مہلک ہو (موجب جہنم ہو) ایک ان کا اس اُمت پر تلوار سونت لینا اور مشورے کے بغیر حکومت پر قبضہ کر لینا درانحالیکہ امت میں بقایائے صحابہ موجود تھے دوسرے ان کا اپنے بیٹے کو جانشین بنانا حالانکہ وہ شرابی اور نشہ باز تھا۔ ریشم پہنتا اور طنبورے بجاتا تھا۔ تیسرے ان کا زیاد کو اپنے خاندان میں شامل کرنا۔ چوتھے ان کا حجر اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر دینا صفحہ ۱۶۶۔

(۸) ایک اور نہایت مکروہ بدعت حضرت معاویہ کے عہد میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود اور ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر خطبوں میں برسر منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے حتیٰ کہ مسجد نبوی میں منبر رسول پر عین روضۂ نبوی کے سامنے حضور کے محبوب ترین عزیز (علیؑ) کو گالیاں دی جاتی تھیں اور حضرت علی کی اولاد اور ان کے قریب ترین رشتہ دار

اپنے کانوں سے یہ گالیاں سنتے تھے۔ حد[۱۷۴]۔

(۹) مالِ غنیمت کی تقسیم کے معاملہ میں بھی حضرت معاویہ نے کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے صریح احکام کی خلاف ورزی کی حد[۱۷۴]۔

(۱۰) زیاد بن سمیہ کا استلحاق بھی حضرت معاویہ کے ان افعال میں سے ہے جن میں انہوں نے سیاسی اغراض کے لئے شریعت کے ایک مسلم قاعدے کی خلاف ورزی کی تھی... حضرت معاویہ کے والد جناب ابوسفیان نے اس لونڈی (سمیہ نامی) سے زنا کا ارتکاب کیا تھا اور اسی زیاد سے وہ حاملہ ہوئی.... زیاد انہی کے نطفہ سے ہے... حضرت معاویہ نے اس کو اپنا حامی و مددگار بنانے کے لئے اپنے والد ماجد کی زناکاری پر شہادتیں لیں اور اس کا ثبوت بہم پہنچایا کہ زیاد انہی کا ولد الحرام ہے پھر اسی بنیاد پر اسے اپنا بھائی اور اپنے خاندان کا فرد قرار دے دیا۔ حد[۱۷۵]

(۱۱) حضرت معاویہ نے اپنے گورنروں کو قانون سے بالاتر قرار دے دیا۔ حد[۱۷۵]

(۱۲) معاویہ کے ایک گورنر نے ہمدان کو فتح کر کے (جو علی کے قبضہ میں تھا) وہاں کی مسلمان عورتوں کو لونڈیاں بنا لیا حالانکہ شریعت میں اس کا کوئی جواز نہ تھا حد[۱۷۶] و حد[۱۷۷]

(۱۳) صحابی رسول عمار بن یاسرؓ اور عمرو بن حمق خزاعی صحابی کے سر کاٹ کر معاویہ کی طرف بھیجے گئے۔ حد[۱۷۷]

(۱۴) حضرت معاویہ کے عہد میں سیاست کو دین پر بالا رکھنے اور سیاسی اغراض کے لئے شریعت کی حدیں توڑنے کی ابتدا ہوئی حد[۱۷۹]

(۱۵) حضرت معاویہ کا جب مصر پر قبضہ ہوا تو انہیں (محمد بن ابی بکر کو) گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا اور پھر ان کی لاش ایک مردہ گدھے کی کھال میں رکھ کر جلائی گئی۔ حد[۱۷۸]

دعوتِ فکر

قارئین کرام اپنے قلب و جگر پر ہاتھ رکھ کر ان غلطیوں کو پڑھیں اور مودودی صاحب کی اس دریادلی کی بھی داد دیں کہ باوجود ان سنگین جرائم کے اس کے محامد و مناقب کے قائل بھی ہیں اور شرفِ صحابیت کی بنا پر اُسے واجب الاحترام بھی قرار دیتے ہیں اور یہ اصرار بھی ساتھ ہے کہ اس کے غلط کام کو بہر حال غلط کہنا ہو گا۔ حد[۱۵۳]

اندازہ کیجئے ایک شخص اپنی ہوس پرستی و جاہ طلبی کی خاطر اسلامی حکومت کا حلیہ بدلتا ہے۔ اور ہمیشہ کے لئے اُمتِ اسلامیہ کو ملوکیت کی الجھنوں میں ڈالنے کا مرتکب ہے۔ آئینی اسلامی خلیفہ کا منکر ہے اور حضرت عمار بن یاسر اور حجر بن عدی ایسے متقی صحابہ کا عمداً قاتل ہے اور بایں ہمہ وہ واجب الاحترام صحابی ہے اور اپنی عمدی خطا سے جنگ صفین کے موقعہ پر ہزاروں مسلمانوں کے قتل کا موجب ہے جن میں

اکابر صحابہ بھی تھے اور بقول مودودی صاحب یہ غلطی خطا اجتہادی نہیں بلکہ عمدی غلطی ہے لیکن پھر بھی وہ واجب الاحترام ہے۔ درحقیقت یہ سب کچھ اسی آبائی اندھی تقلید کی کرم فرمائی ہے کہ تحقیق کے ناخن اس کے وحشیانہ ضمیر اور منافقانہ خمیر پر پڑے ہوئے صحابیت کے وقار کی خوشنما چادر کو تار تار کرنے کے لئے آمادہ ہوتے ہیں لیکن آبائی تقلید فوراً تحقیقی فیصلہ پر تغافل عالمانہ اور تجاہل عارفانہ کی گرد ڈال کر اسے محفوظ کر لیتی ہے۔ دیکھئے ابلیس نے ہزاروں برس عبادت کی لیکن نافرمانی کے بعد یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی غلطی بہرحال غلطی ہے لیکن اس کے تقدس و عبادت کا احترام باقی رہنا چاہیے کیونکہ فرشتوں کا صحابی بن کر بلکہ بقول مشہور معلم الملائکہ ہو کر کافی عرصہ تک تسبیح و تقدیس اور تکبیر و تہلیل میں رطب اللسان رہا۔ مودودی صاحب حجاج بن یوسف کے متعلق لکھتے ہیں۔ "قرآن پر اعراب لگوانا اس کی وہ نیکی ہے جس کی تعریف رہتی دنیا تک کی جائے گی۔ مگر کسی کی ساری نیکیاں بھی ایک مومن کے قتل ناحق کی ہموزن نہیں ہو سکتیں" صفحہ ۱۸۵۔ نہ معلوم ہزارہا مومنوں کے قتل کے باوجود معاویہ کے محامد و مناقب میں کیوں کمی نہ ہوئی کہ مودودی صاحب اس کو پھر بھی واجب الاحترام سمجھنے پر مصر ہیں حالانکہ جنگ صفین کے معاملہ میں اس کی غلطی کو خطائے اجتہادی کہنے کو بھی تیار نہیں اور اس کو عمدی غلطی کہنے کی جسارت کرتے ہیں اور اس نظریہ میں تمام معاصر اہل سنت علما کی تکفیر کی بھی پرواہ نہیں کرتے پس مجبوراً ماننا پڑتا ہے کہ یہ آفت آبائی کورانہ تقلید کا ہی نتیجہ ہے علاوہ ازیں حسن بصری کے قول کے مطابق اس سے مہلک غلطیوں کا سرزد ہونا یزید کو ولی عہد بنانا۔ علی پر سب و شتم کرنا اور سنت رسول کی خلاف ورزی کرنا سب کچھ تسلیم ہے لیکن احترام پھر بھی بحال ہے۔ ذرا اور آگے چلئے حیا کا جنازہ نکال دیا اور غیرت کا ستیاناس کر دیا جب کہ اس نے اپنے والد کی زناکاری پر مجمع عام میں گواہ طلب کر کے زیاد کو اپنا ولد الحرام بھائی ثابت کر دیا میرے خیال میں بڑا ظالم ہے وہ شخص جو اس قدر محققانہ بحث و تمحیص میں پڑنے کے بعد بھی اسلام کش ایمان فروش اور دین دشمن انسان کو واجب الاحترام سمجھنے پر مصر ہو۔ خود مودودی صاحب کا اعتراف ہے کہ شرف صحابیت کی وجہ سے کوئی غلط کام مشرف نہیں ہو جاتا بلکہ صحابی کے مرتبۂ بلند کی وجہ سے وہ غلطی اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے صفحہ ۱۴۳ اگر تحقیق و انصاف کا تقاضا یہی ہے تو جس طرح حجاج بن یوسف کی تمام نیکیاں ایک قتل ناحق کے برابر نہیں حالانکہ وہ صحابی بھی نہیں ہے تو صحابی ہونے کے بعد معاویہ کی نیکیاں ہزارہا صحابیوں کے قتل کے برابر کس طرح ہوں گی؟ اللہ کا تو صاف فرمان ہے مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ۔ جو مومن کو عمداً قتل کرے اس کی جزا جہنم ہے۔ اور سنت کو مٹانے اور بدعات کو جاری کرنے والے صحابہ کے متعلق جناب رسالت مآبؐ کا فرمان ملاحظہ فرمائیے صرف دو حدیثوں کا ترجمہ ذکر کرتا ہوں۔

۱۔ صحیح بخاری ترجمہ مرزا حیرت دہلوی حدیث ۱۶۲۸ ابن عباس سے اسی حدیث کے ذیل میں ہے
ہے کہ آپ نے فرمایا سب سے پہلے ابراہیم کو کپڑے پہنائے جائیں گے اور ہوشیار ہو کہ چند آدمی میری
اُمت کے لائے جائیں گے اور فرشتے ان کو دوزخ کی طرف لے جائیں گے اس وقت میں کہوں گا اے رب
یہ تو میرے صحابی ہیں (اللہ کی جانب سے) ندا آئے گی تو نہیں جانتا انہوں نے تیرے بعد کیا کیا؟ یہاں تک
کہ فرمایا پھر اللہ کی طرف سے ندا آئے گی کہ یہ لوگ تیرے (محمدؐ کے) جدا ہونے کے بعد ہی مرتد ہو گئے تھے۔

۲۔ ترجمہ بخاری مرزا حیرت دہلوی ج ۳ حدیث ۱۹۳۲ عبداللہ (ابن مسعود) سے روایت ہے کہ حضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں حوض کوثر پر تمہارا پیش خیمہ ہوں گا اور تم میں سے چند لوگ میرے سامنے لائے
جائیں گے یہاں تک کہ جب میں ان کو (کوثر کا پیالہ) دینا چاہوں گا تو وہ لوگ میرے پاس سے کھینچ لئے
جائیں گے۔ میں عرض کروں گا اے میرے پروردگار! یہ لوگ تو میرے اصحاب ہیں۔ خدا تعالیٰ فرمائے گا
تم نہیں جانتے کہ انہوں نے تمہارے بعد کیا کیا بدعتیں کی ہیں؟

۱۔ قاتل مومن ہونے کے بعد کسی شخص کا خدا کے نزدیک کوئی احترام نہیں بلکہ وہ پکا دوزخی ہے (قرآن)
۲۔ جہنمی ہونے کی صورت میں اللہ کے نزدیک صحابیت کا کوئی احترام نہیں اور قاتل مومن جہنمی ہے (بخاری)
۳۔ بدعتی ہونے کے بعد وہ کوثر کا مستحق نہیں خواہ صحابی رسول ہی کیوں نہ ہو۔ (بخاری شریف)

اور بقول مودودی صاحب حضرت معاویہ ایک دو نہیں بلکہ ہزار ہا کا جن میں کافی تعداد صحابہ
مومنین کی بھی ہے قاتل ہے اور بدعات کے جاری کرنے کا مرتکب بھی ہے پس آیت و حدیث کی رو سے
جب اس کی صحابیت کا احترام نہ رہا تو مودودی صاحب نہ معلوم آبائی تقلید سے کیوں اس قدر مرعوب
ہیں کہ دلیل و برہان سے حاصل شدہ نتائج کو چھوڑ کر ایک ہی رٹ لگائے جا رہے ہیں کہ ہم ان کو غلط کار کہیں گے
لیکن ان کے محامد و مناقب اور صحابیت کے پیش نظر ان کو واجب الاحترام بھی مانیں گے۔

نیز یزید بن معاویہ کی متعلق شرابی و نشہ باز ہونا اور ناجائز تخت حکومت پر قابض ہو کر شرعی تقاضوں کو اس
کا پائمال کرنا مودودی صاحب کے نزدیک مسلّم ہے صفحہ ۱۶۶ و صفحہ ۱۷۹ نیز قتل حسین میں وہ سخت مجرم ہے "ساری
کاروائی جو میدانِ کربلا سے لے کر کوفے اور دمشق کے درباروں تک کی گئی اس کا ایک ایک جزو قطعاً حرام
اور سخت ظلم تھا، جو لوگ ابن زیاد کو اس کا ملزم قرار دے کر یزید کو بری ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں
اُن کے جواب میں مودودی صاحب لکھتے ہیں "یہ سوال لازماً پیدا ہوتا ہے کہ اس ظلم عظیم پر اس نے اپنے اس
سر پھرے گورنر کو کیا سزا دی صفحہ ۱۸۰ حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ اس نے ابن زیاد کو نہ کوئی سزا دی نہ اسے معزول کیا
نہ اسے ملامت ہی کا کوئی خط لکھا" اس کے بعد مدینہ نبوی کی توہین یزید کی ایسی سیاہ کاری ہے جس کو اسلام

کبھی معاف نہیں کر سکتا" تین دنوں میں شہر کے اندر ہر طرف لوٹ مار کی گئی شہر کے باشندوں کا قتلِ عام کیا گیا جس میں امام زہری کی روایت کے مطابق سات سو معززین اور دس ہزار کے قریب عوام مارے گئے اور غضب یہ کہ وحشی فوجیوں نے گھروں میں گھس گھس کر بے دریغ عورتوں کی عصمت دری کی حافظ ابن کثیر کہتا ہے (ترجمہ عربی) (کہا جاتا ہے کہ ان دنوں میں ایک ہزار عورتیں زنا سے حاملہ ہوئیں صد[۱۸۲] اسی بنا پر امام احمد بن حنبل کے نزدیک یزید پر لعنت کرنا جائز ہے صد[۱۸۳] (علامہ تفتازانی (اہل سنّت کے مشہور عالم) اپنی کتاب شرح عقائد النسفیہ مطبوعہ دہلی صد[۱۱۷] پر فرماتے ہیں "حق یہ ہے کہ یزید کا قتل حسینؑ پر راضی اور خوش ہونا اور اہل بیت نبی کی توہین کرنا معنوی تواتر رکھتا ہے اگرچہ اس کی نقل بذریعہ احاد کے ہے۔ پس ہم اس کی شان و ایمان کے متعلق کوئی شک نہیں رکھتے کہ اس پر اور اس کے مددگاروں اور ساتھیوں پر اللہ کی لعنت ہے اور معاویہ کے متعلق لکھا ہے کہ گذشتہ بزرگوں نے چونکہ معاویہ پر لعنت کرنا جائز نہیں کیا اس لئے ہم بھی جائز نہیں کہتے یہ ہے کورانہ تقلید۔ العیاذ باللہ حالانکہ معاویہ کے اپنے ناقابلِ عفو جرائم کے علاوہ یزید کی سب برائیوں کا سرچشمہ بھی وہی خود ہے لیکن برسرِ اقتدار جماعت نے جو صحابہ کے محامد و مناقب کی فرضی احادیث اپنے اقتدار کی پائیداری کی خاطر نشر کی تھیں (جو منطوق و مفہوم قرآن کے بھی مخالف ہیں اور عقلاً ان کا پیغمبر کی زبان سے صادر ہونا بھی ناممکن ہے) اُن کی رو سے ان تمام لرزہ خیز اسلام کش بلکہ انسانیت سوز مظالم کو اسلام میں برداشت کرنے کا جواز پیدا کیا جاتا ہے اور ہر دور کے محقق بھی کورانہ تقلید سے متاثر ہو کر آنکھیں بند کر کے سلف کی ہاں میں ہاں ملا کر اپنی تحقیق کے منہ پر پتھر باندھ لینے کی جسارت کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرتے اور یزید کے متعلق مودودی صاحب آخری نظریہ یہی پیش کرتے ہیں۔ "ہمیں ایسے لوگوں کے غلط کاموں کو غلط کہنے پر اکتفا کرنا چاہیے اور لعنت سے پرہیز کرنا اولیٰ ہے" صد[۱۸۴]

بریں عقل و دانش بباید گریست

یہ مسلک ہے جمہور مسلمین اور اسلامی سوادِ اعظم کا جو حضرت پیغمبرؐ کے بعد برسرِ اقتدار جماعت کے حامی و محافظ و مبلغ و پیرو رہے اور ان کا اقتدار ابتدا سے ہی بادشاہت و ملوکیت کے رنگ میں ظاہر ہوا جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں البتہ اس کی ابتداء اور انتہا میں فرق ہے کہ ابتدا" قرب زمانہ پیغمبرؐ کی وجہ سے لوگ اسلامی تمدن کے دلدادہ اور اس سے بہت متاثر تھے حتیٰ کہ حکمران طبقہ بھی لہذا آئین اسلام کی کافی حد تک پاسداری کی جاتی رہی اور رفتہ رفتہ زمانے کے مرور کے ساتھ نقوش اسلامی کہنہ ہوتے اور مٹتے گئے اور ملوکیت اپنے اصلی خدوخال میں نمایاں ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ افسوسناک نتائج تک جا پہنچی اور مودودی صاحب نے اس کو ابتداءً تو خلافت کا نام دیا لیکن جب سر سے پانی اونچا ہونا شروع

ہوا تو اس کو ملوکیت کا نام دے دیا اور حکمرانوں کے ہر قسم کے مظالم کو ہر دو صورتوں میں اسلام کے وسیع و عریض دامن میں چھپا کر بیٹھ گئے۔ حالانکہ اقتدار وفات پیغمبر کے بعد ہی سے دو شعبوں میں بٹ گیا ایک ملوکیت (بادشاہت) اور اس کی سربراہی حضرت ابوبکر کو حاصل ہوئی اور سیاسی طریقہ کار سے ان کا سلسلہ بعد میں چلتا رہا اور دوسری خلافت (امامت) اس کی سربراہی کا شرف بلافصل حضرت علی کو حاصل ہوا اور انہی کو خم غدیر کے موقعہ پر حضور نے نامزد فرمایا تھا ان کے بعد یکے بعد دیگرے بارہ امام ہوئے ملوکیت کو کچھ دنوں تک خلافت کا لباس پہنایا جاتا رہا لیکن اپنے کرتوتوں کی وجہ سے کچھ عرصہ کے بعد وہ عریاں ہو گئی

شیعہ مسلک

اس ساری تفصیل کے بعد شیعہ مسلک کی توضیح کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ چونکہ جناب رسالت مآب دنیاوی قائد اور دینی پیشرو بھی تھے لہٰذا وہ نبی صاحب شریعت اور سلطانِ وقت صاحب اقتدار بیک وقت تھے لہٰذا ان کے بعد ان کی جانشینی کا صحیح حقدار وہی ہے جو ان دونوں مرحلوں میں ان کی نیابت کے تمام فرائض ادا کر سکنے کا اہل ہو اور ان تمام ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ حضرت علی علیہ السّلام نے ابن قتیبہ دینوری کی نقل کے مطابق ہر دو[٢] مرحلوں میں اپنے احق ہونے کا دعویٰ کیا جیسا کہ سابق میں بیان ہو چکا ہے اور حکمران پارٹی کے وکیل ابو عبیدہ جراح نے حضرت علی کی تردید نہ کی بلکہ ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے ابوبکر کی تجربہ کاری کہن سالی اور بزرگی کا واسطہ دے کر حضرت علی سے دست برداری کی درخواست کی جس کو حضرت علی نے قبول نہ کیا اور اپنے مطالبہ پر ڈٹے رہے لیکن اقتدارِ حکومت کے سامنے خاموش رہے۔ اور حضرت علی کی خاموشی بعینہٖ اسی طرح تھی جس طرح مودودی صاحب نے لکھا ہے۔ "دوسرا ملوکیت کا طریقہ اگر جائز ہے تو قابلِ برداشت ہونے کی حیثیت سے ہے نہ کہ پسندیدہ اور مطلوب ہونے کی حیثیت سے" ص ١٦٠

مذہب شیعہ کی انفرادی حیثیت کی ابتدا اسی دن سے ہوئی جس دن سے حضرت علی نے اقتدار کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے انکار کیا تھا اور ان کی حکومت کی شرعی حیثیت کو چیلنج کیا تھا اور ہر حیثیت سے اپنے استحقاق پر ناقابلِ تردید دلائل پیش کئے تھے یہ الگ بات ہے کہ حکومتِ وقت نے دلائل کا جواب نہ دے سکنے کے باوجود اپنی روش کو بدلنے کی جرات نہ کی۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں "حامیانِ علی کا گروہ ابتدا میں شیعانِ علی کہا جاتا تھا بعد میں اصطلاحاً انہیں صرف شیعہ کہا جانے لگا" ص ٢١١

حضرت علی اور شیعانِ علی ابتدا سے ہی حکومتِ وقت سے رواداری اور ملک و ملت کی فلاح و بقا کے لئے ان سے بھرپور تعاون ان کا شیوہ تھا اور کسی بھی ملک میں بسنے والے شیعہ ملک کے بقا و استحکام

اور فلاح وارتقاء میں حکومتِ وقت کے ساتھ بھرپور تعاون کرتے ہوئے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں کبھی بخل نہیں کیا کرتے جس طرح کہ حضرت علی اور ان کی جماعت نے اپنے دَور کے سلاطین (خلفائے ثلثہ) کے ساتھ اس کی بلند مثال پیش فرمائی۔ جس سے بعض کم سمجھ لوگوں نے یہ نظریہ قائم کرلیا کہ آپ نے خلفا کی بیعت کی تھی۔ بے شک آپ نے ان کے ساتھ رواداری اور حسنِ سلوک میں مثالی کردار ادا کیا جو آپ کے شایانِ شان تھا اور نہایت بلند نظری اور اعلیٰ حوصلگی سے ملک و ملت کی فلاح وبہبود کے لئے وقتاً فوقتاً اپنے زریں مشوروں سے بھی بخل نہ فرمایا اور مشکلات علمیہ اور معضلاتِ فقہیہ میں آپ کا حلالِ مشکلات ہونا تو اظہر من الشمس ہے حتیٰ کہ شہنشاہِ وقت (خلیفہ دوم) حضرت عمر نے بھی اس کا اعتراف کیا چنانچہ (لَوْلَا عَلِیٌّ لَهَلَكَ عُمَر) (اگر علی نہ ہوتا تو عمر ہلاک ہوجاتا) علامہ سبط بن جوزی نے امام احمد حنبل سے نقل کیا اور کتب نحویہ میں نحویوں کو لَوْلَا کے استعمال کے لئے اس کے علاوہ اور مثال ہی اچھی نہیں لگتی گویا یہ فقرہ ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرچکا ہے بہرحال مقامِ علم میں قیادت اور مسائلِ دینیہ ومطالبِ فقہیہ میں رہنمائی آپ ہی کا حصّہ تھا اور اس بارے میں آپ مقامِ نبوّت کے صحیح جانشین تھے اور مسلمانانِ عالم کے لئے اسلامیات میں مرکزی حیثیت آپ ہی کو حاصل رہی اور تمام صحابہ علمی خیرات حاصل کرنے میں ان کے دستِ نگر رہے۔

شیعانِ علی حکومتِ وقت کے ماتحت پُرامن شہریوں کی حیثیت سے خاموش زندگی بسر کرتے رہے یہاں تک کہ وفاتِ عثمان کے بعد حضرت علی کی ظاہری حکومت کا دَور آیا تو آپ کو اگرچہ پُرامن خدمتِ دین ومذہب کا موقعہ نہ دیا گیا اور آپ کا پُورا پنجسالہ دَور جمل صفین ونہروان کی جنگوں کی نذر ہوگیا تاہم جب کبھی موقعہ ملا آپ نے سابق حکومتوں اور اپنی حکومت کے نظریۂ حیات میں واضح فرق بیان کیا اور نہج البلاغہ کے خطبۂ شقشقیہ میں سابق حکومتوں کی شرعی اور جمہوری حیثیت پر سخت تنقید کی لیکن باوجود اس کے اپنے دَورِ اقتدار میں کبھی اپنی مذہبی انفرادیت کو بزورِ حکومت منوانے کی کوشش نہ فرمائی۔ البتہ ادلّہ وبراہین کے سایہ میں ملّت کی ان خصوصیات کو جو جزءِ مذہب اصولاً یا فروعاً ہیں بیان کرنے سے دریغ نہ فرمایا اور جو چیزیں سابق حکومتوں کے دَورِ اقتدار میں غلط طور پر رائج ہوگئی تھیں ان کی بھی نشاندہی کی۔ معاویہ کے حکم سے اموی منبروں پر اگرچہ برملا آپ پر سب وشتم کا دروازہ کھل چکا تھا لیکن آپ نے کبھی جوابی کاروائی کی طرف قدم نہ اٹھایا اور نہ اٹھانے دیا۔ اور ایک دفعہ کسی کی بدکلامی سن کر جب بعض آپ کے ہمنشینوں کے جذبات میں جوش پیدا ہوا تو ان کے چہروں کی کیفیات کو بھانپ کر ان کی زبان کھلنے سے پہلے ارشاد فرمایا۔ برتن سے وہی چیز نکلتی ہے جو اس

کے اندر ہوتی ہے۔ اُس کے اندر جو کچھ تھا وہ برآمد ہوا۔ اور تمہارے اندر جو کچھ ہے اُسے برآمد ہونا چاہیئے وہ جاہل تھا اور اس کی زبان جہالت کی ترجمان تھی تم اگر عارف ہو تو تمہاری زبان علم و عرفان کی ترجمان ہونی چاہیے کیونکہ وہ معاویہ کا مصاحب ہے اور تم علی کے شاگرد ہو۔ (دمعہ ساکبہ) مروج الذہب ج۲ صہ ۳۰۴

شیعانِ علیؑ پر نازک دور

خلافت ثلثہ کا دور شیعان علی کا خاموشی کا دور تھا چونکہ حضرت علی گوشہ عزلت میں زندگی گذار رہے تھے پس شیعان علی بھی اُن کی تاسی میں خاموش رہے نہ حکومت وقت سے ان کو ملازمتوں اور عہدوں کی توقع تھی اور نہ یہ لوگ مناصب کے خواہش مند ہوئے جب کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کے آقا و مولا حضرت علی علیہ السّلام باوجودیکہ اعلیٰ جنگی صلاحیتیں نظامی حوصلے اور سفارتی تجربے رکھتے ہیں اور سب مسلمان معرکہ ہائے احد، بدر، خندق و خیبر میں ان کی نبرد آزمائیوں سے واقف ہیں اور رسالتمآب ص کا ان پر اعتماد کلی ہونا بھی کسی سے پوشیدہ نہیں لیکن حکومت وقت مخصوص مصالح کی بنا پر ان کی استعداد قابلیت ذاتی اور اوصافِ خلقیہ و خُلقیہ کو بروئے کار لانے کے بجائے ان کے نام و نمود کو پردۂ خفا میں رکھنا چاہتی ہے (یہ اور بات ہے کہ ان کا علمی وقار ہر نازک و مشکل مرحلہ میں ان پر چھایا رہا۔

بہر حال حضرت علی کے دورِ اقتدار میں اگرچہ ذہنی الجھنوں میں عامۃ الناس گرفتار رہے لیکن عقل سلیم و فہمِ مستقیم رکھنے والوں نے سابق حکمرانوں اور علی کے اندر فرق واضح محسوس کر لیا لہٰذا فطری طور پر عقیدتمندوں کا دائرہ پہلے کی نسبت وسیع تر ہو گیا لیکن حضرت امام حسن کی صلح کے بعد معاویہ کے دل میں قدیمی حسد و بغض کی آگ بھڑک اٹھی اور اس کی خاموش چنگاریاں یکبار سلگنے لگیں اور اس نے شیعانِ علیؑ سے انتقام لینے کے لئے نڈر بے باک اور خوفِ خدا سے آزاد گورنر تلاش کر کے ان کے خون سے تسکین قلب کا سامان مہیا کیا اور بے دریغ ان کو قتل کروایا۔ اسی سلسلہ میں زیاد کو (جو زیاد بن ابیہ کے نام سے مشہور تھا) زیاد بن ابی سفیان بنا کر اپنا بھائی بنایا (خلافت و ملوکیت کے صہ ۱۷۵ پر دیکھئے) اور اُسے شاہی خاندان کے ایک فرد کی حیثیت دے کر کوفہ کا گورنر مقرر کیا جہاں شیعان علی کی زیادہ تعداد موجود تھی۔ اس لئے کہ حضرت علیؑ کا دار السلطنت تھا۔ اس ظالم ولد الحرام (صہ ۱۱۵) نے کوفہ میں شیعوں پر وہ ظلم کے پہاڑ گرائے کہ الاماں۔ کافی احتیاط سے کام لینے کے باوجود "خلافت و ملوکیت" میں اس ظلم کی روداد پر تسلی بخش حد تک روشنی ڈالی گئی ہے حضرت حجر بن عدی رہ جو شیعانِ کوفہ میں بہت بلند مقام رکھتے تھے اور حضرت امیر المومنین علی علیہ السّلام کے خاص مصاحبوں اور رازدانوں میں سے تھے اور باعتراف مودودی صاحب

"ایک زاہد و عابد صحابی اور صلحائے اُمت میں ایک اُونچے مرتبے کے شخص تھے" حد۱۶۳ - ان کو اور ان کے ساتھیوں کو صرف اس لئے قتل کرا دیا گیا کہ وہ حضرت علی پر سب نہیں کرتے تھے۔

"حضرت مغیرہ جب تک کوفہ کے گورنر رہے وہ ان (شیعانِ علی) کے ساتھ رعایت برتتے رہے ان کے بعد جب زیاد کی گورنری میں بصرہ کے ساتھ کوفہ بھی شامل ہو گیا تو اس کے اور ان (شیعانِ علی) کے درمیان کش مکش برپا ہو گئی وہ خطبے میں حضرت علی کو گالیاں دیتا تھا اور یہ اٹھ کر اس کا جواب دینے لگتے تھے اسی دوران میں ایک مرتبہ انہوں نے نماز جمعہ میں تاخیر پر بھی اُس کو ٹوکا۔ آخر اس نے انہیں (حجر بن عدی کو) اور اس کے بارہ ساتھیوں کو گرفتار کر لیا اور ان کے خلاف بہت سے لوگوں کی شہادتیں اس فرد جرم پر لیں، کہ انہوں نے ایک جتھا بنا لیا ہے خلیفہ کو اعلانیہ گالیاں دیتے ہیں امیر المومنین (معاویہ) کے خلاف لڑنے کی دعوت دیتے ہیں ان کا دعویٰ یہ ہے کہ خلافت آلِ ابی طالب کے سوا کسی کے لئے درست نہیں ہے انہوں نے شہر میں فساد برپا کیا اور امیر المومنین کے عامل کو نکال باہر کیا یہ ابو تراب (حضرت علیؓ) کی حمایت کرتے ہیں اور ان پر رحمت بھیجتے ہیں اور ان کے مخالفین سے اظہارِ برأت کرتے ہیں" حد۱۶۴۔ اس طرح یہ ملزم حضرت معاویہ کے پاس بھیجے گئے اور انہوں نے ان کے قتل کا حکم دے دیا۔ قتل سے پہلے جلادوں نے ان کے سامنے جو بات پیش کی وہ یہ تھی کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ اگر تم علی سے برأت کا اظہار کرو اور ان پر لعنت بھیجو تو تمہیں چھوڑ دیا جائے ورنہ قتل کر دیا جائے" ان لوگوں نے اس بات کے ماننے سے انکار کر دیا اور حجر نے کہا "میں زبان سے وہ بات نہیں نکال سکتا جو رب کو ناراض کرے" آخر کار وہ اور ان کے سات ساتھی قتل کر دئے گئے ان میں سے ایک شخص عبدالرحمٰن بن حسان کو حضرت معاویہ نے زیاد کے پاس واپس بھیج دیا اور اس کو لکھا کہ انہیں بد ترین طریقہ سے قتل کرو، چنانچہ اس نے انہیں زندہ دفن کرا دیا حد۱۶۵۔

معاویہ کے ایک دوسرے فوجی سپہ سالار کی شیعہ کش پالیسی کی داستان سنیئے جس کا نام ہے بسر بن ارطاۃ

اس شخص (بسر بن ارطاۃ) نے یمن میں حضرت علی کے گورنر عبید اللہ بن عباسؓ کے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو پکڑ کر قتل کر دیا ان بچوں کی ماں اس صدمے سے دیوانی ہو گئی۔ بنی کنانہ کی ایک عورت جو یہ ظلم دیکھ رہی تھی چیخ اٹھی کہ "مردوں کو تم نے قتل کر دیا اب ان بچوں کو کس لئے قتل کر رہے ہو؟ بچے تو جاہلیت میں بھی نہیں مارے جاتے تھے۔ اے ابن ارطاۃ جو حکومت بچوں اور بوڑھوں کے قتل اور بے رحمی و برادر کشی کے بغیر قائم نہ ہو سکتی ہو اُس سے بُری کوئی حکومت نہیں" اس کے بعد اس ظالم شخص کو حضرت معاویہ نے ہمدان پر حملہ کرنے

کے لئے بھیجا جو اس وقت حضرت علی کے قبضہ میں تھا وہاں اس نے دوسری زیادتیوں کے
ساتھ ایک ظلمِ عظیم یہ کیا کہ جنگ میں جو مسلمان عورتیں پکڑی گئی تھیں انہیں لونڈیاں بنا لیا حالانکہ
شریعت میں اس کا کوئی جواز نہیں یہ ساری کارروائیاں گویا اس بات کا عملاً اعلان تھیں
کہ اب گورنروں اور سپہ سالاروں کو ظلم کی کھلی چھوٹ ہے۔ ص۱۱

کتب سیر و تاریخ کا مطالعہ کرنے سے ظلم کی اس طویل داستان کو سن کر جگر منہ کو آتا ہے۔ پس
استبداد و جور کی جس چکی میں شیعانِ علی کو پیسا گیا اور جس شکنجے میں ان کو جکڑ کر اُن کا خون چوسا گیا تاریخ اسلام
کے صفحات پر اس کی سرخ لکیریں قیامت تک قائم رہیں گی لیکن معاویہ کو قدرت کے اس قانون
کا پتہ نہ تھا کہ صداقت ظلم سے نہیں مٹا کرتی اور حق کو طاقت سے نہیں دبایا جا سکتا بلکہ قربانیاں
حق و صداقت کا ساتھ دینے والوں کے ایمانی ولولوں کو اور تیز کرتی ہیں اور ان کے ثباتِ قدم میں
مزید استحکام پیدا کرتی ہیں۔ پس جو مارے گئے وہ یقیناً جنت کو راہی ہوئے لیکن آنے والے شیعانِ علی
کو ایک اساسی دستور بتا گئے اور ان کا کردار آنے والے شیعانِ علی کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے گیا کہ
مر جاؤ مٹ جاؤ لٹ جاؤ اور کٹ جاؤ لیکن طوفانِ باطل کے دھارے کے سامنے انجام سے بے نیاز ہو کر پوری
طرح ڈٹ جاؤ۔ آخر کار ظلم تھک گیا تشدد کے جذبات ڈھیلے پڑ گئے۔ ظلم کی تلوار کند ہو گئی مارنے والے
مر مٹ گئے لیکن حق کے علمبردار شیعانِ علی اسی کو فہ میں سے نکل کر معاویہ کے بعد اس کے بیٹے یزید کے مقابلہ
میں کوہ گراں کی طرح ڈٹ گئے۔ ظلم سہہ سہہ کر ان کے سینوں میں ایمان اس طرح راسخ ہو گیا تھا کہ اب وہ
موت کو موت ہی نہ سمجھتے تھے پس حضرت امام حسین علیہ السلام کی قیادت میں منظم طور پر باطل کی استبدادی
قوتوں سے اعلانیہ ٹکرا گئے اور اگرچہ میدانِ کارزار میں جامِ شہادت نوش کر کے راہیِ جنت ہوئے لیکن
آنے والی نسلوں کے لئے حق و باطل میں امتیاز کی راہیں ہموار کر گئے۔ اب تک جو لوگ خلافت اور اسلامی
جمہوریت کو مذہب اور دین کا نام دینے کی غلط فہمیوں میں مبتلا تھے واقعہ کربلا نے اس کی قلعی کھول دی
اور یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ (دورِ رسالت کے فوراً بعد جو دو لائنیں نکلی تھیں ایک وہ جس پر
برسرِ اقتدار پارٹی گامزن تھی اور جس کو سوادِ اعظم کی تائید حاصل تھی اور دوسری وہ لائن جس پر حضرت علی اور ان
کے حامی لوگ گامزن تھے) ان دونوں میں سے برحق کونسی ہے اور باطل کونسی؟

مودودی صاحب تحریر فرماتے ہیں "باقاعدہ مخصوص نظریات کے ساتھ ایک پارٹی کے وجود کا
آغاز اُن لڑائیوں کے زمانہ میں ہوا جو حضرت طلحہ و زبیر کے ساتھ معرکہ جمل میں، حضرت معاویہ
کے ساتھ صفین میں، اور خوارج کے ساتھ نہروان میں حضرت علی کو پیش آئیں۔ پھر حضرت حسینؑ

کی شہادت نے ان لوگوں کی صفوں کو مجتمع کیا ان کے جذبات میں شدت پیدا کی اور ان کے نظریات کو ایک واضح شکل دے دی ۔ علاوہ بریں بنو امیہ کے خلاف ان کے طرزِ حکومت کی وجہ سے عام مسلمانوں میں جو نفرت پھیلی اور اموی و عباسی دَور میں اولادِ علی اور ان کے حامیوں پر ظلم و ستم کی وجہ سے مسلمانوں کے دلوں میں ہمدردی کے جو جذبات پیدا ہوئے انہوں نے شیعی دعوت کو غیر معمولی طاقت بخش دی ،، صد ۲۱۱ ۔

ان حقائق کا اعتراف کرنے کے باوجود حکمران طبقہ کی حمایت اور لیپ پوت کر کے ان کی اغلاط سے درگذر کرنا اور انہیں بزرگان دین میں سے شمار کرنا آبائی عقیدہ کی جزو لاینفک ہے اور یزید جیسے علانیہ فاسق و فاجر پر لعنت کرنے سے اس لئے گریز کیا جاتا ہے کہ کہیں اس طرح اس کے والد یا صحابہ میں سے کسی اور پر لعنت کرنے کا دروازہ نہ کھل جائے ۔ (خلافت و ملوکیت صد ۱۸۳)

راست گوئی اور راست بازی

مودودی صاحب کے نزدیک ان دونو لفظوں کے معانی و مفاہیم میں کوئی فرق نہیں وہ راست بازی کا معنی راست گوئی سمجھتے ہیں حالانکہ کہنے اور کرنے میں فرق نہ کرنے والے کو دماغی مریض ہی سمجھنا چاہیئے چنانچہ خلافت و ملوکیت کے صد ۳۰۳ پر ارشاد فرماتے ہیں ۔

لیکن میں " الصحابۃ کلھم عدول ،، (صحابہ سب راستباز ہیں) کا مطلب یہ نہیں لیتا کہ تمام صحابہؓ بے خطا تھے ۔ اور ان میں کا ہر ایک ہر قسم کی لبشری کمزوریوں سے بالا تر تھا اور ان میں سے کسی نے بھی کوئی غلطی نہیں کی ہے بلکہ میں اس کا مطلب یہ لیتا ہوں کہ رسول اللہ صلعم سے روایت کرنے یا آپ کی طرف کوئی بات منسوب کرنے میں کسی صحابی رضؓ نے کبھی راستی سے ہرگز تجاوز نہیں کیا ہے پہلا مطلب اگر لیا جائے تو تاریخ ہی نہیں حدیث کی مستند اور قوی روایات بھی اس کی تائید نہ کریں گی اور دوسرا مطلب لیا جائے تو وہ قطعی طور پر ثابت ہے ۔ الخ ۔

دیکھئے صحابہ کے عدول ہونے کا معنی راستباز ہونا بیان کیا ہے لیکن راستباز کا معنی راست گو ہے راست خو نہیں ہے اور فرماتے ہیں اگر اس کا معنی راست خو لیا جائے تو تاریخ و حدیث کی مستند روایات اس کی تائید نہیں کرتیں لیکن ان کا راست گو ہونا قطعی طور پر ثابت ہے گویا ان کا حق گو ہونا یقینی ہے لیکن حق خو ہونا ثابت نہیں ۔

انہوں نے اپنے اس نظریہ کے ماتحت راستبازی کو اپنا مطمحِ نظر اور مآل تحقیق قرار دیا ہے جس کا

معنی راست گوئی تک ہی محدود ہے چنانچہ ماخذ کی بحث میں قاضی ابوبکر ابن تیمیہ اور شاہ عبدالعزیز کی کتابوں پر انحصار نہ کرنے کی وجہ یہ لکھی ہے

لیکن جس وجہ سے اس مسئلہ میں میں نے ان پر انحصار کرنے کے بجائے براہِ راست اصل ماخذ سے خود تحقیق کرنے اور اپنی آزادانہ رائے قائم کرنے کا راستہ اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ ان تینوں حضرات نے دراصل اپنی کتابیں تاریخ کی حیثیت سے بیان واقعات کے لئے نہیں ، بلکہ شیعوں کے شدید الزامات اور ان کی افراط و تفریط کے رد میں لکھی ہیں جس کی وجہ سے عملاً ان کی حیثیت وکیل صفائی کی سی ہو گئی ہے اور وکالت خواہ الزام کی ہو یا صفائی کی اس کی عین فطرت یہ ہوتی ہے کہ اس میں آدمی اسی مواد کی طرف رجوع کرتا ہے جس سے اس کا مقصد مضبوط ہوتا ہو اور اس مواد کو نظر انداز کر دیتا ہے جس سے اس کا مقصد کمزور ہو جائے صفحہ ۳۲۰

اس میں شک نہیں کہ انہوں نے بڑے پتے کی بات کی ہے اور وکیل صفائی کے کردار کی صحیح نشاندہی کی ہے لیکن ان کی اس تحقیق اور کاوش کا نتیجہ صرف حق جوئی و حق گوئی تک ہی محدود ہے ۔ اس کا حق خوئی سے دُور کا واسطہ بھی نہیں کیونکہ خلافت و ملوکیت کا اول سے آخر تک مطالعہ کیجئے اور اس کے معانی و مطالب کو خوب سمجھنے کی کوشش کیجئے ۔ آپ یقیناً اس نتیجہ تک پہنچے بغیر نہ رہ سکیں گے کہ پوری کتاب میں وکیل صفائی کا ہی انہوں نے پاٹ ادا کیا ہے اور جمہوری مسلک اور جمہوری اسلامی نظام کو شرعی حیثیت دینے کے لئے انہوں نے جس قدر اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارے ہیں اس کے نتیجہ میں ہر ماخذ سے صرف اپنے مطلب کا مواد لیا ہے اور ایسے مواد کو نظر انداز کرتے رہے ہیں جس سے ان کا مقصد کمزور ہوتا تھا جیسا کہ وکیل صفائی کا نظریہ انہوں نے خود واضح کیا ہے ۔

حضرت علی علیہ السّلام کے سامنے دو نظریے تھے (۱) قائم شدہ حکومت سے رَواداری اور ملک و ملّت کی فلاح و بقا کے لئے حکومت سے پُورا تعاون (۲) شرعی لحاظ سے اور آئین اسلام کی رُو سے طریق انتخاب پر تنقید اور مکمّل اختلاف رائے ۔ جہاں تک پہلے نظریے کا تعلّق ہے ۔ مودودی صاحب اُس کے نقل کرنے میں ذرا بھر بخل نہیں کرتے لیکن حضرت علی کا دوسرا نظریہ چونکہ ان کے قصر جمہوریت کی بنیادوں کو کھوکھلا کرتا ہے ۔ اور اسلام کے جمہوری عقیدے کو چیلنج کرتا ہے اس لئے کہیں بھی اس کے نقل کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی ۔ حالانکہ ابن قتیبہ دینوری نے الامامۃ والسیاستہ میں صاف لکھا ہے کہ حضرت علی کے نزدیک ان کا خلیفہ رسول کہلانا اور امیر المومنین کہلانا شرعی لحاظ سے ناجائز تھا اور ابن قتیبہ کے مذہب کے متعلق لکھتے ہیں ۔

ابن قتیبہ کے متعلق یہ خیال بالکل غلط ہے کہ وہ شیعہ تھا وہ ابو حاتم سجستانی اور اسحٰق بن راہویہ جیسے آئمہ کا شاگرد اور دینور کا قاضی تھا۔ ابن کثیر اس کے متعلق کہتے ہیں (ترجمہ) وہ ثقہ اور صاحب فضل و شرف آدمی تھا) حافظ ابن حجر کہتے ہیں "صدوق" (نہایت سچا آدمی) خطیب بغدادی کہتے ہیں (ترجمہ) (وہ ثقہ دیندار اور فاضل تھا) ابن حزم کہتے ہیں (ترجمہ) اپنے دین وعلم میں بھروسے کے قابل) ابن حجر اس کے مذہب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں (ترجمہ) السلفی کہتے ہیں کہ ابن قتیبہ ثقہ اور اہل سنت میں سے تھا مگر بربنائے مذہب اس کے مخالف تھے . . . . . میرا خیال یہ ہے کہ مذہب سے سلفی کی مراد ناصبیت ہے کیونکہ ابن قتیبہ میں اہل بیت سے انحراف پایا جاتا تھا اور حاکم اس کے برعکس تھے۔) اس سے معلوم ہوا کہ شیعی ہونا تو درکنار ابن قتیبہ پر تو الٹا ناصبی ہونے کا الزام تھا" ص ۳۰۹

رہی اس کی کتاب الامامۃ والسیاسۃ اس کے متعلق یقین کے ساتھ کسی نے بھی یہ نہیں کہا ہے کہ وہ ابن قتیبہ کی نہیں ہے (آگے چل کر لکھتے ہیں) میں نے خود یہ پوری کتاب پڑھی ہے اور اس کی چند روایتوں کو میں بھی الحاقی سمجھتا ہوں مگر ان کی بنا پر پوری کتاب کو رد کر دینا میرے نزدیک زیادتی ہے اس میں بہت سی کام کی باتیں ہیں (ایضاً) ص ۳۱۱

بقول خودش وکیل صفائی والی ہیرا پھیری ہے۔ ابن قتیبہ کا سنّی ہونا مسلّم ہے بلکہ اس کے ناصبی ہونے کا احتمال بھی ہے کیونکہ وہ اہل بیت سے منحرف تھا اور پھر اس کی کتاب الامامۃ والسیاسۃ کی اس کی طرف نسبت بھی غلط نہیں باایں ہمہ اس کی بعض روایتوں کو الحاقی کہہ دینا اور بعض کو کام کی باتیں کہنا وکیل صفائی والا کردار نہیں تو اور کیا ہے یعنی جو اپنے مطلب کی ہے وہ کام کی بات ہے اور جو آبائی تقلیدی عقیدہ کی اساس کو کمزور ثابت کرتی ہے وہ الحاقی ہے۔

مودودی صاحب ایک طرف تو اپنے آبائی جمہوری عقیدہ کی لاج رکھنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں اور روایات میں قطع و برید کر کے صرف "کام کی باتیں" صحیح[1] ماخذوں سے نقل کرتے ہیں

---

[1] مودودی صاحب کے نزدیک صحیح اور معتمد ترین ماخذ وہی ہیں جن کے مصنفین شیعوں کے سخت دشمن اور متعصب ترین لوگ ہوں چنانچہ فرماتے ہیں "میں نے خاص طور پر ان (حافظ ابن کثیر) کی تاریخ پر زیادہ تر اعتماد دو وجوہ سے کیا ہے ایک یہ کہ وہ تشیع کی طرف میلان تو درکنار اس کے سخت مخالف ہیں شیعی روایات کی بڑے زور شور سے تردید کرتے ہیں صحابہ میں سے کسی پر اپنی حد وسع تک آنچ نہیں آنے دیتے اور دَورِ فتنہ کی تاریخ بیان (باقی ص ۶۶ پر)

بڑے محتاط ہیں لیکن دوسری طرف محققین کے زمرہ میں شامل ہوکر اپنی شان اجتہادی سے ایسے نظریوں تک پہنچ جاتے ہیں جو ان کے آبائی عقیدہ سے متصادم ہونے کے علاوہ ان کی تضاد بیانی کو منظرِ عام پر ظاہر کرتے ہیں چنانچہ حضرت عثمان کے قتل کے متعلق رقمطراز ہیں۔

"آخرکار ان لوگوں نے ہجوم کر کے سخت ظلم کے ساتھ حضرت عثمان کو شہید کر دیا۔ تین دن تک ان کا جسدِ مبارک تدفین سے محروم رہا اور قتل کرنے کے بعد ظالموں نے ان کا گھر بھی لوٹ لیا ......
اُس (شکایت) کو رفع کرانے کے لئے صرف اتنی بات کافی ہوسکتی تھی کہ یہ لوگ مدینہ طیبہ کے انصار و مہاجرین اور خصوصاً اکابر صحابہ سے مل کر ان کے ذریعے سے حضرت عثمان کو اصلاح پر آمادہ کرتے الخ" ص۱۱۵ آگے چل کر لکھتے ہیں۔ اس مقام پر کسی شخص کو یہ شبہ لاحق نہ ہو کہ اہل مدینہ ان لوگوں کے اس فعل پر راضی تھے واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ اچانک مدینہ پہنچ گئے تھے اور انہوں نے اہم ناکوں پر قبضہ کر کے ایک حد تک اہل شہر کو بے لبس کر دیا تھا ص۱۱۶" دوسرے مقام پر فرماتے ہیں۔ مدینے کے مہاجر و انصار بھی جو دراصل اس وقت مملکت اسلامیہ میں اہل حل وعقد کی حیثیت رکھتے تھے ان کے ہمنوا بننے کے لئے تیار نہ ہوئے مگر یہ لوگ (شورشی) اپنی ضد پر قائم رہے اور بالاخر انہوں نے مدینہ میں گھس کر حضرت عثمان کو گھیر لیا۔ ص۱۱۷

یہ بیان ان کے آبائی تقلیدی جمہوری مسلک پر لیپ پوت کے لئے ہے۔ اس کے بعد ان کا تحقیقی بیان سنیئے جو پہلے تقلیدی بیان کے بالکل متضاد ہے۔

حضرت عثمان کے خلاف جو شورش برپا ہوئی اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ کسی سبب کے بغیر محض سبائیوں کی سازش کی وجہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی یا وہ محض اہلِ عراق کی شورش پسندی کا نتیجہ تھی۔ تاریخ کا صحیح مطالعہ نہیں ہے اگر لوگوں میں ناراضی پیدا ہونے کے واقعی اسباب موجود نہ ہوتے اور ناراضی فی الواقع موجود نہ ہوتی تو کوئی سازشی گروہ شورش برپا کرنے اور صحابیوں اور صحابی زادوں تک کو اس کے اندر شامل کر لینے میں کامیاب نہ ہوسکتا تھا ان لوگوں کو اپنی شرارت میں کامیابی صرف اس وجہ سے حاصل ہوئی کہ اپنے اقرباء کے معاملہ میں حضرت عثمان نے جو طرزِ عمل اختیار فرمایا تھا اس پر عام لوگوں میں ہی نہیں بلکہ اکابر صحابہ تک میں ناراضی پائی جاتی تھی۔ الخ" ص۳۲۸ و ص۳۲۹

بقیہ حاشیہ ص۶۵

کرتے ہوئے انہوں نے حضرت معاویہ ہی نہیں یزید تک کی صفائی پیش کرنے میں کسر نہیں اٹھا رکھی ہے الخ" ص۳۱۵

مدینے میں جب حضرت عثمان پر ہر طرف نکتہ چینیاں ہونے لگیں اور حالت یہ ہو گئی کہ چند صحابہ (زید بن ثابت۔ ابو اسید ساعدی۔ کعب بن مالک اور حسان بن ثابت رضی اللہ عنہم کے سوا شہر میں کوئی صحابی ایسا نہ رہا جو حضرت والا کی حمایت میں زبان کھولتا صفحہ ۳۳

حضرت طلحہ و زبیر اور حضرت عائشہ کے متعلق بھی ابن جریر نے روایات نقل کی ہیں کہ یہ حضرات بھی اس صورتِ حال سے ناراض تھے صفحہ ۳۳۲ اور جب[۱] حضرت عائشہ نے خونِ عثمان کا بدلہ طلب کرنے کا ارادہ کیا تو ایک شخص عبد بن ام کلاب نے کہہ دیا "خدا کی قسم سب سے پہلے تو آپ ہی نے ان کی مخالفت کی تھی" صفحہ ۳۳۲

باہر سے آئے ہوئے دو ہزار شورشی دار الخلافہ پر مسلط تھے۔ خلیفہ وقت کو قتل تک کر گذرے تھے۔ خود دار الخلافہ میں بھی ایک اچھی خاصی تعداد ان کی ہم خیال موجود تھی، صفحہ ۳۳۵

اب ذرا بنظرِ انصاف مودودی صاحب کے پہلے بیان میں اور ان بیانات میں تقابل کیجئے ان کی تحقیق یہ کہتی ہے کہ حضرت عثمان کی غلط کاریوں کی بدولت سب مسلمان حتیٰ کہ چار آدمیوں کے علاوہ پورے مدینے میں اکابر صحابہ تک ان کی حمایت میں زبان کوئی نہیں کھولتا تھا۔ اور ان کا مقلدانہ رویہ یہ کہتا ہے کہ سازشی لوگ اچانک مدینہ میں گھس آئے تھے اور انہوں نے شہر کی ناکہ بندی کرلی تھی۔ حتیٰ کہ اہل شہر کو انہوں نے بے بس کر دیا تھا صفحہ ۱۱۹ بے شک تاریخ کا منہ چڑانا اسی کو ہی کہا جاتا ہے۔ ایک جگہ وکیل صفائی کی حیثیت سے کہہ دیا کہ شورشیوں کو چاہیے تھا کہ مدینہ طیبہ کے انصار و مہاجرین اور خصوصاً اکابر صحابہ سے مل کر حضرت عثمان کو اصلاح پر آمادہ کرتے صفحہ ۱۱۸ اور دوسری جگہ اپنے تحقیق کے قلم سے لکھتے ہیں کہ صحابہ میں سے چار آدمیوں کے سوا کوئی بھی ان کی حمایت میں زبان نہیں کھولتا تھا (گویا شورشیوں کے مؤید تھے) صفحہ ۳۳۰۔ صحابی و صحابی زادے شورش میں شامل تھے صفحہ ۳۲۹ اکابر صحابہ بھی عثمان سے ناراض تھے صفحہ ۳۲۹ یعنی کہ حضرت طلحہ و زبیر و عائشہ بھی اس سے ناراض تھے صفحہ ۲۳۲ دار الخلافہ میں اچھی خاصی تعداد اُن (شورشیوں) کے ہم خیال تھی صفحہ ۳۲۵ اب ذرا گریبان میں جھانک کر فیصلہ کیجئے کہ جب صحابی۔ صحابی زادے

---

[۱] جب شورشیوں نے حضرت عثمان کے گھر کا محاصرہ کیا تو حضرت عائشہ لوگوں کو بھڑکاتی تھیں اُقْتُلُوا نَعْثَلاً فَقَدْ كَفَرَ اس نعثل کو قتل کرو کہ یہ کافر ہو گیا ہے (نعثل ایک یہودی کا نام تھا جس سے ان کو تشبیہ دی گئی) (تذکرۃ الخواص سبط ابن الجوزی) مودودی صاحب نے حضرت عثمان کے متعلق اپنی عقیدتمندی کی لاج رکھتے ہوئے لیپ پوت سے کام لے کر حضرت عائشہ کے نظریے کو قطع و برید سے پیش کیا ہے تاکہ صورتِ حال پر حتی الامکان پردہ ڈالا جا سکے حقیقت یہ ہے کہ مدینہ کی اکثریت حضرت عثمان کے رویے سے نالاں تھی اور سوائے چند آدمیوں کے اس کا حامی کوئی نہ تھا جیسا

اکابر صحابہ طلحہ زبیر و عائشہ اور دار الخلافہ یعنی مدینہ میں ان کی اچھی خاصی تعداد تھی بلکہ چار آدمیوں کے سوا تمام اہل مدینہ شورشیوں کے ہم خیال تھے یا کم از کم شورشیوں کے فعل پر راضی تھے کیونکہ ان کی حمایت میں زبان کھولنے والا کوئی نہ تھا تو ایسی صورت میں حضرت عثمان کی اصلاح کون کرواتا ؟ واقعات تاریخ یہ بتلاتے ہیں

مودودی صاحب نے باوجود کافی پردہ ڈالنے کے اس امر کا انکشاف کر ہی دیا اور حضرت عائشہ بھی بلوائیوں اور شورشیوں کی ابتدائی کاروائی کے دوران میں مدینے میں تھی اور ان کے اس فعل پر راضی تھی ورنہ ان کو اگر روکتی تو کسی تاریخ میں اس کا کہیں نشان ہوتا اور بلوائیوں کا سرکردہ اس کا سگا بھائی محمد بن ابوبکر تھا جو سن و سال میں اس سے چھوٹا تھا اور اپنی بڑی بہن کا بہت احترام کرتا تھا اور تو اور اگر اپنے بھائی کو بلا کر اس شورش سے باز رہنے کی اس کو فہمائش کرتی تو یقیناً وہ مان لیتا اور اگر نہ بھی مانتا تو کم از کم حضرت عثمان کے ساتھ ان کی خیر خواہی تو منظر عام پر آجاتی - بہر کیف مورخین کا نکتہ نگاہ یہ ہے کہ لوگوں کو حضرت عثمان کے قتل پر اکسا بھڑکا کر خود حج کے لئے مکہ چلی گئی اور جب اس کو عثمان کے قتل کی خبر ملی اور یہ کہ حضرت علی کو لوگوں نے چوتھا خلیفہ بنا لیا ہے تو اس نے عثمان کے خون کا بدلہ لینے کا اعلان کیا - اس موقعہ پر عبد بن ام کلاب نے کہا خدا کی قسم تو ہی تو لوگوں کو اس کے قتل پر اکساتی تھی اور کہتی تھی اُقْتُلُوا نَعْثَلاً قَاتَلَهُ اللّٰهُ إِنَّهُ قَدْ كَفَرَ اس نعثل (عثمان) کو قتل کرو خدا اس کو مارے تحقیق یہ کافر ہے (مودودی صاحب نے لیپ پوت سے کام لے کر اس جملہ کو نرم کر کے پیش کیا ہے) حضرت عائشہ نے جواب دیا " ان لوگوں نے حضرت عثمان سے توبہ کرا لی تھی پھر ان کو قتل کر ڈالا " خدا جانے حضرت عثمان کی توبہ کا جناب عائشہ کو غائبانہ کیسے پتہ چل گیا - حالانکہ اگر حضرت عثمان نے اپنی ان غلطیوں سے توبہ کی ہوتی جو تمام مسلمانوں کے لئے ناراضگی کا باعث بنی ہوئی تھیں تو یقیناً ان کو قتل نہ کیا جاتا اور قاتلین میں حضرت عمرو بن الحمق خزاعی بھی تھے جو صحابی رسولؐ تھے اور صحابیت کے شرف اور بلند مرتبہ کے پیش نظر ناممکن ہے کہ توبہ کر لینے کے بعد بھی وہ اپنے اقدام سے باز نہ آئے - ان کے متعلق خود مودودی صاحب رقمطراز ہیں " عمرو بن الحمق رسول اللہؐ کے صحابیوں میں سے تھے مگر حضرت عثمان کے قتل میں انہوں نے بھی حصہ لیا تھا " ص۱۲۷ اور جب حضرت عائشہ نے حضرت عثمان کی توبہ کا بہانہ پیش کیا تو عبد بن ام کلاب نے اس کو تسلیم نہ کیا بلکہ جواب میں یہ اشعار پڑھے -

مِنْكِ الْبُكَاءُ وَمِنْكِ الْعَوِيلُ	اب رونا اور واویلا کرنا تجھ سے ظاہر ہے
وَمِنْكِ الرِّيَاحُ وَمِنْكِ الْمَطَرُ	حالانکہ یہ آندھیاں اور بارش تجھ سے ہی ہوئی
وَأَنْتِ أَمَرْتِ بِقَتْلِ الْإِمَامِ	اور تو نے ہی امام (عثمان) کے قتل کا حکم دیا تھا
وَقُلْتِ لَنَا إِنَّهُ قَدْ كَفَرَ	اور تو نے کہا تھا کہ وہ کافر ہو چکا ہے -

کہ اصلاحی اقدامات سے بالکل مایوسی ہوگئی تھی تب یہ آخری قدم اٹھایا گیا۔ اور خود مودودی صاحب نے دبے لفظوں میں اس حقیقت کا اعتراف بھی کیا ہے کہ حضرت علی صلح وصفائی میں آخر تک کوشاں رہے اور شورشی لوگ بھی حضرت علی کے فیصلے کو مان جاتے تھے لیکن حضرت عثمان آخر تک اپنی پالیسی کو نہیں بدل سکے تھے۔ ملاحظہ ہو۔

"لوگوں نے حضرت علی سے کہا کہ آپ حضرت عثمان سے مل کر ان معاملات پر بات کریں چنانچہ وہ ان کی خدمت میں تشریف لے گئے اور ان کو وہ پالیسی بدل دینے کا مشورہ دیا جس پر اعتراضات ہو رہے تھے۔ حضرت عثمان نے فرمایا کہ جن لوگوں کو میں نے عہدے دئے ہیں انہیں آخر عمر بن الخطاب نے بھی تو عہدوں پر مامور کیا تھا پھر میرے ہی اُوپر لوگ کیوں معترض ہیں؟ حضرت علی نے جواب دیا "عمر جس کو کسی جگہ کا حاکم مقرر کرتے تھے اس کے متعلق اگر انہیں کوئی قابلِ اعتراض بات پہنچ جاتی تھی تو وہ بری طرح اس کی خبر لے ڈالتے تھے مگر آپ ایسا نہیں کرتے آپ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ نرمی برتتے ہیں حضرت عثمان نے فرمایا "وہ آپ کے بھی تو رشتہ دار ہیں" حضرت علی نے جواب دیا (ترجمہ) بے شک میرا بھی اُن سے قریبی رشتہ ہے لیکن دوسرے لوگ اُن سے افضل ہیں" حضرت عثمان نے کہا" کیا عمر نے معاویہ کو گورنر نہیں بنایا تھا" حضرت علی نے جواب دیا عمر کا غلام یرفا بھی ان سے اتنا نہ ڈرتا تھا جتنے معاویہ ان سے ڈرتے تھے اور اب حال یہ ہے کہ معاویہ آپ سے پوچھے بغیر جو چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں اور کہتے ہیں یہ عثمان کا حکم ہے مگر آپ انہیں کچھ نہیں کہتے" ص ۳۳۱

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ حضرت علی کی باتوں کا اس پر ذرہ بھر اثر نہ ہوتا تھا بلکہ وہ اپنی غلط پالیسیوں کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ ایک دوسرے موقعہ پر آپ نے فرمایا۔

یہ سب کچھ مروان بن الحکم، سعید بن العاص، عبداللہ بن عامر اور معاویہ کی بدولت ہو رہا ہے آپ ان لوگوں کی بات مانتے ہیں اور میری نہیں مانتے" حضرت عثمان نے فرمایا" اچھا اب میں تمہاری بات مانوں گا" اس پر حضرت علی انصار و مہاجرین کے ایک گروہ کو ساتھ لے کر

بقیہ حاشیہ صہ ۷۶

فَهُبْنَا اَطَعْنَاكَ فِي قَتْلِهِ — پس سمجھ لیجئے کہ ہم نے تو اس کے قتل میں تیرے حکم کی اطاعت کی ہے

وَقَاتِلُهُ عِنْدَنَا مَنْ اَمَر — اور در حقیقت اس کا قاتل وہی ہے جس نے حکم دیا تھا (یعنی تو ہی اسکی قاتل ہے)

الخ (تذکرۃ الخواص سبط بن الجوزی) تاریخ طبری ج ۵ صہ ۱۷۲

مصر سے آنے والے شورشیوں کے پاس تشریف لے گئے اور ان کو واپس جانے کے لئے
راضی کیا۔ صـ۳۳۲۔

اس سے مودودی صاحب کی اس لیپ پوت کا پردہ بھی چاک ہو گیا کہ سازشی لوگ مدینہ میں اچانک گھس آئے تھے اور انہوں نے شہر کی ناکہ بندی کر لی تھی اور اہلِ شہر کو بے بس کر دیا تھا صـ۱۱۹ حقیقت یہ ہے یہ لوگ شورش کے لئے نہیں آئے تھے بلکہ اپنے مظالم کی فریاد لے کر پہنچے تھے، جو بنی اُمیہ کے ناخدا ترس ظالم حکام کی طرف سے ان پر ڈھائے جاتے تھے اور حضرت عثمان ان لوگوں کی شکایات پر کان دھرنے کو تیار نہیں ہوتے تھے اور مودودی صاحب خود اس کے معترف ہیں چنانچہ الریاض النضرہ سے سعید بن مسیب کا قول نقل کرتے ہیں: "آپ (عثمان) سے ان (حکام) کی شکایت کی جاتی مگر آپ ان کی شکایت کو دُور نہ فرماتے" صـ۳۳۴ الاصابہ (ابن حجر) سے نقل کرتے ہیں (حضرت عثمان) اپنے بعض امراء کو تبدیل کر کے لوگوں کو راضی کر دیتے اور پھر انہیں دوبارہ مقرر کر دیتے تھے" صـ۳۳۴ اور فیض الباری سے انور شاہ صاحب کا قول نقل کیا ہے۔

پھر ان فتنوں کے بھڑکنے کا سبب یہ ہوا کہ امیر المومنین عثمانؓ اپنے رشتہ داروں کو مناصب حکومت پر مقرر کرتے تھے اور ان میں سے بعض کا طرزِ عمل اچھا نہ تھا اس پر لوگ معترض ہوئے اور ان کی شکایات لوگوں نے حضرت عثمانؓ تک پہنچائیں مگر حضرت نے ان کو سچ نہ سمجھا اور خیال کیا کہ یہ لوگ میرے رشتہ داروں سے خواہ مخواہ جلتے ہیں اور شاید انہیں میرے رشتہ داروں کا مناصب پر مقرر کیا جانا ناگوار ہے اس لئے یہ ان کی شکایتیں کرتے ہیں .... پھر یہ بات بھی ہے کہ حضرت عثمان نے اگرچہ اپنے رشتہ داروں کو لوگوں کی شکایتوں پر معزول نہیں کیا مگر آپ نے ان کی حمایت بھی نہیں کی۔ صـ۳۳۵

خدا اس اندھی تقلید کا ستیاناس کرے۔ جب ان ظالم حکمرانوں کو معزول نہیں کیا جاتا، بلکہ ویسے کا ویسا ان کو ان کی گردنوں پر سوار رکھا جاتا ہے اور عہدۂ گورنری پر ان کو برقرار کیا جاتا ہے وہ جس طرح چاہیں ان کا خون چوستے رہیں تو یہ ان ظالم گورنروں کی حمایت نہیں تو اور کیا ہے؟

حضرت عثمان خویش نوازی اور کنبہ پروری میں اس قدر از خود رفتہ ہو گئے کہ حضرت علیؑ کے سمجھانے پر اُن سے بھی کہنے لگے تھے کہ "وہ آپ کے بھی تو رشتہ دار ہیں صـ۳۳۱" یہ فقرہ صرف اپنی غلط پالیسی پر تائید حاصل کرنے کے لئے اُنہوں نے کہا تھا تاکہ کنبہ پروری میں وہ اس بہانہ سے اُن کی حمایت کریں لیکن حضرت علی علیہ السلام نے رشتہ داری کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا "دوسرے لوگ

اُن سے افضل ہیں،، اور وہ اِن مناصب کے زیادہ سزاوار ہیں۔

بہرحال یہ لوگ اچانک مدینہ میں نہیں گھسے تھے بلکہ اصلاح طلبی کی خاطر آئے تھے اور کافی دیر تک انصار و مہاجرین کے ذریعے سے کوششیں جاری رہیں جس کا مودودی صاحب کو اعتراف ہے صـ۳۳۱ وصـ۳۳۲ لیکن حضرت عثمان نے آخر تک اپنی پالیسی نہ بدلی جس کے نتیجے میں سوائے چار آدمیوں کے حضرت عثمان کا پورے مدینے میں کوئی بھی حامی نہ رہا۔ اور حضرت علی علیہ السّلام نے بھی ان اصلاحی کوششوں کی ناکامی کا شکوہ کیا ہے چنانچہ خلافت و ملوکیت میں اس کا اعتراف موجود ہے حضرت علی علیہ السّلام عثمان سے بات چیت کرنے کے بعد مہاجرین و انصار کی ایک جماعت لے کر شورشیوں کے پاس گئے اور ان کو واپس جانے پر رضامند کیا لیکن عثمان پھر بھی اپنی سابق پالیسی پر برقرار رہا۔ ملاحظہ ہو۔

اسی زمانۂ فتنہ میں ایک اور موقعہ پر حضرت علی سخت شکایت کرتے ہیں کہ میں معاملات کو سلجھانے کی کوشش کرتا ہوں اور مروان ان کو پھر بگاڑ دیتا ہے آپ خود منبر رسُول پر کھڑے ہو کر لوگوں کو مطمئن کر دیتے ہیں اور آپ کے جانے کے بعد آپ ہی کے دروازے پر کھڑا ہو کر مروان لوگوں کو گالیاں دیتا ہے اور آگ پھر بھڑک اٹھتی ہے۔ صـ۳۳۲

اب ان حقائق کا اعتراف کر لینے کے بعد بھی یہ کہنا کہ شورشی اچانک گھس آئے تھے الخ لیپ پوت نہیں تو اور کیا ہے؟ اور یہ دعویٰ کہ "چاروں خلفاء حکومت کے انتظام اور قانون سازی کے معاملے میں قوم کے اہل الرائے لوگوں سے مشورہ کئے بغیر کام نہیں کرتے تھے،، صـ۸۷ صرف مقلدانہ عقیدہ کو آنکھیں بند کر کے قائم رکھنے کے لئے ہی ہے۔

لیپ پوت کی مذمّت

"بزرگوں کے کام پر تنقید کا صحیح طریقہ،، کے عنوان سے رقمطراز ہیں۔

تمام بزرگانِ دین کے معاملہ میں عموماً اور صحابہ کرام کے معاملہ میں خصوصاً میرا طرزِ عمل یہ ہے کہ جہاں تک کسی معقول تاویل سے یا کسی معتبر روایت کی مدد سے ان کے کسی قول یا عمل کی صحیح تعبیر ممکن ہو اسی کو اختیار کیا جائے اور اس کو غلط قرار دینے کی جسارت اُس وقت تک نہ کی جائے جب تک کہ اس کے سوا چارہ نہ رہے لیکن دوسری طرف میرے نزدیک معقول تاویل کی حدود سے تجاوز کر کے اور لیپ پوت کر کے غلطی کو چھپانا یا غلط کو صحیح بنانے کی کوشش کرنا نہ صرف انصاف اور علمی تحقیق کے خلاف ہے بلکہ میں اسے نقصان دہ بھی سمجھتا ہوں کیونکہ اس طرح

کی کمزور وکالت کسی کو مطمئن نہیں کر سکتی اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صحابہ اور دوسرے بزرگوں کی اصل خوبیوں کے بارے میں جو کچھ ہم کہتے ہیں وہ بھی مشکوک ہو جاتا ہے اس لیے جہاں صاف صاف دن کی روشنی میں ایک چیز علانیہ غلط نظر آرہی ہو وہاں بات بنانے کی بجائے میرے نزدیک سیدھی طرح یہ کہنا چاہیے کہ فلاں بزرگ کا یہ قول یا فعل غلط تھا غلطیاں بڑے بڑے انسانوں سے ہو جاتی ہیں اور ان سے ان کی بڑائی میں کوئی فرق نہیں آتا کیونکہ ان کا مرتبہ ان کے عظیم کاموں کی بنا پر متعین ہوتا ہے نہ کہ ان کی کسی ایک یا دو چار غلطیوں کی بنا پر۔ (خلافت و ملوکیت)

یہ نظریہ مقلدانہ ذہنیت کی پیداوار ہے اس کا تحقیق و انصاف سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے کیونکہ بزرگی کا تعین اعمال سے ہوا کرتا ہے اور بزرگ وہی ہوتا ہے جس کا کردار اس کی بزرگی کا علمبردار ہو ایسا ہرگز نہیں کہ بزرگی پہلے مان لی جائے اور بعد میں اس کے ہر عمل کو اس کی تسلیم کردہ بزرگی کے ماتحت صحیح کرنے کی کوشش کی جائے۔ نیز اگر کردار کے لحاظ سے کسی کی بزرگی مسلّم ہو جائے تو اس کی بزرگی کی بقا کردار کی بقا سے وابستہ رہے گی۔ اسی لئے انسان کے خاتمے کی اچھائی ہی اس کی نجات کا پیش خیمہ قرار دیجاتی ہے۔ پس جس طرح نیک کردار سے انسان بلند مرتبہ اور بزرگ بن جاتا ہے اسی طرح غلط کاریوں اور بدکرداریوں سے وہی انسان پست مرتبہ کی طرف بھی منتقل ہو جاتا ہے۔

سیاست کے میدان میں پھر بھی اس لیپ پوت کی گنجائش ہے کہ جو شخص سیاسی میدان میں ایک دفعہ اپنا نام پیدا کرے وہ بعد میں سیاسی غلطیوں کی بدولت اپنے بلندئ مقام اور عظیم المرتبہ ہونے سے نہیں گرتا اور اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ غلطیاں بڑے بڑوں سے ہو جایا کرتی ہیں لیکن یہ یاد رہے کہ ایسے لوگ عمداً ایسی غلطیاں نہیں کیا کرتے بلکہ وہ اپنی طرف سے اچھا اقدام کرتے ہیں لیکن سیاسی داؤ پیچ یا مدمقابل کے ردِ عمل کی بدولت اُن کا وہ اقدام غلط قرار پاتا ہے ــــــــ دین اور شریعت کے واضح اور صریح مسلک میں اس قسم کے لیپ پوت سے حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں اگر کسی نے نیک کام کرنے کے بعد مقامِ عظیم پیدا کر لیا لیکن انجام کار بدکاریوں اور بدعملیوں میں منہمک ہو گیا تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی بزرگی مسلم ہے اور اس کا مرتبہ اس کے عظیم کاموں کی بنا پر متعین ہے لہٰذا ان سیہ کاریوں سے اس کے مرتبہ اور بزرگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ قرآن مجید نے صاف اعلان فرمایا ہے کہ جن لوگوں کا انجام غلط ہوا ان کے اعمال حبط ہوئے۔ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ پس بزرگی ختم ہوئی۔ اس میں کوئی فرق نہیں کہ وہ صحابی ہو یا کوئی دوسرا۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں۔

میں کسی بزرگ کے کسی کام کو غلط صرف اس وقت کہتا ہوں جب وہ قابلِ اعتماد ذرائع سے ثابت ہو

اور کسی معقول دلیل سے اس کی تاویل نہ کی جا سکتی ہو مگر جب اس شرط کے ساتھ میں جان لیتا ہوں کہ ایک کام غلط ہوا ہے تو میں اسے غلط مان لیتا ہوں پھر اس کام کی حد تک ہی اپنی تنقید کو محدود رکھتا ہوں اور اس غلطی کی وجہ سے میری نگاہ میں نہ اُن بزرگ کی بزرگی میں کوئی فرق آتا ہے نہ اُن کے احترام میں کوئی کمی واقع ہوتی ہے۔ مجھے اس بات کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ جن کو میں بزرگ مانتا ہوں ان کی کھلی کھلی غلطیوں کا انکار کروں۔ لیپ پوت کر کے ان کو چھپاؤں یا غیر معقول تاویلیں کر کے ان کو صحیح ثابت کروں۔ غلط کو صحیح کہنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے معیار بدل جائیں گے اور جو غلطیاں بزرگوں نے اپنی اپنی جگہ الگ الگ کی ہیں وہ سب اکٹھی ہمارے اندر جمع ہو جائیں گی اور لیپ پوت کرنے یا علانیہ نظر آنے والی چیزوں پر پردہ ڈالنے سے میرے نزدیک بات نہیں بنتی بلکہ اور بگڑ جاتی ہے۔ اس سے تو لوگ اس شبہ میں پڑ جائیں گے کہ ہم اپنے بزرگوں کے جو کمالات بیان کرتے ہیں وہ بھی شاید بناوٹی ہوں گے۔ ص ۳۰۷

بے شک منصف مزاج حقیقت طلب تحقیق پسند اور حق جو ارباب عقل و دانش کا نظریہ یہی ہونا چاہیے جو مودودی صاحب نے ذکر فرمایا ہے لیکن جب مذہب کی بنیاد ہی لیپ پوت کے اُصولوں پر قائم ہو اور تحقیق کی آنکھوں پر ابتداء سے پٹی باندھ دی گئی ہو اور چودہ سو برس سے ایک نظریہ کو بلا چون وچرا تسلیم کر کے آنکھیں بند کر لینے کی عادت پڑ چکی ہو۔ ایسی صورت میں راست بازی سے مراد راست گوئی لے کر راست باز کہلانے والے خود فریبی کے جال میں پھنسے ہوئے دانشوروں کو صحیح مشورہ دینا بہت مشکل ہوتا ہے یہ ایسا ہے جس طرح کسی اندرونی مہلک بیماری میں مبتلا مریض جو اپنے حسن ظن یا خود فریبی کے جال میں پھنس کر اپنے آپ کو سو فی صدی تندرست خیال کرتا ہو اُسے کوئی اپنے مرض کے علاج کی دعوت دے وہ بیشک بیماری کا شکوہ کرے گا اور دوسرے بیمار لوگوں کو پُر زور علاج کرانے کا مشورہ دے گا لیکن اپنے علاج کی طرف وہ ملتفت ہی نہ ہوگا بلکہ بیمار کہنے والوں کو ڈانٹ ڈپٹ سے چپ کرانے کی کوشش کرے گا اور اپنے اندر کی خطرناک بیماری کے علائم کو بھی بعض اوقات چھپانے کی کوشش کرے گا بھلا جو بیمار اپنی بیماری کو بیماری نہیں سمجھتا وہ علاج کی طرف متوجہ کیوں ہو۔ اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ جاہل بسیط (جو اپنی جہالت سے خبر دار ہو) کی جہالت رفع ہو سکتی ہے لیکن جاہل مرکب (جو اپنی جہالت سے بے خبر ہو) کی جہالت کا دور ہونا ناممکن ہے۔ مذہب جمہور کی بنیاد ہی لیپ پوت پر ہے اور پہلے دن سے اس کے واجب العمل اُصولوں میں سے یہ طے شدہ بات ہے کہ شیعہ کی بات نہ سنو اور نہ مانو صحابہ کے متعلق جرح و قدح نہ سنو اور نہ مانو اور جن کو بزرگ کہا جا چکا ہے اُن کو ہر ممکن طریقہ سے بزرگ ثابت کرو اور اس پر

کئے جانے والے اعتراضات نہ سنو اور نہ مانو، چنانچہ "خلافت و ملوکیت" کے مطالعہ سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ صحابہ کے متعلق عقیدہ صنٓ تا صنٓ پڑھیے۔ اسی طرح حضرت ابوبکر سے لے کر یزید بن معاویہ تک کے جمہوری حکمرانوں کے متعلق مودودی صاحب کے پیش کردہ مواد کا بنظر غائر جائزہ لیجئے۔ آپ کو یقیناً تحقیق و اجتہاد کے خوشنما لباس میں لیپ پوت کا بدصورت بھوت ڈھانپا ہوا نظر آئے گا۔ سب سے پہلے حضرت ابوبکر کی خلیفہ سازی کے متعلق حضرت عمر کا طرز عمل ملاحظہ کیجئے کہ انہوں نے سقیفہ بنی ساعدہ کی مجلس میں اچانک اٹھ کر حضرت ابوبکر کا نام تجویز کیا اور ہاتھ بڑھا کر فوراً ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ ان کو خلیفہ بنانے کے معاملے میں پہلے کوئی مشورہ نہیں کیا تھا" صہ۹ حاشیہ" اور اپنے اس فعل کے جواز کی تاویل انہوں نے یہ بتائی "کہ اس وقت مخصوص حالات تھے جن میں اچانک حضرت ابوبکر کا نام تجویز کر کے میں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اگر میں ایسا نہ کرتا اور خلافت کا تصفیہ کئے بغیر ہم لوگ مجلس سے اٹھ جاتے تو اندیشہ تھا کہ راتوں رات لوگ کہیں کوئی غلط فیصلہ نہ کر بیٹھیں اور ہمارے لئے اس پر راضی ہونا بھی مشکل ہو اور بدلنا بھی مشکل۔ یہ فعل اگر کامیاب ہوا تو اسے آئندہ کے لئے نظیر نہیں بنایا جا سکتا صہ۹ لیجئے اپنے آخری فقرے میں اپنے طرزِ انتخاب کے غلط ہونے کی طرف اشارہ بھی کر دیا کہ ہم نے اگرچہ غلط طریقہ سے خلیفہ بنا لیا اور کامیاب ہو گئے لیکن آئندہ والوں کے لئے یہ طریقہ ناجائز ہے گویا آپ نے دھونس اور دھاندلی سے منتخب ہونے والے ہر سربراہ مملکت کے لئے عذر بارد کی ایک راہ کھول دی کہ ہر الیکشن جیتنے والا کہہ سکتا ہے ہم نے مخصوص حالات کی بنا پر یہ کھیل کھیلا ہے جو دوسروں کے لئے ناجائز ہے اور حضرت عمر کو جن حالات کا خطرہ تھا کہ راتوں رات کہیں کوئی ایسا قدم اٹھ جاتا جو ہماری نظروں میں غلط ہوتا وہ یہ کہ یا تو سعد بن عبادہ انصاری اپنی جمعیت بڑھا کر اقتدار سنبھال لیتا چنانچہ بقول صاحب تذکرۃ الخواص سقیفہ کے جھگڑے میں انصار نے اسے اپنی طرف سے چن بھی لیا تھا یا حضرت علی بطور امیدوار کھڑے ہو جاتے اور ان کے ذاتی شرف و منزلت کی وجہ سے اکثریت ان کی طرف جھک جاتی جیسا کہ بشیر بن سعد انصاری کا قول قبل ازیں الامامۃ و السیاسۃ سے نقل کیا جا چکا ہے۔

خلافت کے صحیح انعقاد کے لئے حضرت عمر کے نزدیک طریقہ کار یہ ہے کہ اس کو تمام مسلمانوں کے مشورہ سے انتخاب کیا جائے۔ "جس شخص نے مسلمانوں کے مشورے کے بغیر کسی امیر کی بیعت کی اس کی کوئی بیعت نہیں اور نہ اس شخص کی کوئی بیعت ہے جس سے اس نے بیعت کی ایک اور روایت میں حضرت عمر کے الفاظ یہ بھی آئے ہیں کہ جس شخص کو مسلمانوں کے مشورے کے بغیر امارت دی جائے

اس کے لئے اس کا قبول کرنا حلال نہیں ہے (ص۸۵ حاشیہ)

پس حضرت عمر کے نظریۂ انعقادِ خلافت اور ان کے ذاتی فعل میں صاف تضاد ہے ان کے اپنے نظریے کے ماتحت نہ ان کی بیعت بیعت ہے اور نہ اس کا قبول کرنا حضرت ابوبکر کے لئے حلال۔ اسی طرح مودودی صاحب نے بھی جمہوری خلافت کا یہی نظریہ پیش کیا ہے "کہ یہ ایک انتخابی منصب ہے جسے مسلمانوں کے باہمی مشورے اور ان کی آزادانہ رضامندی سے قائم ہونا چاہیئے ص۸۶ پس ان کے اپنے تجویز کردہ قانون کے رُو سے خلافت کی عالی شان عمارت دھڑام سے نیچے گر گئی۔ باقی رہی دھکا شاہی اور دھینگا مشتی تو اس کو کون روک سکتا ہے اور اقتدار قائم ہو جانے کے بعد متدین صحابہ رسول ص کا خاموشی اختیار کر لینا یا ہاں میں ہاں ملا لینا وہ اسلامی وقار کے پیش نظر تھا اور اسی بنا پر حضرت علی علیہ السلام اپنی پوری جماعت کے ساتھ قائم شدہ حکومت کے ماتحت وفادار شہری کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے رہے۔ اور اسلام کے وقار کے پیش نظر حکومتِ وقت سے (جو اسلامی حکومت کے نام سے موسوم تھی) پورا پورا تعاون کرتے رہے۔

اور مودودی صاحب کا یہ کہنا کہ " مدینے کے تمام لوگوں نے کسی دباؤ یا لالچ کے بغیر خود اپنی رضا و رغبت سے انہیں پسند کر کے ان کے ہاتھ پر بیعت کی ص۸۳" یہ حق و انصاف کا خون ہے۔ اور حقائق و واقعات سے رو گردانی ہے بلکہ یہ وہی لیپ پوت کا ناگزیر حربہ ہے جسے ہر کامیاب ہونے والا الیکشن جیتنے کے بعد اختیار کر لیا کرتا ہے۔ "گذشتہ صفحات میں خلافتی الیکشن میں دھاندلیوں کا انکشاف کیا جا چکا ہے۔"

علانیہ اختلاف کرنے والوں میں سے حضرت زبیر ہیں جنہوں نے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا تھا کہ میں سوائے علی کے کسی اور کی بیعت نہ کروں گا حضرت عباس نے بھی یہی اعلان کیا تھا۔ سعد نے الیکشن لڑنے کا اعلان کر دیا۔ اور حضرت عمر نے ان کے متعلق کہہ دیا تھا کہ اس کو قتل کر دو۔ خدا اس کو قتل کرے۔ حضرت سلمان فارسی نے انکار کیا تو اس کی گردن پر گھونسے مارے گئے ابوسفیان نے صاف انکار کیا اور بنی ہاشم نے چھ ماہ تک بیعت نہ کی (تذکرۃ الخواص سبط بن الجوزی) سعد بن عبادہ انصاری اور ابوسفیان کے انکار کو مودودی صاحب نے قبائلی عصبیت کا نتیجہ قرار دیا ہے ص۹۰ حضرت علی ع نے بیعت سے صاف انکار کیا اور جناب فاطمہ بنت رسول ص نے بھی صاف انکار کے علاوہ قطع تعلقی اور قطع کلامی بھی کر لی (الامامۃ والسیاسۃ) اور مودودی صاحب نے ان تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر ان میں سے کسی بزرگ کے اختلاف کا نام تک نہیں لیا تاکہ لیپ پوت سے کام نکالا جا سکے۔

اس کے بعد حضرت ابوبکر نے مسلمانوں سے مشورہ کئے بغیر حضرت عمر کو نامزد کر لیا اور لوگوں کو

بعیت کے لئے حکم دے دیا۔ اور مودودی صاحب کے طے کردہ منشورِ خلافت کی رو سے یہ بات آئینی نہیں تھی۔ کیونکہ کسی ایک شخص کو کوئی حق حاصل نہیں کہ تمام اُمّت کے اختیارات کو اپنے اندر مرکوز کر کے کسی کو نامزد کر دے چنانچہ مودودی صاحب نے صہ ۸۴ پر حضرت عمر کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے ایک شخص سے اس قسم کی بات سنی کہ ان کے مرنے کے بعد میں فلاں کو نامزد کر کے بعیت کر لوں گا،، تو حضرت عمر نے واپس مدینہ میں پہنچ کر برسرِ عام اس طرزِ عمل کی تردید کی لیکن ہر مقام پر راست بازی راست گوئی کے معنی تنگ ہی محدود ہے۔ حضرت ابوبکر نے نامزد کر دیا اور ان کے اقتدار کے ہوتے ہوئے کس کو مجالِ انکار تھی پس بعیت ہوگئی اور جمہوری خلافت کی راہ میں دوسرا سنگ میل نصب کر دیا گیا۔

اس کے بعد حضرت عمر نے پُوری اُمت کے اختیاراتِ خلافت اپنے اندر جذب کر کے اپنی منشا کے چھ آدمیوں میں بند کر دیئے حالانکہ آئینی طور پر ان کو اس امر کا کوئی اختیار حاصل نہ تھا اور اس کے بعد حضرت عثمان کے متعلق ان کو پورا خدشہ تھا ،، کہ اگر میں ان کو اپنا جانشین تجویز کروں تو وہ بنی امیہ کو لوگوں کی گردنوں پر مسلط کر دیں گے اور وہ لوگوں میں اللہ کی نافرمانی کریں گے۔ خدا کی قسم اگر میں نے ایسا کیا تو عثمان یہی کریں گے ،، صہ ۹۹۔ نیز سعد بن ابی وقاص کے متعلق بھی ان کو یہی خطرہ لاحق تھا تاہم شوریٰ میں بعض مصلحتوں کی بنا پر ان کو شامل کرنا ضروری سمجھا گیا اور چھ آدمیوں کے ذہنی نتیجہ کو لاکھوں بلکہ کروڑوں فرزندانِ اسلام کے لئے واجب العمل قرار دیا گیا۔

حضرت عثمان نے اپنے پہلے خطبے میں بیان دیا تھا۔

ایک یہ کہ میری خلافت سے پہلے تم نے باہمی اتفاق سے جو قاعدے اور طریقے مقرر کئے تھے ان کی پیروی کروں گا۔ دوسرے یہ کہ جن معاملات میں پہلے کوئی قاعدہ مقرر نہیں ہوا ہے ان میں سب کے مشورے سے اہل خیر کا طریقہ مقرر کر دوں گا۔ صہ ۹۳

چھ آدمیوں کی انتخابی مشورے کے لئے انہوں (حضرت عمر) نے جو ہدایات چھوڑیں، ان میں دوسری باتوں کے ساتھ ایک بات یہ بھی شامل تھی کہ منتخب خلیفہ اس امر کا پابند رہے کہ وہ اپنے قبیلے کے ساتھ کوئی امتیازی برتاؤ نہ کرے گا مگر بدقسمتی سے خلیفہ ثالث حضرت عثمان اس معاملہ میں معیارِ مطلوب کو قائم نہ رکھ سکے۔ صہ ۹۹۔

اب جمہور اہل اسلام مجبور ہیں کہ از راہِ عقل و نقل خلافت کی جو راہ متعین کرتے ہیں ان کے تجویز کردہ خلفا پہلے قدم سے ہی اس راہ سے منحرف ہیں لیپ پوت سے کام لے کر ایک طرف ان کی حکومت کو اسلامی حکومت کا نام دینا ہے اور دوسری طرف مذہب کی تشکیل بھی انہی خطوط پر

کرنی ہے جو ان کے نزدیک ان کے اسلامی خلیفوں نے تجویز کئے ہیں لہذا لیپ ولپوت کر کے متضاد
افکار کو نہ اپنائیں تو کیا کریں؟ اور صحابہ کے متعلق خلافت و ملوکیت کے ص۳۰۱ و ص۳۰۲ پر جس نظریے کا
اظہار کیا گیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ ان کی غلطیوں کو اُس وقت تک ہم غلطی نہ کہیں گے جب تک ان
کی کوئی تاویل کی جاسکتی ہو اور جہاں دن کی روشنی میں ان کی غلطی نظر آ رہی ہو تو اُس کو غلط کہے بغیر چارہ
نہیں اس کا دوسرے لفظوں میں معنی یہ ہوا کہ ان کی غلطیوں کو اولاً تو ہم لیپ پوت کے غلاف میں چھپانے
کی کوشش کریں گے اور جہاں لیپ پوت کا دروازہ بند ہو جائے کہ ان کی غلطی روز روشن کی طرح واضح
ہو جائے تو ہم لیپ پوت کی بجائے ان کی غلطی کو غلطی کہہ دیں گے۔ اس تحقیق کے صدقے اور اس جرأت
کے قربان۔ کہ جب غلطی اس قدر واضح ہو کہ تاویل کا امکان نہ رہے تو ہم لیپ پوت نہیں کرتے بلکہ علانیہ اس
کو غلط کہہ دیتے ہیں اور لُطف یہ کہ حضرت عثمان کی جن غلطیوں کو وہ تاویل اور لیپ پوت کے دامن میں
چھپانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ "خویش نوازی" نہ تھی بلکہ "صلہ رحمی" تھی" یہ نیت کی غلطی نہ تھی بلکہ رائے کی
غلطی یا بالفاظِ دیگر اجتہادی غلطی تھی" ص۳۲۱ صحابیوں۔ صحابی زادوں۔ اکابر صحابہ حتیٰ کہ طلحہ و زبیر و عائشہ بلکہ
چار آدمیوں کے علاوہ تمام اہلِ مدینہ کے نزدیک حضرت عثمان کی غلطیاں اس طرح روز روشن کی طرح عیاں
تھیں کہ ان کے لئے لیپ پوت کی گنجائش تک نہ رہی ورنہ وہ ضرور ان کی جائز تاویل کر کے خلیفۂ مقتول کی
حمایت میں زبان کھولتے جس طرح کہ ص۳۲۹ تا ص۳۳۲ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے اور اگر ان غلطیوں کے
لئے کوئی صحیح راستہ تجویز کیا جاسکتا تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا قرب زمانۂ پیغمبر کے مسلمانوں میں اس قدر
ایمانی اور دینی کمزوری پیدا ہو گئی تھی کہ وہ تاویل کئے بغیر شورشیوں کے ہمنوا ہو گئے حتیٰ کہ مدینہ منورہ میں اچھی
خاصی تعداد ان کے ہم خیالوں کی ہو گئی ص۳۳۵۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عثمان کی غلطیاں تو اس قدر واضح
تھیں کہ اور تو اور اس کی بیوی نائلہ کے لئے بھی تاویل کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی جس کا مودودی صاحب
نے ص۱۱۶ پر اعتراف کیا ہے۔

مذہب جمہور میں تو اس لیپ پوت کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ وہ مودودی صاحب سے عثمان
کی طرف اجتہادی غلطی کو منسوب کرنے پہ بھی سخت خفا ہیں حالانکہ انہوں نے اپنی جانب سے کافی بچ بچاؤ
کر کے لکھا ہے۔

اور عثمان کے بعد والے لوگوں کے متعلق لیپ پوت کر کے ان کی اغلاط کی پردہ پوشی مذہب جمہور
میں ایک فرض سے کم حیثیت نہیں رکھتی اگرچہ وہ اپنے مقام پر صرف بعید از عقل ہی نہیں بلکہ مضحکہ خیز بھی
ہیں لیکن جب مذہب کی بنیاد ہی اسی لیپ پوت پر ہے تو اس کے علاوہ اور چارہ ہی کیا ہے؟ دیکھئے

حضرت عائشہ جنگ جمل میں حضرت علی کے مخالف گروپ کی اصل قائد ہیں ص۱۲۹ وص۱۳۱ اسی طرح طلحہ و زبیر حضرت علی کے مخالف گروپ کے صرف حامی ہی نہیں بلکہ قافلہ سالاروں میں سے ہیں اور معاویہ ساری زندگی حضرت علی سے نبرد آزما رہا اور عمرو عاص اس کا دستِ راست بنا رہا۔ اسی طرح بہت سے صحابہ کی یہی حالت ہے مذہبِ جمہور کی رُو سے علی حق پر بھی ہے لیکن دوسرے فریق کو بھی بُرا کہنا گوارا نہیں جناب مودودی صاحب عقیدہ طحاویہ سے مسلکِ جمہور اہل سنّت یہ نقل کرتے ہیں۔

ہم رسول اللہ کے تمام اصحاب کو محبوب رکھتے ہیں ان میں سے کسی کی محبت میں حد سے نہیں گزرتے اور نہ کسی سے تبری کرتے ہیں ان سے بغض رکھنے والے اور بُرائی کے ساتھ ان کا ذکر کرنے والے کو ہم ناپسند کرتے ہیں اور ان کا ذکر بھلائی کے سوا اور کسی طرح نہیں کرتے اگرچہ صحابہ کی خانہ جنگی کے بارے میں امام ابوحنیفہ نے اپنی رائے ظاہر کرنے سے دریغ نہیں کیا ہے چنانچہ وہ صاف طور پر یہ کہتے ہیں کہ حضرت علی کی جن لوگوں سے بھی جنگ ہوئی (اور ظاہر ہے کہ اس میں جنگ جمل وصفین کے شرکاء شامل ہیں، ان کے مقابلہ میں علی زیادہ برسرِ حق تھے، لیکن وہ دوسرے فریق کو مطعون کرنے سے قطعی پرہیز کرتے ہیں" ص۲۳۳۔

یہ بھی امرِ واقعہ ہے کہ تمام فقہاء و محدثین و مفسرین نے بالاتفاق حضرت علی کی ان لڑائیوں کو جو آپ نے اصحابِ جمل اصحابِ صفین اور خوارج سے لڑیں قرآن مجید کی آیت فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ کے تحت حق بجانب ٹھہرایا ہے کیونکہ ان کے نزدیک آپ امام اہل عدل تھے اور آپ کے خلاف خروج جائز نہ تھا۔ میرے خیال میں کوئی ایک بھی فقیہ یا محدث یا مفسر ایسا نہیں ہے جس نے اس سے مختلف کوئی رائے ظاہر کی ہو خصوصیت کے ساتھ علمائے حنفیہ نے تو بالاتفاق یہ کہا ہے کہ ان ساری لڑائیوں میں حق حضرت علی کے ساتھ تھا اور ان کے خلاف جنگ کرنے والے بغاوت کے مرتکب تھے ص۳۳۸

انہوں نے ذکر کیا ہے کہ صاحب ہدایہ نے معاویہ کو سلطانِ جائر قرار دیا ہے چنانچہ وہ سلطانِ جور کی طرف سے عہدہ قبول کرنے کے جواز میں بطور استدلال لکھتے ہیں۔

سلطانِ جائر سے عہدہ قضا قبول کرنا اسی طرح جائز ہے جس طرح سلطان عادل سے قبول کرنا جائز ہے کیونکہ صحابہؓ نے حضرت معاویہؓ کی طرف سے عہدہ قضا قبول کیا تھا حالانکہ اپنی خلافت کی نوبت آنے پر حق حضرت علی کے ہاتھ میں تھا۔ ص۳۳۸

علامہ ابن ہمام کا قول اس بارے میں فتح القدیر سے یہ نقل کیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ حق حضرت علی ہی کے ساتھ تھا کیونکہ اپنی نوبت آنے پر وہ صحیح بیعت سے خلیفہ مقرر ہوئے تھے اور ان کی خلافت منعقد ہو چکی تھی ۔ لہٰذا اہل جمل کے خلاف اور صفین کے مقام پر حضرت معاویہ کے خلاف لڑائی میں وہ حق پر تھے مزید برآں رسول اللہ صلعم کا حضرت عمار رضؓ کے بارے میں یہ ارشاد کہ تم کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا ۔ اس معاملہ میں بالکل صریح ہے کہ حضرت معاویہ کے ساتھی باغی تھے کیونکہ حضرت عمار کو انہی نے قتل کیا تھا ص ۳۳۹

اب جمہور کے اس مسلمہ عقیدہ (کہ ہم رسول اللہ کے تمام اصحاب کو محبوب رکھتے ہیں الخ) نے متضاد نظریوں کو قبول کرنے پر مجبور کر دیا ہے کہ تحقیق کی رو سے علی کو حق پر کہنا ضروری ہے اُن کے مخالف کو باطل پر بھی کہنا ہے لیکن تقلید کی رُو سے اہلِ حق سے بھی محبت کرنی ہے اور اہلِ باطل سے بھی محبت کرنی ہے بنا بریں لیپ پوت کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ پس جنگ جمل میں طلحہ و زبیر و عائشہ کی مخالفت کو اجتہادی غلطی قرار دے دیا ص ۳۴۱۔ معاویہ کی غلطی کو غلطی قرار دیا لیکن اس کو موجب فسق نہیں سمجھا اس لئے کہ انہوں نے تاویل کی بنا پر کیا تھا ص ۳۴۱ اور عمرو عاص کی غلطی کو محض غلطی تسلیم کیا۔ بہر حال تمام صحابہ سے محبت کے فریضے نے جمہور اہل اسلام کے لئے مستقل الجھن پیدا کر دی ۔

بنا بریں حضرت عثمان سے محبت ہے کیونکہ صحابی رسول ہے اور عمرو بن الحمق (جو عثمان کے قاتلین میں سے ہے) سے بھی صحابی رسول ہونے کی بنا پر محبت واجب ہے ۔

طلحہ و زبیر و عائشہ سے عقیدتمندی بھی ضروری ہے اگرچہ وہ خلافِ حق تھے اور حضرت علی سے بھی محبت ہے کیونکہ وہ برحق چوتھے مقام پر خلیفہ تھے ۔

طرفین سے جو ہزاروں کی تعداد میں قتل ہو گئے (جن میں صحابہ بھی تھے اور غیر صحابہ بھی تھے) وہ بھی جنت کے مستحق ہیں اور حق و ناحق کی دو طرفی فوجیں بھی جنت کی مستحق ہیں جن کے ہاتھوں وہ قتل ہوئے ۔

لُطف یہ کہ غصّہ تو حضرت علی پر تھا جنہوں نے قتلِ عثمان کے بعد اقتدار کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی یا اُن شورشیوں پر جنہوں نے مدینہ میں عثمان کو قتل کر دیا تھا لیکن طلحہ و زبیر و عائشہ نے فوجیں اکٹھی کر کے انتقام لے لیا۔ بصرہ کے بے گناہ مسلمانوں سے جنہوں نے قتلِ عثمان کا نام ہی ان ہی لوگوں کی زبانی سنا تھا نہ وہ شریک قتل اور نہ سازش میں ان کا حصہ تھا۔ حضرت عائشہ جو فوج کی کمان کر رہی تھی (خلافت و ملوکیت ص ۱۳۱) نے بصرہ کے حاکم عثمان بن حنیف صحابی رسوؐل کو بے گناہ قید کر لیا اور اس کو چالیس کوڑوں کی سزا دی اور اس کی ڈاڑھی کے بال نوچوا ڈالے اور ستر بے گناہ مسلمانوں کو قتل کرا دیا (تذکرۃ الخواص سبط ابن الجوزی) لیکن جمہوری عقیدہ کی رُو سے قاتل و مقتول دونو کو جنتی بھی ماننا ہے اور دونو (حق و باطل) سے محبت بھی

کرنا ضروری ہے۔

حضرت عائشہ اور طلحہ و زبیر کے متعلق یہ بہانا سادھ لیا جاتا ہے کہ انہوں نے توبہ کر لی تھی۔ ص۳۴۲
لیکن قابل غور امر یہ ہے کہ کیا قتل جیسے سنگین جرم کے لئے زبان سے توبہ توبہ کر لینا کافی ہے۔ اور پھر ایک دو نہیں ہزاروں مومنوں بلکہ صحابیوں کا بے گناہ قتل۔ اسی طرح جنگ صفین میں حق (حضرت علی) اور ناحق (معاویہ و عمر و عاص) ہر دو طرف سے ہزاروں جانیں تلف ہوئیں اور عمار بن یاسر اور اویس قرنی جیسے محبوب رسولؐ مارے گئے لیکن قاتل و مقتول دونوں سے محبت میں فرق نہیں آتا۔ اور نہ ان بے گناہ ہزاروں مومنین کے قتل سے ان کی بزرگی میں کوئی کمی آتی ہے اور نہ احترام میں فرق آتا ہے۔ حجر بن عدی جیسے عابد و زاہد صحابی کو قتل کیا گیا ص۱۱۵ لیکن نہ بزرگی ٹوٹی اور نہ احترام میں کمی ہوئی اور پھر منبروں پر حضرت علی اور اولادِ علی کو سب و شتم کیا اور کرایا گیا ص۱۱۷ لیکن ہر دو فریق (حق و ناحق) کے احترام و بزرگی میں قطعاً فرق نمودار نہیں ہوا۔ سیاسی اغراض کی خاطر شریعت کی حدیں توڑنے کی ابتدا معاویہ سے ہوئی لیکن شریعت سے بھی محبت ہے اور شریعت کی حدوں کو توڑنے والے کی محبت و احترام میں بھی کمی نہیں یہ ہے لیپ پوت کے سائے میں تحقیق کا مآل۔

مذہب جمہور کی پالیسی

بہر حال مذہب جمہور چونکہ ابتداء سے برسر اقتدار طبقہ سے متعلق ہے لہذا حکمران جماعت کے زیرِ اثر مذہب کی داغ بیل ایسی مہارت سے ڈالی گئی کہ آنے والی نسلیں نہ اسے ٹھکرا سکیں اور نہ قبول کر سکیں۔ بس لیپ پوت کرتے ہوئے آنکھیں بند کر کے آبائی تقلید پر قائم رہیں۔ اگر ذرا بھر کسی نے تنقیدی قدم اٹھایا تو فوراً اس پر شیعیت کا الزام لگا کر اسے تحقیقی میدان میں قدم رکھنے کی جرأت سے محروم کر دیا گیا۔ بے چارے مودودی صاحب نے رکھ رکھاؤ اور کافی لیپ پوت کے باوجود جب کبھی تقلیدی نظریے سے نکلنے کی بعض جگہ جرأت کی تو اُسے اکثریت اور جمہوریت کی لاج رکھنے کی دہائی دی گئی اور فوراً ملک بھر سے اُسے شیعہ نواز اور حضرت علی کا وکیل قرار دیا گیا۔

مسند اقتدار کی طرف سے شروع ہی سے یہ حربہ استعمال کیا جانے لگا ہے چنانچہ پہلی تین حکومتوں میں تو اس قدر شدت نہیں تھی لیکن معاویہ نے تو ہر جمعہ و عید کے خطبات میں اور دوسری عام تقاریر میں مقررین و واعظین کے لئے لازم قرار دیا تھا کہ حضرت علی اور اولادِ علی اور ان کے ماننے والوں پر سب و شتم کی بوچھاڑ کی جائے اور ان کے متعلق ہر ممکن طریقہ سے لوگوں کو متنفر کرنے کی کوشش کی

جائے تاکہ کبھی لوگ ان کی محبت تو در کنار ان کی طرف میلان کی جرأت بھی نہ کرسکیں۔ اس میں ذرا بھر شک کرنے کی گنجائش نہیں کہ لیپ پوت کی پالیسی کی کامیابی کا راز اس میں مضمر ہے کہ ناقدین کی زبانوں پر قفل لگائے جائیں اور حکومتی نظریے کے خلاف اختلاف رائے کا سختی سے سد باب کیا جائے اور اس کے لئے چار طریقے ہو سکتے ہیں اور ہر زمانہ کے جمہوری ڈکٹیٹر حکمران انہی ذرائع کو استعمال کیا کرتے ہیں۔

(۱) حزب اقتدار اور جمہوری حکمرانوں کی تعریف اور ان کے محامد ومناقب کی نشر واشاعت اور ان کے عیوب کی پردہ پوشی۔

(۲) لیپ پوت کے ذرائع کی توسیع کرنے والوں اور حزب اقتدار کی خوشنودی حاصل کرنیوالوں پر انعام واکرام کی بوچھاڑ۔

(۳) حزب اختلاف اور ناقدین کی مذمت اور ان کے نقائص وعیوب کی نشر واشاعت اور ان کے فضائل کی پردہ پوشی۔

(۴) تنقید کرنے والوں اور اختلاف رائے رکھنے والوں کے لئے سخت ترین سزائیں۔

پہلا اور دوسرا طریقہ جمہوری حکمرانوں اور ان کی پارٹی کی تعریفیں اس قدر بیان کی گئیں کہ صرف نطاق تحریر میں ہی ان کا سمانا مشکل نہیں بلکہ نطاقِ عقل وفہم بھی اس سے قاصر ہے حتیٰ کہ جمہور کے بالغ النظر تحقیق پسند حضرات بھی ان کی معقولیت ثابت کرنے کے لئے لیپ پوت سے کام نکالنے پر مجبور ہیں۔ دیکھیے جناب مودودی صاحب نے الصحابہ کلھم عدول اجمعین کی نسبت رسول اللہؐ کی طرف دی گئی ہے، کی تصحیح میں کس قدر سہل انگاری بلکہ حقیقت پوشی سے کام لے کر لیپ پوت کیا ہے عدول کا معنی راست باز اور پھر راست باز سے مراد راست گو (نہ راست خو) لیا اور تمام صحابہ سے محبت کرنے کا فریضہ عقیدہ بنا کر مسندِ تحقیق پر بیٹھ گئے ص ۳۰۳۔

آیئے صحابہ کی راست بازی بمعنی راست گوئی مودودی صاحب کی زبانی سنیئے۔ ولید بن عقبہ صحابیٔ رسول جس کو آپ نے بنی المصطلق کے صدقات کی وصولی پر مامور فرمایا واپس آکر اس نے جھوٹی رپورٹ دے دی کہ وہ انکاری ہیں آپ نے ان کے خلاف ایک فوجی مہم روانہ کردی جب ان کو پتہ چلا تو ان کے سرداروں نے مدینہ میں پہنچ کر حضور سے عرض کی کہ یہ صاحب تو ہمارے پاس آئے ہی نہیں ہم تو منتظر ہی رہے کہ کوئی آکر ہم سے زکوٰۃ وصول کرلے پس یہ آیت اتری اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ الخ (الحجرات ۶) قرآن مجید کی رو سے یہ صحابی جھوٹا اور فاسق قرار دیا گیا اس کے بعد حضور کا اس پر کوئی اعتماد نہ رہا پس کوئی سرکاری کام اس کے سپرد نہ فرمایا لیکن حضور کے بعد ابوبکر وعمر نے اس کو اعتماد

میں لے لیا پھر حضرت عمر نے اس کو بنی تغلب کا عامل مقرر کر دیا اور عثمان نے اس کو کوفہ کا گورنر بنا دیا" وہاں یہ راز فاش ہوا کہ یہ شراب نوشی کے عادی ہیں" حتی کہ ایک روز انہوں نے صبح کی نماز چار رکعت پڑھائی اور پھر پلٹ کر لوگوں سے پوچھا" اور پڑھاوں ؟ صنہ۱۱۲ ۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں ہم لیپ پوت سے کسی کی روز روشن کی طرح واضح ہونے والی غلطی کو نہیں چھپاتے ۔ بھلا جس شخص کو قرآن مجید نے فاسق کہا ہے کیا وہ روز روشن کی طرح واضح طور پر فاسق نہیں جب قرآن نے اس پر اعتماد کرنے سے روکا ہے اور رسول اللہ نے عملاً اس کے اعتماد سے دست کشی کی ہے ۔ تو اس شخص پر اعتماد کرنا کہاں تک روا تھا ؟ لیکن چونکہ حکمرانوں کا عمل صریح طور پر قرآن و رسول کے خلاف تھا ۔ اس لئے لیپ پوت کے ذریعے سے مودودی صاحب نے یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ ویسے تو نیک اور قابل اعتماد تھا عامل اور گورنر بننے کی صلاحیت رکھتا تھا البتہ کوفے کی گورنری کے دوران میں اس کے متعلق شراب نوشی کے عادی ہونے کا راز منکشف ہوا نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی بے شک جھوٹ بولتا ہو شراب کا عادی ہو ۔ لیکن کلھم عدول کے مفروضہ کے ماتحت اس کو راست باز بھی ماننا ہے بزرگ بھی کہنا ہے اور اس کے احترام میں باوجود کذاب و شرابی ہونے کے کمی کرنا بھی جمہوری آبائی عقیدے کے منافی ہے ۔

آیئے مسعودی سے حضرت طلحہ و زبیر کی راست بازی سنئے (مسعودی بقول مودودی شیعہ نہیں بلکہ سنی معتزلی ہے صنہ۲۱۳) بصرہ کی طرف جنگ جمل کا فتنہ برپا کرنے کے لئے جب جا رہے تھے تو راستہ میں ایک مقام سے گذرے اور وہاں کے کتے ان کی طرف بھونکے (حضرت عائشہ نے رسول اللہ سے سنا تھا کہ میری بیویوں میں سے ایک علی کے ساتھ جنگ کرے گی حالانکہ وہ ناحق ہو گی اور علی حق پر ہوں گے اس کی نشانی یہ ہے کہ اس کو مقام حواب کے کتے بھونکیں گے) حضرت عائشہ نے دریافت کیا کہ اس مقام کا نام کیا ہے تو بتایا گیا کہ یہ حواب ہے ۔ تو عائشہ نے آگے جانے سے انکار کر دیا چونکہ طلحہ و زبیر کے لئے اپنے سوچے سمجھے منصوبے میں کامیابی حضرت عائشہ کے بغیر ناممکن تھی پس اُنہوں نے بستی والوں سے کہلوایا کہ یہ حواب نہیں ہے ۔ پس وہاں کے پچاس معززین نے قسم کھا کر جھوٹی گواہی دی تب حضرت عائشہ نے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا ۔ (مروج الذہب ج ۲ صنہ)

اس قسم کی اور احادیث بھی رسولؐ اللہ کی طرف منسوب ہیں جو لیپ پوت کے جواز کی سند قرار دی جا سکتی ہیں ۔

(۱) خیر القرون قرنی الخ یعنی سب زمانوں سے میرا زمانہ اچھا ہے (یعنی میرے ہمعصر اور میرے صحابہ اچھے لوگ ہیں ۔)

(۲) صحابی کالنجوم الخ ۔ میرے صحابہ ستارگان سما کی طرح ہیں جس کی اقتدا کرو گے

ہدایت پاؤگے۔

شرح عقائد نسفی میں علامہ تفتازانی نے اسی ضمن میں کئی احادیث نقل کی ہیں۔ ص ۱۱۶ مطبع مجتبائی دہلی۔

(۳) لَا تَسُبُّوا اَصْحَابِیْ۔ میرے صحابہ کو سب نہ کرو کیونکہ تم میں سے کوئی شخص کوہِ اُحد کے برابر سونا راہِ خدا میں خرچ کردے تو ایک صحابی کا مرتبہ نہیں پا سکتا۔

(۴) اَکْرِمُوا اَصْحَابِیْ فَاِنَّھُمْ خَیْرُکُمْ۔ میرے تمام صحابہ کا اکرام کرو کہ یہ تم سے بہتر ہیں۔

(۵) لَا تَتَّخِذُوْھُمْ غَرَضًا۔ الخ۔ ان کو تنقید کا نشانہ نہ بناؤ میرے بعد کیونکہ جس نے ان سے محبّت کی وہ میری محبّت سے ہے اور جس نے ان سے عداوت کی وہ میری عداوت سے ہے۔ جس نے ان کو تکلیف دی اُس نے مجھے تکلیف دی اور جس نے مجھے تکلیف پہنچائی اُس نے اللہ کو اذیت دی اور خدا اس کی گرفت کرے گا۔

اور ان عمومی روایات کے علاوہ حکمرانوں کے حق میں تو اس قدر فضائل و مناقب کی بھرمار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضور کو سوائے ان لوگوں کی تعریف و خوشامد کے اور کوئی کام ہی نہ تھا ذرا انہی پیش کردہ حدیثوں کو ملاحظہ فرمائیے۔ یہ سب لیپ پوت کی سند نہیں تو اور کیا ہے؟ اور ان کا مقصد یہ ہے کہ حضور کے صحابہ اچھا کریں یا بُرا وہ ہر قسم کی تنقید سے بالاتر ہیں اور ہر حال میں لائق احترام اور واجب الاطاعت ہیں۔ کیا دنیا کا کوئی معقول آدمی منصف انسان یا کوئی مہذب معاشرہ کسی ملت کے ان بنیادی اُصولوں کو دیکھ کر اُسے معقولیت کی سند دے سکتا ہے اور پھر صحابہ کے درمیان بے حساب منازعات و مشاجرات بلکہ بعض ہوشربا انسانیت سوز واقعات پر نظر ڈالنے سے تو ان مفروضہ حدیثوں کی بالکل قلعی کھل جاتی ہے۔ اور صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ کھیل صرف برسرِ اقتدار طبقہ کی حکومت کو شرعی حیثیت دینے کے لئے کھیلا گیا ہے تاکہ مذہب جمہور کو بلا سند نہ قرار دیا جا سکے۔ پس اسی قسم کی احادیث کو نشر کرنے والے لوگ حکمران طبقہ کے محبوب بنتے رہے۔ اور وہ عطیات و جوائز اور انعام و اکرام کے مستحق قرار پاتے رہے۔ اور ان کے خلاف جس نے زبان کھولی یا تنقید کا پہلو جس نے اختیار کیا اُسے اسلام دشمنی کی سند دی گئی اور ہر قسم کے عذاب میں اس کو مبتلا کیا گیا۔ جانیں تلف کی گئیں۔ قید و بند کی صعوبتوں میں انہیں رکھا گیا۔ گھر لوٹے گئے اور ان کے بچوں اور عورتوں تک کو معاف نہ کیا گیا اور شیعیان علی پر اس ظلم کی باقاعدہ ابتداء معاویہ کے دَور سے ہوئی۔ اور کافی عرصہ تک یہ صورتِ حال باقی رہی جس کا مختصر سا اشارہ خلافت و

ملوکیت میں ہوا ہے۔ ص۱۶۴ و ص۱۶۵ اور معاویہ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے صریح احکام کی خلاف ورزی کا مرتکب تھا لیکن جمہوری مذہب میں لیپ پوت کرکے اس کے احترام اور بزرگی کو برقرار رکھنا ضروری سمجھا گیا اور جو بھی اس کے خلاف زبان کھولے وہ اسلام کا دشمن اور گردن زدنی قرار دیا گیا۔ حدیث سازی کی مہم اور حضرت معاویہ کا طرز عمل ہماری کتاب "اسلامی سیاست" میں ملاحظہ ہو۔

تیسرا اور چوتھا طریقہ چنانچہ مودودی صاحب خود اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

ایک اور نہایت مکروہ بدعت جو حضرت معاویہ کے عہد میں شروع ہوئی کہ وہ خود اور ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر خطبوں میں بر سر منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے حتیٰ کہ مسجد نبوی میں منبر رسول پر عین روضہ نبوی کے سامنے حضور کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دی جاتی تھیں اور حضرت علی کی اولاد اور ان کے قریب ترین رشتہ دار اپنے کانوں سے گالیاں سنتے تھے" ص۱۷۴۔

عمر بن عبد العزیز جب تخت حکومت پر متمکن ہوا تو اس نے جہاں اور کافی اصلاحات نافذ کیں وہاں سنہ ۱۰۱ھ میں تقریباً یہ بدعت بھی ختم کرائی اور تذکرۃ الخواص ص۵۳ میں علامہ سبط بن الجوزی نے خلافت علی کے باب میں ذکر کیا ہے کہ "ایک ہزار مہینے تک منبر پر حضرت علی پر لعنت کی گئی اور یہ معاویہ کے حکم سے ہی تھا" اور معاویہ کی اسلام دشمنی تو اس قدر واضح تھی کہ سنت رسول اللہ کا قطعاً اس کے دل میں کوئی وقار نہ تھا۔ چنانچہ جنگ صفین کی طرف روانہ ہوتے ہوئے اس نے نماز جمعہ پیشگی بروز بدھ پڑھا ڈالی اور کسی نے اعتراض کرنے کی جرأت تک نہ کی اور جنگ صفین سے واپسی پر حضرت علی کی رعایا میں سے ایک شخص اونٹ پر سوار دمشق جا پہنچا تو کسی شامی نے اسے پکڑ لیا اور کہا یہ میری اونٹنی ہے جو تو نے جنگ صفین کے دوران حاصل کی تھی۔ آخر مقدمہ معاویہ کے پیش ہوا۔ تو شامی نے پچاس گواہ پیش کر دئے۔ جنہوں نے شہادت دی کہ یہ اونٹنی اسی شامی کی ہے پس اس کے حق میں فیصلہ ہو گیا اور اونٹ کے مالک کو خارج کیا گیا۔ اُس نے لاکھ سمجھایا کہ جناب عالی کم از کم آپ خود ملاحظہ فرمائیں کہ آیا یہ اونٹ ہے یا اونٹنی؟ تو معاویہ نے کہا کہ بس جو فیصلہ ہونا تھا ہو گیا۔ اس کے بعد اس شخص کو بیت المال سے اونٹ کی قیمت خود ادا کی اور حضرت علی کی طرف پیغام دیا کہ میرے پاس ایک لاکھ ایسے اکھڑ اور جاہل نوجوان لڑائی کے لئے تیار ہیں جو میری وفاداری اور محبت میں اونٹ اور اونٹنی میں بھی فرق کرنے کو آمادہ نہیں ہوتے لہٰذا وہ خلافت کے معاملہ میں حق و باطل کو کیا پرکھیں گے" مروج الذہب ج ۲ ص۷۲۔

پس معاویہ نے اپنے سیاسی وقار اور اقتدار ناپائیدار کی بحالی اور جمہوری اسلامی حکمرانوں کی
شرعی حیثیت کو مزید مضبوط کرنے کے لئے حضرت علی ان کی اولادِ امجاد اور ان کے اتباع پر لعنت
اور سب و شتم کا سلسلہ شروع کیا اور اس طرح قانونی طور پر شیعان علی حکومتِ وقت کے مستقل
طور پر معتوب بن گئے۔ مشہور روایت کی بنا پر سنہ ۱۰۰ھ تک یعنی پورے ساٹھ سال اور دوسری
روایت کے مطابق ایک ہزار مہینہ یعنی ۸۳ سال چار ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا اور یہ سرکاری پالیسی
تھی کہ اس وقت تک یہ بدعت جاری رہے کہ بوڑھے مر جائیں اور بچے اسی فضا میں پل کر بڑے اور
بوڑھے ہو جائیں پس اگر ساٹھ سال والی روایت ہی صحیح مانی جائے تو دس سالہ بچے اس سلسلہ کے بند
ہونے کے وقت ستر سالہ بوڑھے ہوں گے پس اس فضا و ماحول میں پلی پوسی ہوئی شرق سے غرب
تک تمام اُمتِ اسلامیہ کے لئے علی پر سب و لعن کا ہونا باعثِ ملال نہ تھا بلکہ عمر بن عبدالعزیز کی طرف
سے سرکاری امتناعی حکم کے نافذ ہونے پر تمام لوگ بحرِ حیرت اور دریائے تعجب میں ایک بار غرق
ہو گئے ہوں گے کہ اس قدیم مذہبی سنت کو کیوں منسوخ کر ڈالا گیا۔

اب اگر اس گھناؤنے فعل کا پس و پیش تلاش کیا جائے اور اس کے جملہ پہلوؤں کو زیرِ بحث
لایا جائے تو یہ بات کوئی اجنبی نہیں معلوم ہوتی کہ جب مقررین خطباء واعظین اور مبلغین اپنی تقاریر
میں اس کا اظہار کرتے ہوں گے تو عین تقریر کے دوران یا اس کے قبل و بعد یہ تذکرہ بھی چھڑ جاتا ہو گا کہ
آخر ایک خاندان کو مسلسل سب و شتم کا نشانہ کیوں بنایا جاتا ہے اور اس قدر اہمیت کے ساتھ
کہ نہ کوئی جمعہ خالی ہے نہ عید اور نہ کوئی مجلس اس سے خالی ہے نہ محفل۔ آخر وہ کون تھے اور کس پاداش
میں یہ سزا ان کو دی جا رہی ہے؟

پس اس فعل کے جواز بلکہ راجح ثابت کرنے کے لئے ناگزیر تھا کہ وہ حضرت علی اور ان کی اولاد
امجاد کے نقائص و عیوب بیان کریں اور بفضلِ خدا ان میں شرعی و دینی تو یقیناً کوئی عیب تھا نہیں
پس لازماً اس زمانہ کے روایت ساز اور بہتان تراش خوشامدی لوگ غلط سلط باتیں بنا کر اس قسم
کا مواد اکٹھا کرتے ہوں گے جس پر انہوں نے اپنے اس بدترین نظریہ کی بنیاد استوار کی ہوئی تھی۔

اور جہاں حضرت علی اور ان کے خاندان کے لئے اس قسم کا جھوٹا مواد پیش کیا جاتا ہو گا وہاں اس
کا یہ پس منظر بھی لازمی ہے کہ برسرِ اقتدار اور جمہوری اسلامی خلافت کے تاجداروں اور ان کی مخصوص
پارٹی کے حق میں فضائل و محامد کی حدیثیں بھی گھڑی جاتی ہوں گی۔ پس اس سیاست کے ماتحت
شیعان علی کو جس بری طرح گرفتارِ عذاب کیا جاتا ہو گا اور جس طرح قانونی شکنجہ میں جکڑ کر ا

پر مقدمات چلائے جاتے ہوں گے اس کا نمونہ خلافت و ملوکیت صہ ۱۶۴ پر آپ دیکھ چکے ہیں اور حجاج بن یوسف سفاک کی تو پوری تاریخ شیعہ کے ناحق خون سے رنگین ہے۔

حضرت علی علیہ السلام پر مسلسل سبّ و شتم کے نتیجے میں جو تاثر پیدا ہوا اور ہونا بھی چاہیئے تھا وہ یہ تھا" ایک دفعہ اہل شام کے زعماء و شرفا کے دانشور طبقہ کے ایک دانا سے کسی نے یہ سوال کر ڈالا کہ وہ ابوتراب کون ہے؟ جس کو امام مسجد مسلسل منبر پر گالیاں دیتا ہے" تو اس نے جواب دیا کہ زمانہ فتنہ کے چوروں میں سے ایک چور تھا اسی طرح مروج الذہب مسعودی ج ۲ صہ ۷ پر یہ بھی ہے کہ عباسی تحریک کے سلسلہ میں عبداللہ بن علی وارد شام ہوا تو اس نے ابوالعباس سفاح کی طرف شام کے بعض اکابر تحقیق کے لئے بھیجے جو اچھے خاصے کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے سفاح کے سامنے قسمیہ بیان دے کر کہا" کہ ہمیں تمہارے اقتدار سنبھالنے تک کوئی علم نہ تھا کہ بنی اُمیہ کے علاوہ رسول اللہ کا کوئی اور رشتہ دار یا وارث بھی ہے۔

اندازہ کیجئے جب خراسان سے لے کر الجزائر تک شرقاً غرباً اور یمن سے لے کر اندلس تک شمالاً جنوباً پھیلی ہوئی اُمتِ اسلامیہ میں ہر مجلس و وعظ اور ہر تقریر و خطبہ میں ایک خاندان اور اس کے اطاعت گذاروں یا عقیدت مندوں پر بے تحاشا سب و شتم ہو اور ان کو ہر قسم کی بدگوئیوں سے یاد کیا جاتا ہو ان پر ہر قسم کا گندا کیچڑ اچھالا جاتا ہو۔ ان کو ہر ممکن طریق سے ذلیل و خوار کر کے گرفتارِ مصیبت کیا جاتا ہو اور یہ سلسلہ پورے ساٹھ سال تک بلا وقفہ قائم رہے اور کرنے کرانے والی حکومتِ وقت ہو جن کی زبان سے نکلا ہوا ہر فقرہ قانون اسلامی کا لباس پہنتا جا رہا ہو۔ اور ماحول اتنا بگڑ چکا ہو کہ حضرت علی کے متعلق سیانے اور سلجھے ہوئے لوگوں کا تاثر یہ ہو کہ وہ ایک چور تھے تو شیعانِ علی کے متعلق جو تاثر ہو گا وہ ظاہر ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ کسی کو شیعہ کہہ دینا اس کو ماں و بہن کی گالی سے بھی سخت برا لگتا ہے اور جب یہ طوفانی و ظلمانی دور ختم ہوا تو یہ نہیں کہ حضرت علی اور اس کے ماننے والے لوگوں کی کسی وقت حکومتِ وقت کی طرف سے ہمت افزائی کی گئی ہو بلکہ شیعانِ علی بنی اُمیہ کے زندانوں سے آزاد ہوئے تو بنی عباس کے شکنجوں میں پھنس گئے اور اس کے نتیجہ میں آئمہ شیعہ اپنے گھروں کے گوشوں میں خاموش اور کس مپرسی کی زندگی گذارنے پر مجبور ہو گئے۔

اب اگر دل میں کچھ انصاف ہو تو اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ایسے طوفانی ادوار سے شیعیت کا بچ جانا اور روز افزوں ترقی کی طرف گامزن ہونا (جب کہ اقتدار نے ہر دور میں ان کو کچلنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہو) ان کی حق پرستی اور راست بازی کا کھلا ہوا نشان ہے۔

اور جس زمانہ میں حضرت علی اور شیعانِ علی کو منبروں پر اعلانیہ سبّ وشتم کا نشانہ بنایا جاتا تھا اور انہیں ہر قسم کے مظالم کا تختۂ مشق قرار دیا جاتا تھا اسی زمانہ میں رواۃ حدیث و تفسیر پیدا ہوئے پھولے و پھیلے۔ اگرچہ باقاعدہ تدوین کا سلسلہ بعد میں ہوا۔ لیکن راویانِ حدیث مفسّرانِ قرآن اور مورخین اسلام کی زیادہ تر نشوونما اسی ہی دور میں ہوئی اور بعد والے انہی لوگوں کے شاگرد و خوشہ چین تھے۔ پس عقل و خرد کا تقاضا یہ ہے اور فطرتِ انسانیہ کا ردِعمل بھی ایسا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کے سرکاری امتناعی حکم کے بعد حضرت علی پر سبّ وشتم کا سلسلہ تو بند ہوا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت علی اور شیعانِ علی کے متعلق محامد و مناقب راویانِ حدیث نے کہاں سے لئے جب کہ بچپنے سے بڑھاپے تک ان کے کان سبّ وشتم ہی سنتے رہے ؟

سچی بات ہے حضرت علی علیہ السلام کے فضائل و مناقب اور محامد و محاسن روز روشن کی طرح اس قدر واضح تھے کہ اگرچہ ہر دور کا حکمران طبقہ انہیں پردۂ خفا میں رکھنے کے لئے بے تاب رہا۔ لیکن حضرت علی آسمان فضیلت پر مثل آفتاب بلند رہے حتیٰ کہ حسد و کدورت کی آگ میں جل بھن کر معاویہ نے آرڈی ننس کے ذریعے سرکاری حکم جاری کیا کہ اس آفتاب چرخ فضیلت پر تھوکا جاتا رہے اور کم از کم ساٹھ سال تک انہوں نے ایسا کیا بھی لیکن ان کا اپنا منہ گندا و کالا رہا اور روز افزوں حق کا بول بالا رہا۔ اور اسی دور پرفتن سے گذر کر جب زبانوں سے قفل کھلے تو حضرت علی کے فضائل اس قدر منظرِ عالم پر آگئے کہ تعصب آمیز قلمیں بھی انہیں اپنے منہ پر لانے کے لئے مجبور ہوگئیں حتیٰ کہ جمہوری اسلامی حکمرانوں کے حق میں (باوجود انعامات و اکرامات کے سائے میں لکھے جانے کے) کتب احادیث کے اوراق میں اس قدر فضائل نہیں ملتے جس قدر (نشر و اشاعت پر کڑی پابندیوں اور حکومت وقت کی سخت گیریوں کے باوجود) حضرت علی کے مناقب و محامد انہی کے راویوں کی زبانی انہی کی کتب احادیث میں موجود ہیں۔ اور یقین جانیے کہ حکمران جماعت کے حق میں ان ہی کی کتابوں میں جس قدر فضائل موجود ہیں۔ اُن سب کو شک و شبہ کی نگاہوں سے دیکھا جاسکتا ہے کیونکہ داد و دہش اور انعام و اکرام اور جائزہ و عطیہ کے طمع میں خوشامدانہ طریقہ سے ان کا بناوٹی اور موضوع ہونا زیادہ قرینِ قیاس ہے لیکن حضرت علی کے فضائل و مناقب پر شک و شبہ کا یہ غبار نہیں ڈالا جاسکتا۔ اور یہ حضرت علی اور ان کے شیعان کے حق بجانب ہونے کی اٹل اور ناقابلِ تردید دلیل ہے اور حق کا یہ واضح معجزہ ہے۔ جس طرح حضرت ابراہیم نمرود کی پیش بندیوں کے باوجود آگے رہے اور حضرت موسیٰ فرعون کی چالوں کو فیل کرتے ہوئے پیدا ہو کے رہے اور سلطنتِ پہ چھا کے رہے۔ اسی طرح حضرت علی و شیعانِ

علی کے فضائل تمام اموی سرکاری وغیر سرکاری سازشوں چالوں اور سیاستوں کو فیل کر کے رہے۔ اور شمس حقیقت بن کر ظلم و استبداد کے افق سے اُبھر کے رہے۔ پس پرچم حق اُٹھا کے رہے اور اسے فضا نا سازگار میں لہرا کے رہے۔

اور یقین جانیے کہ جمہور اہلِ اسلام کا مذہبی ڈھانچہ اگر اس زمانہ میں تیار کیا جاتا جب کہ حضرت علیؑ اور ان کے خاندان و اتباع کو سبّ و شتم اور ظلم و جور کا نشانہ بنایا جا رہا تھا تو اسلامی عقیدہ میں حضرت علی کی چوتھی خلافت تو درکنار ان کا صحابہ میں بھی شمار نہ ہوتا۔ اب تو شیعوں کو چوتھے کی بجائے خلیفہ بلا فصل ثابت کرنا پڑتا ہے۔ اس وقت شیعوں کیلئے خلیفہ کے بجائے علی کا صحابی رسول بھی ثابت کرنا مشکل ہو جاتا۔ اسی طرح حسنین کا اولادِ پیغمبر ثابت کرنا بھی غیر معمولی مسئلہ بن جاتا کیونکہ جمہور اسلام کا مسلک اور نظریہ وہی ہوتا جو ابتداء دولت بنی عباس میں اہل شام کا تھا اور آج تک خطبوں میں سنت امویہ کو دہرایا جانا بعید نہ تھا۔

اب یہ نظریہ قائم کرنا بالکل غلط اور خلافِ واقع ہے کہ شیعہ مذہب کی ابتداء اموی و عباسی گروپوں کی سیاسی رسہ کشی کے زمانہ سے ہوئی بلکہ مودودی صاحب نے بھی اس بات کو تسلیم کیا ہے، کہ حضرت علی کی جماعت کو ابتدا سے شیعانِ علی کہا جاتا تھا جو بعد میں صرف شیعہ کہلانے لگے ص۲۱۔ البتہ پہلی تینوں حکومتوں کے زمانہ میں ان کی زبانوں پر مہر خاموشی رہی کیونکہ اس زمانہ میں ان کا اختلاف منظرِ عام پر آ کر نہ تو انقلاب آور ہو سکتا تھا اور نہ کوئی دوسرا مفید نتیجہ پیدا کر سکتا تھا بلکہ اُلٹا حالاتِ حاضرہ کے ماتحت نقصان ہی نقصان کا پیش خیمہ ہوتا۔ حضرت علی علیہ السلام کے ظاہری اقتدار کے زمانہ میں مہر خاموشی ٹوٹی اور ان کے حلقہ میں کافی وسعت پیدا ہوئی مخصوصاً جنگ جمل و صفین و نہروان میں لوگ خود بخود سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ حق پر کون ہے اور باطل پر کون؟ پس وھڑا دھڑ حضرت علی کی عقیدتمندی کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا اور سنجیدہ طبقہ نے جان لیا کہ رسول اللہؐ کے بعد بلا فصل امام آپ ہی ہیں پھر اموی ظلم و استبداد کے گھنے بادلوں میں امامتِ حقہ اور ملتِ شیعہ کا سورج کافی عرصہ تک روپوش رہا کیوں کہ اسی دور میں جہاں عقیدۂ جمہور کے خوشامدیوں کے لئے خزانوں کے منہ کھلے تھے وہاں شیعانِ علی کے لئے زندانوں کے منہ کھلے تھے۔ پس اموی و عباسی سیاست کی کش مکش کے دوران میں شیعوں سے استبدادی گرفت جونہی ڈھیلی ہوئی اپنے عقائدِ حقہ کا اعلان کرتے ہوئے میدان میں آ گئے۔

مذہبی اختلاف کی ابتداء

ہم نے واضح کر دیا ہے کہ مذہبی اختلاف کی ابتداء وفاتِ پیغمبرؐ سے ہی ہوئی اور مذہب دو بن گئے

ایک جمہور اہل اسلام جنہوں نے صاحب اقتدار و حکومت کو مذہب کا سربراہ مقرر کر دیا پس مذہب اسی طرف جھکتا گیا جس طرف اقتدار جھکا۔ بعض چیزیں جو پیغمبر کے زمانہ میں حلال تھیں ان کو مخصوص مصالح کی بنا پر حکمرانوں نے حرام قرار دے دیا جیسے متعۃ الحج اور متعۃ النساء جنکو حضرت عمر نے حرام کیا اور بعض چیزیں پیغمبر کے زمانہ میں نہ تھیں اور حکمرانوں نے مذہب میں شامل کر لیں جس طرح نماز تراویح کو حضرت عمر نے رائج کیا اور صبح کی اذان میں اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْم کو بھی داخل کیا اور جمعہ کے دن دوسری اذان حضرت عثمان کے زمانہ سے شروع ہوئی اور حکومت نواز جمہوریت چپ کر کے ہاں میں ہاں ملاتی چلی گئی۔ بدعات خلفاء تاریخ خلفا میں دیکھئے۔ جن کو اولیات کا حسین و خوشنما خطاب دیا گیا ہے۔

دوسرا اس کے بالمقابل حضرت علی کا مسلک تھا جو ظاہری اقتدار سے اگرچہ محروم تھے لیکن ذخائر علمیہ کے لحاظ سے اُمت کے لئے مرکزی حیثیت کے حامل تھے۔ اُمور دنیاویہ میں اگرچہ حکومت کے وفادار شہری کی طرح آپ دست تعاون بڑھانے میں کبھی بخل نہ کرتے تھے لیکن عقیدہ کی رُو سے نہ ان کو خلیفہ رسول سمجھتے تھے اور نہ امیر المومنین کہلانے کے لائق۔ اور یہی عقیدہ ان لوگوں کا تھا جو آپ کے عقیدت مند تھے۔ چنانچہ الامامۃ والسیاسۃ سے ابن قتیبہ دینوری ناصبی سُنّی کا قول پیش کیا جا چکا ہے۔ البتہ شیعوں میں سے زیدیہ اور جمہور اہل اسلام میں سے مرجیہ و معتزلہ دور اختلاف کی پیداوار ضرور ہیں۔

جس طرح جمہور اہل اسلام کے خیالات و عقائد پہلے سے محفوظ چلے آ رہے تھے لیکن باقاعدہ اُن کی تدوین و ترتیب اور توضیح و تشریح امام ابوحنیفہ نے کی اسی طرح شیعان علی کا مسلک اُصول و فروع کے لحاظ سے متعین تھا لیکن اس کی مکمل توضیح و تشریح اور تبیین و تدوین پانچویں اور چھٹے امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام سے ہوئی جن کا زمانہ اموی دور کی انتہا اور عباسی دور کی ابتداء میں تھا اور یہی زمانہ ابوحنیفہ کا بھی ہے۔

جمہور اہل اسلام

مذہبی اختلاف کی بحث کے آخر میں مودودی صاحب رقمطراز ہیں۔

ان متحارب اور متشدد گروہوں کے درمیان مسلمانوں کا سواد اعظم اپنے خیالات میں انہی نظریات اور اصولوں پر قائم تھا جو خلفاء راشدین کے زمانے سے مسلم چلے آ رہے تھے اور جنہیں جمہور صحابہ و تابعین اور عام مسلمین ابتدا سے اسلامی اصول و نظریات سمجھتے تھے

مسلمانوں کی بمشکل ۸۔۱۰ فیصد آبادی اس تفرقہ سے متاثر ہوئی تھی باقی سب لوگ مسلکِ جمہور ہی پر قائم تھے۔ مگر دورِ اختلاف کے شروع ہونے کے بعد سے امام ابو حنیفہ کے وقت تک کسی نے ان اختلافی مسائل میں جمہور اہلِ اسلام کے مسلک کی باقاعدہ توضیح نہیں کی تھی جو ایک پورے نظامِ فکر کی شکل میں مرتب ہوتی بلکہ مختلف فقہاء محدثین مختلف مواقع پر اپنے اقوال، فتاوی، روایات یا طرزِ عمل سے منتشر طور پر اس کے کسی پہلو کو واضح کرتے رہتے تھے صفحہ ۲۲

شیعہ مسلک کی جمہور سے علیحدگی

اس کے بالکل برعکس شیعی مسلک اُصولی و نظریاتی طور پر جمہور اہلِ اسلام سے روزِ اول سے منفرد و ممتاز رہا ہے جس کو مودودی صاحب نے صاف بیان کیا ہے۔

(۱) امامت (جو خلافت کے بجائے اُن (شیعانِ علی) کی مخصوص اصطلاح ہے) مصالح عامہ میں سے نہیں ہے کہ اُمت پر اس کا انتخاب چھوڑ دیا جائے اور امت کے بنانے سے کوئی شخص امام بن جائے بلکہ وہ دین کا ایک رکن اور اسلام کا بنیادی پتھر ہے اور نبی کے فرائض میں سے یہ ہے کہ امام کا انتخاب اُمت پر چھوڑنے کے بجائے خود بحکم صریح اس کو مقرر کردے۔

(۲) امام کو معصوم ہونا چاہیے یعنی وہ تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے پاک اور محفوظ ہو۔ اس سے غلطی کا صدور جائز نہ ہو اور ہر قول و فعل جو اس سے صادر ہو برحق ہو۔

(۳) حضرت علی وہ شخص ہیں جن کو رسُول اللہ نے اپنے بعد امام نامزد کیا تھا اور وہ بربنائے نص امام تھے۔

(۴) ہر امام کے بعد نیا امام اپنے سے پہلے امام کی نص پر مقرر ہوگا کیونکہ اس منصب کا تقرر اُمت کے سپرد ہی نہیں کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے منتخب کرنے سے کوئی شخص امام ہو سکے۔

(۵) شیعوں کے تمام گروہوں کے درمیان اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ امامت صرف اولادِ علی کا حق ہے (خلافت و ملوکیت صفحہ ۲۱۱ و صفحہ ۲۱۲)

مذہب شیعہ کے اس عقیدہ کی بنیاد عقیدۂ نبوت کے تابع ہے کیونکہ عہدۂ امامت عہدۂ نبوت کی نیابت کی حیثیت رکھتا ہے۔ پس جس طرح نبی کے لئے ضروری ہے کہ خدا کی طرف سے نامزد ہو اور ہر صفت کمال میں پُورے اہلِ زماں سے اشرف و افضل ہو اور اپنے تمام افعال و اقوال یعنی کردار و گفتار میں از اول تا آخر معصوم ہو یعنی گناہانِ صغیرہ و کبیرہ سے پاک اور محفوظ ہو ورنہ اس کی

ہدایت موثر نہ ہوگی اور اللہ پر ترجیح بلا مرجح یا ترجیح مرجوح کی قباحت لازم آئے گی جو محال ہے

پس جس طرح نائب منیب کی فرع ہوتا ہے اسی طرح عقیدۂ امامت عقیدۂ نبوت کی فرع ہے لہٰذا امام وہی ہو سکتا ہے جو نبی کے بعد دینی و مذہبی، نفسی و معاشرتی اور تمدنی و سیاسی زندگی کے ہر شعبہ میں نبی کی طرح قیادت مطلقہ کی پوری صلاحیت رکھتا ہو۔ صفاتِ کمال ذاتیہ و نفسیہ میں اپنے پورے اہل زمان سے افضل و اشرف ہو اور صفتِ عصمت سے متصف ہو یعنی کسی چھوٹے یا بڑے گناہ کا ارتکاب نہ کرتا ہو۔ اس کی پوری زندگی میں اس کا کوئی قول یا فعل شرعی لحاظ سے قابلِ گرفت نہ ہو۔ اور یہ صفات و کمالات اور محامد و محاسن کسی انسان میں دوسرے انسان کو کماحقہ معلوم نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کو اللہ ہی نامزد کرے اور اللہ جس کو نامزد کرے گا وہ یقیناً ان صفات کا حامل ہوگا کیونکہ اللہ پر بعید ہے کہ مفضول کو فاضل پر جاہل کو عالم پر ناقص کو کامل پر غلط کو صحیح پر اور باطل کو حق پر ترجیح دے۔ پس اللہ کے حکم سے رسول پر واجب ہے کہ اپنے بعد کے لئے اپنے وصی و جانشین اور صحیح نائب و خلیفہ کا اعلان کرے جو ان کے بعد لوگوں کا امام حق ہو۔

لوگوں کے چننے سے قطعاً صحیح انتخاب نہیں ہو سکتا کیونکہ ضروری نہیں کہ جس میں صفاتِ فاضلہ موجود ہوں لوگ اُسی کو ہی منتخب کریں اور یہ بھی بعید از قیاس ہے کہ لوگ جس کو چن لیں وہ صفاتِ فاضلہ کا جامع بن جائے۔ چنانچہ سقیفائی انتخابی ادارے کے ایک اہم رکن بلکہ الیکشن کمشنر حضرت ابو عبیدہ جراح نے اس امر کا واشگاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے اور حضرت علی سے پُر زور لب و لہجہ میں اپنا نام واپس لینے کی درخواست کی ہے جس میں اُس نے اہم پہلو یہی ذکر کیا کہ یہ لوگ تیری قوم کے بزرگ سن رسیدہ اور جہاں دیدہ تجربہ کار ہیں اب ان کو رہنے دیجئے۔ اگر زندگی نے ساتھ دیا اور موت نے مہلت دی تو صفاتِ فاضلہ اور کمالاتِ ذاتیہ کے لحاظ سے آپ کے مستحقِ خلافت ہونے میں کوئی کلام نہیں پس آپ کی باری بھی آجائے گی۔ کتاب الامامۃ والسیاسۃ سے ابن قتیبہ دینوری کی الیکشنی خلافت کے متعلق کارگزاری کی مفصّل روداد سے حسب ضرورت جملے ہم نے ابتداءً نقل کر دئے ہیں جو حقیقتِ حال کو سمجھنے کے لئے کافی ہیں اُن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ انتخاب ایک سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت تھا اور اچانک تھا اس میں نہ صفاتِ فاضلہ کا لحاظ تھا اور نہ مستحق و غیر مستحق کا اعتبار تھا۔ تمام اہل مدینہ تو درکنار تمام اہل حل و عقد کو بلکہ عشرہ مبشرہ کے پورے گروپ کو شامل کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا گیا تھا اور تاریخ دانوں سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ جس طرح دھاندلی اور دھینگا مشتی کا مظاہرہ مسلمانوں میں اس پہلے جمہوری خلیفہ کے وقت ہُوا۔ اتنا کبھی نہیں ہوا۔ اور جب اقتدار پر قبضہ ہو گیا تو

اُسے فاضل بھی کہنا شروع کر دیا گیا اور حقدار بھی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی اور انکار کرنے والوں کو طاقت سے ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس طرح سے اسلامی حکومت نے جناب رسول اللہؐ کی وفات کے فوراً بعد سے جمہوریت کے دھوکے سے ملوکیت کا روپ دھار لیا اور یہ صورتِ حال دن بدن بگڑتی چلی گئی حتیٰ کہ زمانِ پیغمبر سے جوں جوں دُور ہوتی گئی ملوکیت کے چہرہ پر جو اسلامی کردار کا سنگار تھا وہ بھی اُترتا چلا گیا اور آخر کار سرکاری پارٹی کو مجبوراً کہنا پڑا کہ یہ بادشاہت اور ملوکیت ہے خلافت نہیں۔

لیکن شیعہ مسلک میں پہلے دن سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح چلی آ رہی ہے کہ خلافتِ حقہ جس کا دوسرا نام امامت ہے منصبِ نبوّت کی طرح یہ عہدہ بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہے عطا کرے۔ پس جناب رسالت مآبؐ نے بحکم پروردگار حجۃ الوداع سے واپسی پر آیہ بلّغ ما کے نزول کے بعد حاجیوں کے ایک لاکھ بیس ہزار کے مجمع میں خمِ غدیر کے مقام پر پالانوں کے منبر پر سوار ہو کر ببانگِ دہل حضرت علی کا بازو پکڑ کر اعلان فرمایا۔ مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ (جس کا میں سردار ہوں اس کا علی سردار ہے) اور اس کے بعد آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ الخ۔ اُتری۔ اس حدیث کو معنوی طور پر تواتر کا درجہ حاصل ہے تفسیر درمنثور علامہ جلال الدین سیوطی، تفسیر ثعلبی۔ اسنی المطالب۔ مناقب مغازلی۔ شواہد التنزیل۔ مناقب خوارزمی۔ فرائد السمطین، خصائص نطنزی۔ حلیۃ الاولیاء۔ تفسیر کبیر رازی اور تذکرۃ الخواص وغیرہ میں موجود ہے۔ نیز تفسیر فتح البیان۔ تفسیر فتح القدیر اور تفسیر ابن کثیر کے حوالہ سے بھی یہ حدیث نقل کی گئی ہے اور اسی ضمن میں حسان بن ثابت صحابی کا قصیدۂ غدیریہ عام کتب میں منقول و مسطور ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے

یُنَادِیْھِمْ یَوْمَ الْغَدِیْرِ نَبِیُّھُمْ بِخُمٍّ وَاَسْمِعْ بِالرَّسُوْلِ مُنَادِیًا

اور غزالی نے سر العالمین میں حدیث غدیر پر علمائے جمہور کے اجماع کا دعویٰ کیا ہے (علی ما نقل)

بُرا ہو تعصّب کا اور اموی ذہنیت کا کہ جس کتاب میں حضرت علی کی کسی فضیلت کا تذکرہ ہوا اس کو شیعہ کی کتاب کہنا جمہور اہل اسلام کا وتیرہ بن چکا ہے چنانچہ مودودی صاحب خود اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ ابن جریر طبری کو حدیث غدیر نقل کرنے کی بنا پر اہل سنّت نے شیعہ کہدیا اور اموی دَور کے علانیہ سبّ و شتم نے حضرت علی کے متعلق نفرت عام پھیلا دی حتیٰ کہ اہل شام ان کو چور ڈاکو سمجھنے لگ گئے اور اسی سے تاثر لینے والے متعصب مزاج اہل سنت اپنی کتابوں میں حضرت علی کا ذکرِ خیر ہی ترک کر بیٹھے اور جب کسی نے کوئی ایک آدھ فضیلت لکھ بھی ڈالی تو اُسے شیعہ

یا کم از کم شیعیت نواز کہہ دیا گیا۔ اموی سیاست کے ماتحت حضرت علی اور شیعانِ علی پر گالی گلوچ اور غلط الزامات کی علانیہ نشر و اشاعت نے عامۃ النّاس کو اس قدر متاثر کیا کہ حضرت علی کے محامد و مناقب کی کثرت و شہرت نے اگرچہ ان کا نام کسی حد تک قابلِ برداشت بنا دیا لیکن شیعوں کا نام اب تک ان کے لئے قابل برداشت بھی نہیں ہے۔ متعصب اہل سنت اس کتاب کو دیکھنا ہی گوارا نہیں کرتے جو کسی شیعہ نواز سنّی کی لکھی ہوئی ہو شیعہ تو در کنار۔

اور یہی وجہ ہے کہ مودودی صاحب نے بھی جہاں شیعہ مسلک اور اس کے خصوصیات بیان کئے گئے ہیں کسی شیعہ اُصول و عقائد کی کتاب سے نہیں بلکہ عام تاریخی دستاویزات کو کافی سمجھ کر ان کا حوالہ دے دیا حالانکہ کسی محقق کے لئے زیبا نہیں کہ کسی قوم کا نظریہ و عقیدہ ایسی کتابوں سے نقل کرے جو خود ان کے لئے قابلِ قبول نہ ہوں۔ ایسا فعل اگر خیانت نہیں تو دیانت بھی کسی صورت میں نہیں ہے اور مذموم نہیں تو ممدوح بھی اسے نہیں کہا جا سکتا۔

جب شیعہ مسلک کو نقل کرنے کے لئے شیعہ کتب کو دیکھنا گوارا نہیں تو اپنے مسلک کو ثابت کرنے اور اس کی صحت و صفائی اور لیپ پوت کے لئے کسی شیعہ کتاب کو کیوں دیکھتے ؟ چنانچہ انہوں نے ماخذ کی بحث میں صاف اس امر کا انکشاف کیا ہے کہ وہ زیادہ تر ان کتابوں سے مطلب لینے کی کوشش کرتے ہیں جن میں شیعیت یا شیعیت نوازی تو در کنار شیعیت اور شیعیت نوازی سے پورا پورا تعصب موجود ہو اور انہوں نے حافظ ابن کثیر پر اپنے زیادہ تر اعتماد کی وجہ بھی یہی بتلائی ہے کہ تشیع کی طرف میلان تو در کنار وہ اس کے سخت مخالف ہیں اور شیعی روایات کی زور شور سے تردید کرتے ہیں اور صحابہ میں سے کسی ایک پر حتی الوسع کوئی آنچ نہیں آنے دیتے اور حضرت معاویہ ہی نہیں بلکہ یزید تک کی صفائی پیش کرنے میں کسر نہیں اٹھا رکھتے ص۳۱۵ اور آخر میں لکھتے ہیں کہ:-

"میں یہ شبہ تک نہیں کر سکتا کہ وہ شیعی روایات سے کچھ بھی متاثر ہو سکتے تھے یا ان کو اخذ کرنے میں کسی قسم کا تساہل برت سکتے تھے یہ محض مذہب جمہور کے متعلق آبائی تقلید کا نتیجہ ہے کہ لیپ پوت کر کے یزید تک کی صفائی پیش کرنا اور حضرت علی کے فضائل کی روایات کو شیعی روایات کہہ کر رد کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔

تولّی و تبرّی

حقیقت لیپ پوت کی محتاج نہیں ہوتی۔ لیکن بناوٹ لیپ پوت ہی کا دوسرا نام ہوتا ہے۔ مذہب شیعہ میں یہ نظریہ اساس مذہب کی حیثیت رکھتا ہے کہ کھرے کو کھرا کہو اور اس سے محبت رکھو اور کھوٹے کو کھوٹا سمجھو اور اس سے نفرت کرو۔ اسی بنا پر شیعہ مسلک

کی رو سے کسی بڑے سے بڑی شخصیت کی غلطی کو لیپ پوت کر کے چھپانا ناجائز ہے پس دورِ فتن کی تاریخ میں جن لوگوں نے حق کا ساتھ دیا اور شہید ہوئے۔ شیعہ نظریہ کے ماتحت وہ واجب الاحترام بزرگ تھے اور ان سے محبت واجب ہے لیکن جن جن لوگوں نے حق کا ساتھ چھوڑ دیا اور حق کے مقابلہ میں آگئے شیعہ نظریہ کی رو سے وہ باغی تھے ظالم تھے اور باطل پر تھے خواہ وہ اس سے پہلے کتنی بڑی شخصیت کے مالک ہی کیوں نہ ہوں ان کا احترام اور بزرگی اس وقت تک مسلم تھی جب تک وہ حق کے ساتھی تھے جب اُنہوں نے حق سے انحراف کر لیا نہ ان کی بزرگی رہی نہ وہ قابلِ احترام رہے پس وہ قابلِ نفرت و مذمت ہیں نہ کہ قابلِ تعریف و مدح۔ البتہ جس کے متعلق غلطی کرنے کے بعد توبہ ثابت ہو جائے تو شیعہ کے نزدیک اس کے احترام میں کمی نہیں ہوتی۔ اور شیعہ مذہب میں تولی اور تبری کا یہی مفہوم ہے کہ نیک سے محبت کرو اور بُرے سے بیزاری کرو۔ شیعہ مسلک کُلُّہم عُدُول کا قائل نہیں بلکہ جو راست باز تھے اور ثابت قدم رہے یا پھسلنے کے بعد تائب ہو کر مرے وہ واجب الاحترام ہیں لیکن جو غلط کار تھے اور رہے اور توبہ کے بغیر مر گئے وہ قطعاً واجب الاحترام نہیں ہیں۔ اور شیعہ مذہب کا یہی عقیدہ جمہور اہلِ اسلام کے تقلیدی عقیدہ سے ہمیشہ بر سرِ پیکار رہا ہے اور اسی بنا پر شیعہ جمہوری اسلامی حکومتوں میں معتوب زندگی گذارنے پر مجبور ہوئے تھے چنانچہ حجر بن عدی اور اس کے ساتھیوں کو اسی الزام میں گرفتار کر کے معاویہ نے قتل کروایا۔ عمرو بن الحمق صحابی کو اسی عقیدہ کی پاداش میں معتوب قرار دے کر اس کی مردہ لاش سے سر کو الگ کیا گیا اور پھر تشہیر کرایا گیا اور میثم تمار کو اسی ہی عقیدہ کی سزا میں سولی پہ لٹکایا گیا اور اموی دور میں شیعانِ علی پر مظالم کے جو پہاڑ گرائے گئے گذشتہ صفحات میں مودودی صاحب کی زبانی ان کا معمولی اشارہ گذر چکا ہے۔ اور مظالم امویہ کی رُوح فرسا تفصیل تاریخ کے صفحات میں اب تک موجود ہے۔

شیعہ مذہب کی صداقت اور حقانیت کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ جبر و استبداد اور قہر و غلبہ کے تشدد کی چکیوں میں پس پس کر بھی انہوں نے اپنے اُصول کو نہ چھوڑا۔ اور شریعتِ رسول میں لیپ پوت کر کے باطل پر حق کا غلاف دینا گوارا نہ کیا۔

مودودی صاحب نے ایک واضح اُصول ذکر کیا ہے کہ غلطی کے صدور سے بزرگی میں فرق نہیں آتا صفحہ ۳۰۶۔ یعنی جس کو بزرگ مان لیا جائے وہ غلط کار ہونے کے باوجود بھی بزرگ رہتا ہے لیکن اس کے مقابلہ میں شیعہ نقطہ نظر یہ ہے کہ کسی بزرگ کی بزرگی اس حد تک مسلّم ہے جب تک کہ وہ غلط کار نہ ہو ورنہ غلط کار کو شیعہ مسلمان غلط کار ہی کہے گا خواہ اس نے بزرگی کا لبادہ ہی کیوں نہ اوڑھ رکھا ہو۔ البتہ بھول چوک یا اتفاقی غلطی جو توبہ و استغفار سے محو ہو جائے وہ قابلِ گرفت نہیں ہے۔

جمہوریّت اور جمہور اہل اسلام

اسلام کے فرقوں میں نظریاتی اختلافات ناقابلِ انکار ہیں جو مذہب کی حیثیت سے رونما ہوئے۔ اور جن کا اسلامی تعلیمات کے ساتھ جسم و جان اور روح و قالب کا سا تعلّق ہے کیونکہ جہاں وہ فرعی اعمال پر اثر انداز ہیں وہاں عقائد و اُصول میں بھی اُن کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اس جگہ ہم سابقہ ابحاث کی روشنی میں فرقہ وارانہ ان بنیادی خطوط کی نشان دہی کرتے ہیں جن پر مذہب کی بنیاد رکھی گئی۔ پہلے ہم جمہوریت کے خطوط کی تعیین کرتے ہیں جن پر جمہور اہل اسلام نے مذہب کے طور پر ان کو اساسی حیثیت دے دی۔

(۱) جو شخص جمہوریت کے نام سے الیکشن جیت لے وہ اقتدارِ اعلیٰ کا قانونی و آئینی طور پر مالک ہے

ا۔ خواہ حضرت ابوبکر کی طرح نہ عام انتخاب کا اعلان ہو نہ مقابل میں کسی اُمیدوار کو کھڑے ہونے کا موقعہ دیا جائے بس سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت ایک آدمی دوسرے کا نام اچانک تجویز کر کے اس کی بیعت کر لے اور پھر دوسروں کو اس کی بیعت کرنے کی دعوت دے دے اور اس طریقِ کار کو اپنے لئے جائز قرار دے کر دوسروں کے لئے خلافِ آئین قرار دے دے۔

ب۔ یا حضرت عمر کی طرح سربراہِ مملکت تمام مسلمانانِ عالم کے اختیاراتِ انتخاب کو اپنے قبضہ میں لے کر اپنے جانشین کو نامزد کرے پھر اپنے ولیعہد کی بیعت کیلئے تمام امت کو اپنی موجودگی میں اور اقتدارِ اعلیٰ کے سائے میں دعوت دے دے۔

ج یا حضرت عثمان کی طرح کہ سابق حکمران تمام رعایا کے اختیاراتِ انتخاب سلب کر کے ایک خاص کمیٹی کے حوالے کر دے (اگرچہ اس کمیٹی کے بعض ممبران کے متعلّق اُسے حدِ یقین تک یہ خطرہ بھی ہو کہ اس میں خویش نوازی اور کنبہ پروری کا جذبہ کارفرما ہے) اور باقی تمام اُمّت پر ان ہی کے فیصلے کو تسلیم کرنا واجب قرار دے دے۔

اس سلسلے میں جمہور اہلِ اسلام اور سوادِ اعظم کا مذہبی نقطۂ نظر یہ قرار پایا کہ طرقِ مذکورہ سے اقتدار پر قبضہ کرنے والا نائب رسول ہوگا اور اس کی اطاعت خدا و رسول کی اطاعت کی طرح فرض ہوگی اور اس کا انکار منافی اسلام ہوگا۔

(۲) جمہوریت میں معیارِ انتخاب کوئی نہیں ہوتا کیونکہ ہر فردِ مملکت کو مساوی حقوق حاصل ہوتے ہیں پس الیکشن کے لئے کھڑے ہونے والے متعدد اُمیدواروں میں سے جو بھی جیت جائے۔ وہ یہ

دعویٰ کرتا ہے کہ اس مملکت کی سربراہی کے لئے میں ہی زیادہ مستحق ہوں اور مجھ میں ہی وہ تمام اوصاف موجود ہیں جو کسی مملکت کے صدر میں ضروری ہیں اور اس کی پارٹی ایڑی چوٹی کا زور اسی بات پر صرف کرتی ہے کہ انتخاب بالکل برمحل ہوا ہے اور منتخب ہونے والا اُمیدوار ہی ملک وملت کے لئے زیادہ مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اور کرسیٔ اقتدار سنبھالنے والا انسان اگر ڈکٹیٹر مزاج ہو تو وہ اپنے خلاف کوئی آواز سننا گوارا ہی نہیں کرتا بلکہ مخالف گروپ کے اظہار خیالات پر پابندی عائد کر دیا کرتا ہے نیز بوقتِ انتخاب خواہ کتنی ہی دھاندلی کو بروئے کار لایا گیا ہو اپنی سیاست کی ساکھ کو برقرار رکھتے ہوئے اور عوام میں اپنی مقبولیت کو بڑھاتے ہوئے یہ فقرے صرف عامۃ النّاس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے اور اختلاف رائے رکھنے والوں کا دل جلانے کے لئے تقاریر میں بیان کئے جاتے ہیں "کہ عوام نے میرے اُوپر بہت بڑی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈال دیا ہے۔ جس کا میں اہل نہیں ہوں لیکن اب عوام کے جذبات کو ٹھکرانا پسند نہ کرتے ہوئے میں طوعاً و کرہاً مسندِ اقتدار پر قدم رکھے ہوئے ہوں"

بعینہٖ اسی طرزِ عمل پر وفاتِ پیغمبرؐ کے بعد جمہوری اسلامی حکمرانوں نے اقتدار پر قبضہ کیا اور پارٹی نے ان کے متعلق اس پروپیگنڈے کو خوب ہوا دی کہ وہ ہی سب اُمّت سے لائق تھے اور وہی معیارِ انتخاب پر پوری طرح فائز تھے اور حضرت عمرؓ نے تو صاف فرما دیا تھا "اگر ہم اس بے قاعدگی اور جلد بازی سے بغیر مشورے کے الکشن کو کامیاب نہ کروا لیتے تو راتوں رات کوئی اور قدم اٹھایا جاتا اور اقتدار کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ میں آجاتا جس کو نہ ہم قبول کر سکتے اور نہ روکنا ممکن ہوتا۔ "خلافت وملوکیت صفحہ ۸۹" پر اسی مطلب کی ایک عبارت درج کی گئی ہے۔ پس جمہورِ اہل اسلام نے اسی کو اپنا دین بنا لیا اور اختلاف رائے رکھنے والوں کو زبردستی اپنا ہم خیال بنانے کا لائحہ عمل مرتب کیا گیا جس پر حسبِ مواقع سختی سے عمل ہوتا رہا اور آج تک سوادِ اعظم کے پڑھے لکھے اور محقق طبع آدمی بھی شیعوں کی نہ بات سننے پر تیار ہیں اور نہ ان کی کتابیں پڑھنے کے لئے حاضر ہیں کیونکہ وہ اپنے خیال کے مخالف دوسری آواز کا سننا ہی گوارا نہیں کرتے اور تصویر کا صرف ایک رُخ دیکھ کر وہ اپنے عقیدہ پر مطمئن ہیں حتیٰ کہ مودودی صاحب جیسا آدمی بھی ماخذ کی بحث میں اپنا نظریہ اسی قسم کا ظاہر کر چکا ہے۔

(۳) جمہوریت میں حق معیارِ کامیابی نہیں بلکہ کامیابی معیارِ حق ہے اسی طرح لیاقت وفضیلت جیت کا معیار نہیں بلکہ جیت لیاقت وفضیلت کا معیار ہے۔ اسی بنا پر سوادِ اعظم کے نزدیک جنگِ اقتدار جیت جانے والے تمام اُمّت سے افضل قرار دئے گئے اور ان کی فضیلت کی وہی ترتیب قائم کی گئی

جس ترتیب سے وہ جیت کر مسندِ اقتدار پر متمکن ہوئے۔

(۴) جمہوریت میں کامیاب اُمیدواروں کی ہر لغزش و غلطی پر پردہ ڈالنا ان کی پارٹی کا فریضہ ہوتا ہے حتیٰ کہ اُن کے متضاد نظریات و افکار اور متخالف اقوال و افعال کا لیپ پوت سے ان کا بھرم رکھنا وہ ضروری سمجھتے ہیں چنانچہ سوادِ اعظم کے عقائد کا جزوِ اعظم یہ بات قرار پاگئی کہ صحابہ میں سے کسی پر نکتہ چینی کرنا خلافِ اسلام ہے حتیٰ کہ متحارب گروہوں میں سے بھی ہر ایک کا احترام واجب اور ان کی صحابیت کا شرف ناقابلِ زوال اور ان کی بزرگی کے خلاف زبان کھولنا حرام ہے اور لُطف یہ کہ ایک فریق کو حق کہتے ہوئے بھی دوسرے کو ناحق نہیں کہنا ایک کو امامِ حق کہنے کے باوجود[١٣٨] دوسرے کو باغی کہہ کر بھی اُن سے بیزاری کرنا حرام سمجھتے ہیں گویا حق و باطل دونو سے برابر کی محبت رکھتے ہیں۔ اسی طرح ایک کو صحیح کہنے کے باوجود دوسرے کو غلط نہیں کہنا اور اگر غلط کہنا بھی ہے تو پاتو اجتہادی غلطی کے دامن میں اس کو چھپانے کی کوشش کرنی ہے اور اگر اجتہادی غلطی کہنے کا کوئی امکان نہیں تو نظریاتی غلطی کہہ کر اُسے قابلِ عفو ٹھہرانا ہے خواہ بیچ میں ہزاروں بے گناہ مسلمانوں بلکہ بدری و بیعتِ رضوان میں شریک صحابہ ہی کو تہ تیغ کر دیا گیا ہو۔ اور یہ عقیدہ قرار دینا ہے کہ قاتل و مقتول سب کے سب برابر وفادار دوست اور محبّ ہیں۔

(۵) جمہوریت میں ضروری نہیں کہ افضل اُمت کا ہی انتخاب کامیاب ہو۔ اسی بنا پر جمہور اہلِ اسلام نے اسلامی عقیدہ یہ قرار دیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد امام کے لئے ضروری نہیں کہ وہ تمام اُمت سے افضل ہو۔ چنانچہ علامہ تفتازانی نے شرح عقائدِ نسفیہ میں اس امر کی تصریح کی ہے۔

(۶) جمہوریت میں ضروری نہیں کہ جس کا انتخاب کامیاب ہو وہ معصوم بھی ہو۔ اسی بنا پر جمہور اہلِ اسلام نے اسلامی عقیدہ یہ تجویز کیا ہے کہ نبی علیہ السّلام کے خلیفہ اور امامِ اُمت کے لئے معصوم ہونا ضروری نہیں ہے۔ (شرح عقائدِ نسفیہ)

(۷) جس شخص کو جمہوری طرزِ حکومت کی بنیاد پر مسندِ اقتدار مل جائے ضروری نہیں کہ جس منشور کے ماتحت اسے کامیاب کیا گیا تھا اور جن شرائط کے پیشِ نظر وہ اُمیدوار کھڑا ہوا تھا، کامیابی کے بعد اور اقتدار پر قبضہ کر لینے کے بعد وہ اس منشور پر قائم رہے اور ان شرائط کی ایفا کرے۔ اسی بنا پر جمہور اہلِ اسلام نے بطورِ عقیدہ اس بات کو اپنا لیا ہے۔ لَا یَنْعَزِلُ الْاِمَامُ بِالْفِسْقِ اَیِ الْخُرُوْجِ عَنْ طَاعَةِ اللّٰہِ وَالْجَوْرِ اَیِ الظُّلْمِ عَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ تع۔ فاسق ہو جانے سے (اللہ کی اطاعت کے دائرے سے نکل جانے سے) اور اللہ کے بندوں پر ظلم کرنے سے امام معزول نہیں ہو سکتا (شرح عقائدِ نسفیہ)

اور چونکہ راہِ جمہوریت سے کامیاب ہونے والے برسرِ اقتدار حکمران طبقہ کو نیابتِ رسولؐ کا دعویٰ بھی تھا

اور نماز میں بھی ان کے پیچھے اقتداء ہوتی تھی پس جب وہ ظلم وفسق سے معزول نہیں ہو سکتے تو اُن کو مصلا
اور امامتِ مسجد سے بھی الگ نہیں کیا جا سکتا۔ بنا بریں جمہور اہلِ اسلام نے اس بارے میں عقیدۂ اسلامی
یہ تجویز کیا ہے کہ تَجُوْزُ الصَّلٰوۃُ خَلْفَ کُلِّ بَرٍّ وَّفَاجِرٍ "نماز ہر نیک و بد کی اقتداء میں جائز ہے"
اور اس قسم کے فیصلے مقبولِ عام نہیں ہو سکتے تھے جب تک کہ ان کی سند جنابِ رسالت مآبؐ تک
نہ پہنچے لہٰذا برسرِ اقتدار پارٹی کے خوشامدی رواۃِ حدیث نے فاسق وفاجر حکمرانوں کی خوشنودی کی خاطر
جنابِ رسول اللہؐ پر اتہام لگا دیا کہ آپ نے فرمایا تھا صَلُّوْا خَلْفَ کُلِّ بَرٍّ وَّفَاجِرٍ۔ "ہر نیک و
بد کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرو" مودودی صاحب الفقہ الاکبر سے امام ابوحنیفہ کا قول نقل کرتے ہیں "مومنوں
میں سے ہر نیک و بد کے پیچھے نماز جائز ہے" صد ۲۵۲۔ اِدھر اُدھر جانے کی ضرورت نہیں "خلافتِ
راشدہ" ہی کو دیکھ لیجئے۔

مزید برآں چھ آدمیوں کی انتخابی شوریٰ کے لئے انہوں (حضرت عمرؓ) نے جو ہدایات چھوڑیں ان
میں دوسری باتوں کے ساتھ ایک بات یہ بھی شامل تھی کہ منتخب خلیفہ اس امر کا پابند رہے
کہ وہ اپنے قبیلے کے ساتھ کوئی امتیازی برتاؤ نہ کرے گا مگر بدقسمتی سے خلیفۂ ثالث حضرت عثمان
اس معاملے میں معیارِ مطلوب کو قائم نہ رکھ سکے (خلافت و ملوکیت صد ۹۹)

علاوہ بریں مسندِ خلافت سنبھالنے اور اقتدار پر قبضہ کر لینے کے بعد پہلے خطبہ میں حضرت عثمان
نے خود اپنے جس دستور العمل کا اعتراف اور وعدہ کیا وہ اس پر بھی ثابت قدم نہ رہے۔ چنانچہ
مودودی صاحب رقمطراز ہیں۔

سنو میں پیروی کرنے والا ہوں۔ نئی راہ نکالنے والا نہیں ہوں۔ جان لو کہ کتاب اللہ اور
سُنّتِ رسول اللہ کی پیروی کرنے کے بعد تین باتیں ہیں جن کی پابندی کا میں تم سے عہد کرتا
ہوں۔ ایک یہ کہ میری خلافت سے پہلے تم نے باہمی اتفاق سے جو قاعدے اور طریقے مقرر
کئے تھے ان کی پیروی کروں گا۔ دوسرے یہ کہ جن معاملات میں پہلے کوئی قاعدہ مقرر نہیں
ہوا ہے ان میں سب کے مشورے سے اہلِ خیر کا طریقہ مقرر کروں گا۔ تیسرے یہ کہ تم سے
اپنے ہاتھ روکے رکھوں گا جب تک کہ تمہارے خلاف کوئی کارروائی کرنا قانون کی رُو سے
واجب نہ ہو جائے۔ صد ۹۳۔

سُنّتِ رسول اللہ کی پیروی یہ کی کہ مروان کے باپ حکم بن ابی العاص طریدِ رسول کو واپس مدینے
میں بلا لیا چنانچہ مودودی صاحب حضرت عثمان کی خویش نوازی کی افسوسناک داستان میں رقمطراز

ہیں ۔ صد۱۱۱ ۔

اس معاملہ میں مثال کے طور پر مروان بن الحکم کی پوزیشن دیکھیئے ۔ اُس کا باپ حکم بن ابی العاص جو حضرت عثمان کا چچا تھا فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوا تھا اور مدینہ آ کر رہ گیا تھا مگر اس کی بعض حرکات کی وجہ سے رسول اللہ ؐ نے اُسے مدینے سے نکال دیا تھا اور طائف میں رہنے کا حکم دیا تھا ۔ الخ جب حضرت ابوبکر خلیفہ ہوئے تو اُن سے عرض کیا گیا کہ اسے واپسی کی اجازت دیں مگر اُنہوں نے انکار کر دیا ۔ حضرت عمر کے زمانہ میں بھی اُسے مدینہ آنے کی اجازت نہ دی گئی حضرت عثمان نے اپنی خلافت کے زمانہ میں اس کو واپس بلالیا ۔ اس کی وجہ یہ بیان کی کہ میں نے رسول اللہ سے اس کی سفارش کی تھی اور حضور نے مجھ سے وعدہ فرمالیا تھا کہ اُسے واپسی کی اجازت دے دیں گے ۔

یہ نہیں کہ انہوں نے واپس بلا لینے کی اجازت بھی دی تھی ۔ کیونکہ اگر آپ نے اس کی واپسی کی اجازت دی ہوتی تو حضرت ابوبکر و حضرت عمر کے سامنے حضورؐ کا اجازت نامہ پیش کر کے اس کو ان کے زمانوں میں واپس بلایا جا سکتا تھا کیونکہ اجازت نامے کے ہوتے ہوئے یقیناً وہ دونو اسے واپس آنے کی اجازت دے دیتے ۔ پس پہلے دونو حکمرانوں کا باوجود اصرار کے اجازت نہ دینا اس امر کی قطعی دلیل ہے کہ آپؐ نے اجازت نہیں دی تھی ۔ آگے چل کر لکھتے ہیں ۔

اس طرح یہ دونو باپ بیٹا طائف سے مدینے آ گئے ۔ مروان کے اس پس منظر کو نگاہ میں رکھا جائے تو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اس کا سیکرٹری کے منصب پر مقرر کیا جانا لوگوں کو کسی طرح گوارا نہ ہو سکتا تھا لوگ حضرت عثمان کے اعتماد پر یہ تو مان سکتے تھے کہ حضورؐ نے ان کی سفارش قبول کر کے حکم کو واپسی کی اجازت دینے کا وعدہ فرما لیا ہو (نہ کہ واپسی کی اجازت بھی دے دی ہو) اس لئے اس کا واپس بلالینا قابل اعتراض نہیں ہے (یقیناً قابل اعتراض ہے کیونکہ اجازت نہیں دی تھی ورنہ حضرت ابوبکر و عمر ضرور اجازت دے دیتے) لیکن یہ مان لینا لوگوں کے لئے سخت مشکل تھا کہ رسول اللہ کے اسی معتوب شخص کا بیٹا اس بات کا بھی اہل ہے کہ تمام اکابر صحابہ کو چھوڑ کر اسے خلیفہ کا سیکرٹری بنا دیا جائے خصوصاً جب کہ اس کا وہ معتوب باپ زندہ موجود تھا اور اپنے بیٹے کے ذریعے سے حکومت کے کاموں پر اثر انداز ہو سکتا تھا ۔ صد۱۱۱

دوسرے مقام پر آپ تحریر فرماتے ہیں ۔

محض قابلیت اس بات کے لئے کافی دلیل نہ تھی کہ خراسان سے لے کر شمالی افریقہ تک کا پورا علاقہ ایک ہی خاندان کے گورنروں کی ماتحتی میں دے دیا جاتا اور مرکزی سیکرٹریٹ پر بھی اسی خاندان کا آدمی مامور کر دیا جاتا۔ صد ۱۰۹۔

اب ان تاریخی حقائق کو سامنے رکھ کر یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ جن شرائط کے ماتحت حضرت عثمان کو مجلس شوریٰ کا ممبر بنایا گیا اور جس منشور کی بدولت انہیں مسند اقتدار پر پہنچنا نصیب ہوا اور جن جن امور کی رعایت کا انہوں نے اپنے خطبہ میں وعدہ کیا اُن کی کس طرح دھجیاں اڑائیں اور اس موقف پر وہ ثابت قدم رہنے میں کس طرح ناکام ہوئے۔ جناب مودودی صاحب نے صد ۹۹ پر کھلے لفظوں میں اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ وہ معیارِ مطلوب کو قائم نہ رکھ سکے لیکن آبائی مسلک کی لاج رکھتے ہوئے لیپ پوت کا فریضہ صد ۳۲۲ پر اس طرح انہوں نے ادا فرمایا۔

صلہ رحمی کے شرعی احکام کی تاویل کرتے ہوئے حضرت عثمان نے بحیثیت خلیفہ اپنے اقربا کے ساتھ جو سلوک کیا اس کے کسی جزو کو بھی شرعاً ناجائز نہیں کیا جا سکتا ... اس سلسلہ میں حضرت عمر کی جس وصیت کا میں نے ذکر کیا ہے وہ بھی کوئی شریعت نہ تھی جس کی پابندی حضرت عثمان پر لازم اور خلاف ورزی ناجائز ہوتی۔ صد ۳۲۲

لیجئے حضور، مودودی صاحب نے اس لیپ پوت سے حضرت عثمان کی غلطی پر پردہ ڈالتے ڈالتے خلافتِ راشدہ کی پوری عمارت کو منہدم کر کے رکھ دیا۔ اگر حضرت عمر کا قول حضرت عثمان کے لئے شریعت نہیں اور اُس کی خلاف ورزی ناجائز نہیں تو باقی تمام اُمتِ اسلامیہ پر حضرت عمر کا قول و فعل کیسے شریعت بن گیا اور اس کی خلاف ورزی کیسے ناجائز ہوگئی؟ جب بقول خودش حضرت ابوبکر کی خلافت کی تجویز حضرت عمر نے دلبغیر کسی مشورے کے اور بغیر کسی شرعی نص کے، از خود پیدا کر دی۔ اور پھر بیعت کر لی اور لوگوں سے بھی کرالی تو وہ شرعی خلیفہ کیسے بن گئے اور اس کی خلافت کا عقیدہ شرعی عقیدہ کیسے بن گیا؟ اسی طرح جب ان کا قول بعد والے خلیفہ کے لئے شریعت نہیں تو وہ خود شرعی خلیفہ کیسے ہیں نیز ان کی قائم کردہ مجلسِ شوریٰ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ پھر شیعانِ علی پر ناراضگی کس لئے ہے جب کہ وہ ان کی حکومتوں کو صرف ملوکیت تسلیم کرتے ہیں اور ان کو شرعی طور پر خلیفۂ رسول نہیں مانتے؟ بہر حال جمہوری سلطنت کو اسلامی خلافت کا نام دے دینے کے بعد اس قسم کی اُلجھنوں سے گلو خلاصی کے لئے یہ عقیدہ اسلامی عقیدہ کی حیثیت سے ماننا پڑا کہ خدا کی مخالفت اور عباد اللہ پر ظلم کی بدولت امام معزول نہیں ہو سکتا اُدھر اسی امامت کے عہدہ کے متعلق خداوند کریم کا ارشاد یہ ہے لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ۔ کہ میرا عہد

(عہدۂ امامت ظالموں کو نہیں پہنچ سکتا"

خلیفہ عثمان کے خلاف شورش اور شورشیوں کے مطالبۂ معزولی کو خلافِ قانون قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اگر شکایت رفع نہ بھی ہوئی تو شرعاً اس کی بنا پر خلیفہ کے خلاف بغاوت کر دینے اور اس کی معزولی کا مطالبہ کرنے کا قطعاً کوئی جواز نہ تھا لیکن یہ لوگ ان کی معزولی پر اصرار کرنے لگے حالانکہ ساری دنیائے اسلام کے خلیفہ کو صرف بصرہ و کوفہ و مصر کے دو ہزار آدمی جو خود اپنے علاقوں کے نمایندے بھی نہ تھے معزول کرنے یا اس سے معزولی کا مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہ رکھتے تھے ص۱۱۸ ...

یہ حق انہیں ہرگز نہ پہنچتا تھا کہ اہل حل وعقد نے اُس وقت کے دستورِ اسلام کے مطابق جس شخص کو خلیفہ بنایا تھا اور جسے دنیا کے سب مسلمان خلیفہ مان رہے تھے اس کے خلاف یہ چند آدمی بغاوت کر دیتے اور کسی نمایندہ حیثیت کے بغیر محض اپنے اعتراضات کی بنیاد پر اس کی معزولی کا مطالبہ کرتے۔ ص۱۱۸۔

ان کی عبارت پر غور کرنے سے یہ سوالات ضرور ہر ناقد بصیر انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) جو شخص صرف مقامی چھ آدمیوں کی شوریٰ سے تمام دنیائے اسلام کا خلیفہ بن سکتا ہے وہ بصرہ و کوفہ و مصر یعنی اطرافِ مملکت سے چنے ہوئے دو ہزار انسانوں کے مطالبہ سے کیوں معزول نہیں کیا جا سکتا؟

(۲) خلیفہ کی اقربا نوازی اور اُن میں سے بعض کی نااہلیت کی شکایات جب عام تھیں اور لوگوں میں اضطراب کی اچھی خاصی لہر دوڑ چکی تھی تو کیا کوفہ و بصرہ و مصر سے اتنا دُور دراز کا سفر طے کرکے مقامی شکایات دار الحکومت تک لے جانے کے لئے علاقائی نمایندگی حاصل کئے بغیر وہ دوڑ آئے تھے؟ کیا یہ شکایات لانے والے اپنے اپنے علاقوں کے چند ناعاقبت فہم اور ان پڑھ گڈریے تھے جنہیں اتنا ہوش بھی نہ تھا کہ دار الحکومت کی طرف مطالبات لے جانے کے لئے علاقائی نمایندگی کی سند بھی ضروری ہوتی ہے؟۔

(۳) کیا اسلامی جمہوریت کا تقاضا یہی ہے کہ جمہوری حکمران اگرچہ کنبہ پروری کرتا ہو۔ خدا کی اطاعت سے باہر ہو جائے۔ نااہل افسر مقرر کر کے ان کو لوگوں کی گردنوں پر سوار کر دے کہ وہ لوگوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ گراتا رہے تاہم نہ وہ معزول ہو سکتا ہے اور نہ اُسے معزول کیا جا سکتا ہے؟ بلکہ عوام کو یہ حق بھی حاصل نہیں کہ اس سے معزولی کا مطالبہ کریں تاکہ خوشگوار انقلاب رونما ہو کر امن و سکون بحال ہو سکے؟

(۴) تنہا شورشی نہ تھے بلکہ مدینہ کے اہل حل وعقد جن کو خلیفہ سازی کا اختیار حاصل تھا۔ ان کی اکثریت بھی ان کے ہمنوا تھی جس کا مودودی صاحب مختلف مقامات پر اعتراف بھی کر چکے ہیں تو ایسے حالات میں ان کو معزولی کے مطالبہ کا حق کیوں حاصل نہ تھا؟ بیرونجات کے دو ہزار نمائندوں کے علاوہ صحابی اور صحابی زادے اس تحریک میں شامل تھے صد ۳۲۹۔ اکابر صحابہ خلیفہ سے ناراض تھے صد ۳۲۹ حضرت طلحہ۔ حضرت زبیر اور حضرت عائشہ بھی ناراض تھے صد ۲۳۲۔ دار الحکومت (مدینہ) کی اچھی خاصی تعداد ان کے ہم خیال تھی صد ۲۳۵ بلکہ صرف چار آدمیوں کے علاوہ کوئی ایک بھی خلیفہ کے حق میں زبان نہیں کھولتا تھا صد ۲۳۰ حضرت علی بھی خلیفہ کی اصلاح سے مایوس ہو گئے تھے صد ۲۳۲۔ اب انصاف سے فرمائیے کہ اگر باہر سے آنے والے شورشی بقول آپ کے نمایندہ حیثیت نہیں رکھتے تھے تو چار آدمیوں کے سوا سب اہل مدینہ جو بقول آپ کے اس زمانے کے اہل حل وعقد تھے اُن میں سے جب خلیفہ کی حمایت میں زبان کھولنے والا کوئی نہ تھا تو اس کا مثبت پہلو یہی ہے کہ وہ سب بیرونجات کے نمایندوں کے مؤید تھے جن کے مطالبات میں سے اہم مطالبہ خلیفہ کی معزولی کا تھا اور جب بات چیت سے کامیابی نہ ہوئی تو آخری حربہ قتل ہی تھا اور اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار ہی نہ تھا کیونکہ پوری دنیائے اسلام میں کئے جانے والے مظالم کا سدباب اس کے بغیر ممکن نہ تھا اور سابقہ حوالوں کی بنا پر قتل کرنے والوں کو تمام اہل حل وعقد کی عملی تائید حاصل تھی اور یہی وجہ ہے کہ اس قتل کے بعد اہل مدینہ میں سے کسی نے بھی قاتلین سے قصاص کا مطالبہ نہیں کیا اور طلحہ و زبیر و عائشہ نے اپنی ذاتی اغراض کے پیش نظر قصاص کے بہانہ سے جنگ جمل کا اقدام کیا تو بقول مودودی صاحب وہ خود اس حرکت پر پشیمان تھے اور حضرت عائشہ اپنی اس غلطی پر تازلیست روتی رہیں اور میں نے ذاتی اغراض کی بنا اس لئے کہی ہے کہ اگر خون عثمان کا بدلہ لینا مقصود ہوتا تو قاتلین مدینہ میں موجود تھے اور حضرت علی بھی مدینہ ہی میں موجود تھے۔ بصرہ میں جا کر عثمان بن حنیف گورنر بصرہ صحابئ رسولؐ پر ظلم کرنا اور بے گناہ بصریوں کو ستانا کسی طرح عثمان کے قتل کا بدلہ نہیں قرار دیا جا سکتا تھا۔

جب عقلی طور پر ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تو پھر وہی ایک بات ہے کہ شرعی طور پر امام کو معزول نہیں کیا جا سکتا خواہ ظالم و فاسق ہو پس وہ نماز میں بھی مقتدا بن سکتا ہے خواہ ولید بن عقبہ دور عثمانی کے کوفی گورنر کی طرح شراب پی کر صبح کی نماز چار رکعت ہی کیوں نہ پڑھا دے صد ۱۱۲۔

یہ واضح رہے کہ حضرت عثمان کو قتل اس وقت کیا گیا جب کہ اصلاحی اقدامات بالکل حدِ مایوسی تک پہنچ چکے تھے اور مسلمانوں کے لئے خلیفہ کے قتل کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا اور حضرت عائشہ ہی نے تو سب سے پہلے ان کے قتل کا فتویٰ سرزد فرمایا تھا اور اس کی مثال اس طرح تھی جس طرح جسم میں خراب د

فاسد عضو کا حتی الامکان علاج کیا جاتا ہے لیکن جب پوری طرح مایوسی ہو جائے تو پورے جسم میں اس کے خراب مادہ کی سرایت کو روکنے کے لئے اسی ایک عضو کو ہی کاٹ دینا زیادہ مناسب ہوتا ہے تاکہ باقی جسم اس کے فساد سے متاثر نہ ہو اور بڑھتی ہوئی بے چینی کو روک کر امن و سکون کا سانس لیا جائے اور یہ کہنا کہ عام شورشی لوگوں نے قتل کر دیا بالکل غلط ہے۔ قتل کا ارتکاب کرنے والے کوئی بصری و مصری نہ تھے بلکہ مدنی ہی تھے ایک خلیفہ اول حضرت ابوبکر کے صاحب زادے حضرت محمد بن ابی بکر مدینہ کی مشہور و معروف شخصیت صاحب علم و فضل اور با اثر تابعی تھے دوسرے حضرت عمرو بن الحمق خزاعی صحابی رسولؐ مدینہ کے رہنے والے تھے اور تیسرے ان کے ہمراہ حضرت مالک اشتر تھے جو زہد و تقویٰ میں یکتائے روزگار تھے۔ نیز یہ کہنا کہ "حضرت عائشہ یہ کہہ کر مدینہ سے مکہ چلی گئیں کہ اس طوفان بدتمیزی میں کیا میں بھی اپنی توہین کراؤں ؟ "صلا۱۱ محض تاریخی حقائق سے چشم پوشی اور واقعات کا منہ چڑانا ہے۔ حضرت عائشہ خلیفہ اول کی صاحبزادی صحابیہ اور حرم رسول اللہ ہونے کی وجہ سے عامۃ المسلمین کے نزدیک بہت بلند مقام پر فائز تھیں ان کے اشارے سے شورش ختم ہو سکتی تھی جب کہ ان کا نمایندہ ان کا سگا بھائی حضرت محمد بن ابی بکر تھا لیکن وہ خود بھی خلیفہ کی پالیسی سے تنگ دل ہو چکی تھیں اور اُسے عضو فاسد کی طرح الگ کرنا زیادہ موزوں سمجھتی تھیں اور اُقْتُلُوا نَعْثَلًا فَاِنَّہٗ کَفَرَ (تذکرۃ الخواص) کا فتویٰ جاری کر کے مکہ کی طرف تشریف لے گئی تھیں جس کا اشارہ خود مودودی صاحب نے خلافت و ملوکیت صـ۲۳۲ پر کر دیا ہے۔ اور جب اکابر صحابہ اور مدینہ کی اچھی خاصی تعداد بلکہ چار آدمیوں کے سوا سب اہل مدینہ حضرت عثمان کی حمایت میں زبان نہ کھولتے تھے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ حضرت عائشہ کے فتویٰ سے متفق تھے اور قتل کا ارتکاب کرنے والے بھی صحابی و صحابی زادے تھے تو اب اس نتیجہ تک پہنچنا بالکل آسان ہے کہ اُس کا قتل شرعی لحاظ سے صرف جائز ہی نہیں بلکہ واجب تھا اور جن اہل حل و عقد میں سے بعض کا اقدام اور دوسروں کی خاموشی شرعی خلیفہ بنا سکتی تھی تو کیا انہی اہل حل و عقد میں سے بعض کا اقدام اور باقیوں کی خاموشی سے یہ مطلب نہیں نکلتا کہ یہ فعل شرعی اعتبار سے درست تھا اور اہل مدینہ کے اجماع سے تھا اور یہی وجہ ہے کہ جس صحابی اور صحابی زادے نے خلیفہ کو قتل کر دیا تھا وہ مسجد نبوی میں نماز پڑھتے تھے اور حضرت علیؑ کی بیعت میں بھی شامل تھے اور حضرت عثمان کے قتل پر اہل مدینہ اس قدر خوش تھے کہ خلیفہ مقتول کی لاش کو تین دن تک دفن کرنا بھی انہوں نے مناسب نہ سمجھا اور نہ کسی نے جنازہ پڑھنے کی زحمت گوارا کی۔ (تاریخ خمیس صـ۲۶۵ تاریخ کامل ج۳ صـ۸۰ حیاۃ الحیوان ج۱ صـ۵۱)

مودودی صاحب نے یہ عذر تو پیش کر دیا ہے کہ قاتلین سے سردست بدلا لیا جانا ممکن نہ تھا

لیکن جب وہ حضرت علی کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے اور اطاعت کا عہد کر چکے تھے تو کیا خلیفہ مقتول کے دفن وجنازہ سے بھی وہ مانع تھے؟ ان کی دشمنی خلیفہ کے غلط کردار سے تھی نہ کہ ان کی میت سے اور لُطف یہ کہ اہل مدینہ میں سے کسی نے بھی مقتول کی تجہیز وتکفین وجنازہ کو ضروری نہ سمجھا[1] اس سے صاف یہی مطلب نکلتا ہے کہ حضرت علی کے نزدیک بلکہ تمام اہل مدینہ اکابر صحابہ اور ارباب حل و عقد کے نزدیک وہ واجب القتل تھا حتیٰ کہ اس کا جنازہ بھی غیر ضروری تھا پس راتوں رات ان کے کنبہ کے چند افراد نے گھر سے اٹھا کر حش کوکب میں اس کو دفن کر دیا اور معاویہ نے اپنے عہدِ حکومت میں جنت البقیع کی ملحقہ دیوار کو گرا کر اس جگہ کو جنت البقیع میں شامل کر دیا[2] اور اب تک دیوار کا موڑ دیکھنے والوں کو اس الحاق کا پتہ دے رہا ہے۔ بنابریں حضرت علی اور جملہ اکابر صحابہ کے نزدیک قاتلین عثمان سے انتقام لینا غیر ضروری تھا کیونکہ اُنہوں نے ایک عضو فاسد کو قطع کر کے پُوری مملکت کے عوام کو اطمینان وسکون کا سانس دلایا اور ان کو بنی اُمیہ کے ظالم گورنروں کی گرفت سے نجات دی۔ اور یہی وجہ ہے کہ طلحہ وزبیر نے فتنہ کھڑا کر کے یکسوئی اختیار کر لی اور حضرت عائشہ بھی نادم ہو کر بیٹھ گئیں اور اہلِ مدینہ میں سے کسی نے بھی انتقام کا نام تک نہیں لیا البتہ معاویہ اور بنی اُمیہ کے باقی افراد صرف حکومت کو اپنے خاندان میں جذب کرنے کی غرض سے انتقام کی رٹ لگاتے رہے تاکہ وہ اس بہانہ سے اقتدار کی بنیادوں کو مضبوط کر سکیں۔ پس حضرت علیؑ کا قاتلینِ عثمان سے انتقام نہ لینا بلکہ عہدوں سے سرفراز کرنا قطعاً غلط نہ تھا بلکہ صحیح اقدام تھا۔

اسلام کے اصولِ حکمرانی اور خلافت راشدہ کی خصوصیات پر دعوتِ فکر

اسلام کے اصولِ حکمرانی جناب مودودی صاحب نے اسلام کے اصولِ حکمرانی ۹ بیان فرمائے ہیں۔ ہم مختصراً وہ گنوا دیتے ہیں تاکہ اسلامی حکومتوں کے کردار کے سمجھنے میں آسانی ہو[3] (ملاحظہ ۲۱ تا ۲۴)

۱۔ قانونِ خداوندی کی بالاتری اس ریاست کا اولین بنیادی قاعدہ یہ تھا کہ حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اور اہلِ ایمان کی حکومت دراصل "خلافت" ہے جسے مطلق العنانی کے ساتھ کام کرنے کا حق نہیں ہے بلکہ اس کو لازماً اس قانونِ خداوندی کے تحت رہ کر ہی کام کرنا چاہیئے۔

---

[1] تاریخ طبری جلد ۵ صفحہ ۱۴۲۔ الامامۃ والسیاسۃ صفحہ ۴۲ [2] حُش کوکب جنت البقیع سے باہر ایک مقام تھا جہاں یہود اپنے مردوں کو دفن کرتے تھے۔ معاویہ نے اپنے دورِ حکومت میں اس کو بقیع میں شامل کر لیا اور لوگوں کو حکم دیا کہ اس قبر (عثمان) کے اردگرد مسلمانوں کی قبریں بنائی جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا پس وہ مقام مقابرِ مسلمین سے متصل ہو گیا۔ تاریخ کامل ج ۳

صفحہ تاریخ طبری ج ۵ صفحہ ۱۴۲ اصابہ ابن حجر ج ۱ صفحہ ۲۲۴ ذیل ترجمہ جبلہ بن عمرو (ملک النجاۃ)

جس کا ماخذ خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت ہے۔

۲۔ عدل بین الناس

دوسرا قاعدہ جس پر ریاست کی بنیاد رکھی گئی تھی یہ تھا کہ قرآن وسنت کا دیا ہُوا قانون سب کے لئے یکساں ہے اور اس کو مملکت کے ادنیٰ ترین آدمی سے لے کر مملکت کے سربراہ تک سب پر یکساں نافذ ہونا چاہیئے کسی کے لئے بھی اس میں امتیازی سلوک کی کوئی گنجائش نہیں ہے

۳۔ مساوات بین المسلمین

تمام مسلمانوں کے حقوق بلالحاظ رنگ ونسل وزبان ووطن بالکل برابر ہیں۔ کسی فرد، گروہ، طبقے یا نسل وقوم کو اس ریاست کے حدود میں نہ امتیازی حقوق حاصل ہو سکتے ہیں اور نہ کسی کی حیثیت کسی دوسرے کے مقابلہ میں فروتر قرار پا سکتی ہے۔

۴۔ حکومت کی ذمہ داری وجوابدہی

چوتھا اہم قاعدہ جس پر یہ ریاست قائم ہوئی تھی یہ تھا کہ حکومت اور اس کے اختیارات اور اموال خدا اور مسلمانوں کی امانت ہیں جنہیں خداترس ایماندار اور عادل لوگوں کے سپرد کیا جانا چاہیئے اس امانت میں کسی شخص کو من مانے طریقے پر یا نفسیاتی اغراض کے لئے تصرف کرنے کا حق نہیں ہے اور جن لوگوں کے سپرد یہ امانت ہو وہ اس کے لئے جواب دہ ہیں۔

۵۔ شوریٰ

اس ریاست کا پانچواں اہم قاعدہ یہ تھا کہ سربراہِ ریاست مسلمانوں کے مشورے اور ان کی رضامندی سے مقرر ہونا چاہیے اور اُسے حکومت کا نظام بھی باہمی مشورے سے چلانا چاہیے۔

۶۔ اطاعت فی المعروف

چھٹا قاعدہ جس پر یہ ریاست قائم کی گئی تھی یہ تھا کہ حکومت کی اطاعت صرف معروف میں واجب ہے معصیت میں کسی کو اطاعت کا حق نہیں پہنچتا۔ دوسرے الفاظ میں اس قاعدے کا مطلب یہ ہے کہ حکومت اور حکام کا صرف وہی حکم ان کے ماتحتوں اور رعیت کے لئے واجب الاطاعت ہے جو قانون کے مطابق ہو قانون کے خلاف حکم دینے کا نہ انہیں حق پہنچتا ہے اور نہ کسی کو اس کی اطاعت کرنی چاہیئے۔

۷۔ اقتدار کی طلب وحرص کا ممنوع ہونا

یہ قاعدہ بھی اس ریاست کے قواعد میں سے تھا کہ حکومت کے ذمہ دارانہ مناصب کے لئے عموماً اور خلافت کے لئے خصوصاً وہ لوگ سب سے زیادہ غیر موزوں ہیں جو خود عہدہ حاصل کرنے کے طالب ہوں اور اس کے لئے کوشش کریں۔

۸۔ ریاست کا مقصدِ وجود

اس ریاست میں حکمران اور اس کی حکومت کا اولین فریضہ یہ قرار دیا گیا تھا کہ وہ اسلامی نظامِ زندگی کو کسی ردّ و بدل کے بغیر جوں کا توں قائم کرے اور اسلام کے معیارِ اخلاق کے مطابق بھلائیوں کو فروغ دے اور برائیوں کو مٹائے۔

۹۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا حق اور فرض

اس ریاست کے قواعد میں سے آخری قاعدہ جو اس کو صحیح راستہ پر قائم رکھنے کا ضامن تھا یہ تھا کہ مسلم معاشرے کے ہر فرد کا نہ صرف یہ حق ہے بلکہ یہ اس کا فرض بھی ہے کہ کلمۂ حق کہے، نیکی و بھلائی کی حمایت کرے اور معاشرے یا مملکت میں جہاں بھی غلط اور ناروا کام ہوتے نظر آئیں ان کو روکنے میں اپنی حدتک پوری کوشش صرف کرے۔

دعوتِ فکر

پانچویں اصل "شوریٰ" صرف اپنے مسلک کی اتباع میں شامل کر لی گئی ہے۔ ورنہ قرآن مجید نے قطعاً کہیں بھی سربراہِ مملکت کے انتخاب کو شوریٰ کے سپرد نہیں فرمایا اور نہ یہ عہدہ عوام کے انتخاب سے حاصل ہو سکتا ہے اور عوام جس کو چنیں گے وہ بادشاہ یا صدر رہے گا لیکن خدا کی جانب سے واجب الاطاعت مملکتِ اسلامیہ کا سربراہ نہ ہوگا بلکہ مملکتِ اسلامیہ کا واجب الاطاعت سربراہ وہی ہو سکتا ہے جسے خدا نامزد کرے اور وہ نبی و رسول ہوگا یا جسے رسول نامزد کر کے جائے اس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

ساتویں اصل "اقتدار کی طلب وحرص کا ممنوع ہونا" یہ بھی ایک ناقابلِ فہم بلکہ بعید از عقل بات ہے کیونکہ اگر ایک شخص اپنے اندر خدمتِ قوم و ملک کا جذبہ رکھتا ہو اور اپنے اندر ملتِ اسلامیہ کے تقاضوں کو پورا کرنے کی اہلیت بھی رکھتا ہو اور اسی مخلصانہ جذبہ کے تحت خلافت کے لئے یا کسی ذمہ دارانہ منصب کے لئے خود کو پیش کرے یا اس کے لئے کوشش کرے تو وہ کیوں کر غیر موزوں قرار دیا جائے۔ اگر وہ خود خاموشی اختیار کرے اور دوسرے لوگ اس کی خاموشی کو اس کی نااہلیت کی دلیل سمجھتے رہیں کیونکہ وہ غیب دان تو ہیں نہیں پس دریں حالات کوئی نااہل برسرِ اقتدار آ جائے جو دقارِ ملک و ملت اور عزتِ قوم و مذہب کے لئے سخت مضر ہو تو کیا ایسے

خاموش رہنے والے انسان کو خدا کے ہاں جواب دہ نہ ہونا ہوگا؟ اور کیا ایسا شخص ضمیر فروش بلکہ اسلام دشمن نہ سمجھا جائے گا جس نے دیدہ دانستہ ملت و ملک کو قعرِ ہلاکت میں گرنے سے بچا سکنے کے باوجود نہ بچایا اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکنے کے باوجود ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہا۔

تیسرے اور پانچویں اُصول کے پیش نظر حضرت عمر نے کس حیثیت سے حضرت ابوبکر کا نام پیش کر کے فوراً بیعت کر لی اور لوگوں کو بیعت کرنے پر مجبور کیا کیونکہ نام پیش کرنے سے نہ شوریٰ مکمل ہوتا ہے اور نہ خلافت بنتی ہے پس فوراً بیعت کا اقدام ایک سوچے سمجھے منصوبے کو ظاہر کرتا ہے جس پر عمل کر کے بعد والوں کے لئے حرام قرار دے دیا گیا۔ اس کو اگر اقتدار کی ہوس نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے؟ اور کیا چوتھی اصل کی رُو سے اللہ اور مسلمانوں کی امانت کا پہلے دن سے ہی جنازہ نہیں نکلا؟

خلافتِ راشدہ کی خصوصیات

مودودی صاحب نے خلافتِ راشدہ کے سات خصوصیات شمار کئے ہیں۔

(۱) انتخابی خلافت:۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کے لئے حضرت ابوبکر کو حضرت عمر نے تجویز کیا اور مدینے کے تمام لوگوں نے (جو درحقیقت اس وقت پُورے ملک میں عملاً نمایندہ حیثیت رکھتے تھے) کسی دباؤ یا لالچ کے بغیر خود اپنی رضا و رغبت سے انہیں پسند کر کے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ص۸۳۔

دعوتِ فکر۔ سوچنے کے قابل بات ہے کہ حضرت عمر کو یہ حق کیسے پہنچا کہ ایک شخص کا از خود نام تجویز کر دیں نہ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کو یہ اختیار دیا تھا اور نہ ان پر وحی اُترتی تھی۔ البتہ یہی ایک صورت ہے کہ سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت یہ کھیل کھیلا گیا۔ اور مقصد برآری کے بعد دوسرے لوگوں کے لئے اس طریق کار کو ناجائز قرار دیا گیا۔ اس کا صاف مطلب یہی نکلتا ہے کہ یہ طریقہ آئینِ اسلامی کے خلاف تھا ورنہ ہمیشہ کے لئے اس کو جائز ہونا چاہیے تھا پس خلافتِ راشدہ کے دیدہ زیب محل کی بنیاد ہی کھوکھلی نکلی نہ اس کا تیار شدہ نقشہ آئینِ اسلامی کے مطابق تھا اور نہ اس کے سنگِ بنیاد کو حق طلبی و حق کوشی کی خاطر نصب کیا گیا تھا۔

اجتماعی خلافت کے تحت میں فرماتے ہیں " اہلِ ایمان کی جماعت کا ہر فرد خلافت میں برابر کا حصہ دار ہے کسی شخص یا طبقہ کو عام مومنین کے اختیاراتِ خلافت سلب کر کے انہیں اپنے اندر مرکوز کر لینے کا حق نہیں ہے نہ کوئی شخص یا طبقہ اپنے حق میں خدا کی خصوصی خلافت کا دعوےٰ کر سکتا ہے۔ یہی چیز اسلامی خلافت کو ملوکیت .... سے الگ کر کے اسے جمہوریت کے رخ پر

موڑتی ہے۔ حد ۳۶

اس قاعدے کا صاف یہ مطلب ہے کہ حضرت عمر کو عام مومنین کے اختیاراتِ خلافت سلب کرکے اپنے اندر مرکوز کرتے ہوئے حضرت ابوبکر کا نام پیش کرنے کا کوئی حق نہیں تھا بنا بریں یہ قائم شدہ حکومت اسلامی خلافت نہیں تھی بلکہ ملوکیت ہی ملوکیت تھی جو ڈکیٹیٹری کے باوجود جمہوریت کا لباس اوڑھے رہی۔

اگر اس فعل میں ذرا بھر بھی خلوص ہوتا تو نام تجویز کرنے کے بعد رائے عامہ کو ہموار کیا جاتا اور سقیفۂ بنی ساعدہ کے بجائے اُمتِ اسلامیہ کے اس اہم کام کی انجام دہی کے لئے مسجد نبوی کو تجویز کیا جاتا جب رائے عامہ ہموار ہو جاتی خواہ اہل مدینہ کو ہی کافی سمجھ لیا جاتا۔ اس کے بعد اس کو خلیفہ سمجھتے ہوئے بیعت کے لئے ہاتھ بڑھائے جاتے کیونکہ نام تجویز ہوتے ہی خلیفہ نہیں بن جاتا بلکہ اہل حل وعقد کی رائے اور اتفاق کے بعد ہی وہ صحیح خلیفہ قرار پا سکتا ہے۔ بنا بریں حضرت عمر کا حضرت ابوبکر کے نام کو تجویز کرنے کے بعد فوراً اور سب سے پہلے بیعت کر لینا کونسا آئین اسلامی تھا اور دوسرے لوگوں کو بیعت کی پیشکش کرنا کس اسلامی قانون کے ماتحت تھا؟ منصف مزاج انسان اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اقتدار حاصل کرنے کا یہ ایک بہانہ تھا جب کامیابی ہوگئی تو مسجدِ نبوی میں اعلان کیا گیا اور عوام کو بیعت کی طرف کھینچ لایا گیا گویا رائے عامہ کے ہموار ہونے اور اہل حل وعقد کے اتفاق کر لینے کے بعد خلافت نہیں بنی بلکہ خلافت (حکومت) پر قبضہ کر لینے کے بعد رائے عامہ کو بھی ہموار کیا گیا اور اہل حل و عقد کو بھی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور کر لیا گیا۔ کتب سیر میں اس قصہ کی افسوسناک تفصیل اب تک محفوظ ہے۔

مودودی صاحب تاریخ کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔ "مدینے کے تمام لوگوں نے کسی دباؤ یا لالچ کے بغیر خود اپنی رضا و رغبت سے انہیں پسند کر کے ان کے ہاتھ پر بیعت کی" حالانکہ کتب سیر میں اس دھاندلی کی عبرت ناک المناک اور افسوسناک داستان اب تک جوں کی توں موجود ہے اور منصف مزاج انسان اس فیصلے پر پہنچتا ہے کہ اس سے بڑھ کر دھونس و دھاندلی شاید کسی جمہوری حکومت کے انعقاد میں رونما نہیں ہوئی ہوگی جو سقیفائی جمہوری خلافت کے وقت ہوئی تھی۔ سعد بن عبادہ انصاری نے بیعت کرنے سے انکار کیا تو مودودی صاحب نے اسے قبائلی عصبیت کا نام دے دیا۔ حضرت علی اور جملہ خاندانِ بنی ہاشم نے بیعت سے انکار کیا اور سخت احتجاج بھی کیا اسی طرح حضرت زبیر نے بیعت سے انکار کیا لیکن مودودی صاحب نے

ان کا ذکر تک نہیں کیا اور حکومتِ وقت نے انکار کرنے والوں کا سختی سے محاسبہ کیا اور بزور ان کو بیعت کے لئے لایا گیا۔ (الامامت والسیاست)

مودودی صاحب نے اہلِ مدینہ کو پورے ملک اسلامی کا نمائندہ قرار دے دیا ہے حالانکہ نہ تو جناب رسالت مآبؐ نے ان کی نمائندگی پر کوئی نص فرمائی اور نہ قرآن مجید میں کوئی اس قسم کا اشارہ موجود ہے۔ قرآن کا صاف فرمان ہے کہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ اللہ کے نزدیک زیادہ عزت دار وہی ہے جو زیادہ متقی ہو۔ اس قاعدے کے ماتحت خواہ کوئی مکی ہو یا مدنی ہو۔ عربی ہو یا ایرانی ہو سیاہ ہو یا سفید سب برابر ہیں اور تقویٰ ہی بعض کی بعض پر بلندی کا سبب ہے۔ اسی طرح احادیثِ نبویہ میں بھی سب انسانوں کو اسلامی معاشرہ میں برابر کا شریک قرار دیا گیا ہے بلکہ خود مودودی صاحب اسلامی ریاست کے خصوصیات میں تحریر فرماتے ہیں کہ "وہ حدودِ ریاست میں رہنے والے تمام اہل ایمان کو خدا کی خلافت کا حامل قرار دیتی ہے اور حل و عقد کے آخری اختیارات مجموعی طور پر ان کے حوالے کرتی ہے۔ صہ ۵۵۔ آبائی کورانہ تقلید کے شکنجے میں گرفتار محقق جس قاعدے کو ایک جگہ پختہ کرتا ہے دوسری جگہ خلافت راشدہ کے حرکات و سکنات اس کے قاعدے کی دھجیاں اڑا دیتے ہیں۔ وہ بے چارا نہ اپنے قاعدے سے دست بردار ہوتا ہے اور نہ خلافت راشدہ کو چیلنج کر سکتا ہے چنانچہ اس نے جمہور اہل اسلام کے مسلک کی تصحیح کے فرائض کو انجام دیتے ہوئے جمہوری خلافتوں کے انعقاد کے وقت کی دھاندلیوں سے جان چھڑانے اور سلاطین وقت کے اقتدار کو اسلامی خلافت ثابت کرنے کے لئے تاریخ کا منہ چڑاتے ہوئے یہ عذر لنگ پیش کیا ہے۔ خلافت و ملوکیت صہ ۳ پر ملاحظہ فرمائیے۔

> اب نہ اسے ہم چھپا سکتے ہیں نہ لوگوں سے کہہ سکتے ہیں کہ تم تاریخ اسلام کے اس دور کا مطالعہ نہ کرو اور نہ خلقِ خدا کو اس پر کلام کرنے سے روک سکتے ہیں۔ اگر ہم صحت نقل اور معقول و مدلل اور متوازن طریقے سے اس تاریخ کو خود بیان نہ کریں گے تو مغربی مستشرقین اور غیر معتدل ذہن و مزاج رکھنے والے مسلمان مصنفین جو اسے نہایت غلط رنگ میں پیش کرتے رہے ہیں اور آج بھی پیش کر رہے ہیں، مسلمانوں کی نئی نسل کے دماغ میں اسلامی تاریخ ہی کا نہیں بلکہ اسلامی حکومت اور اسلامی نظام زندگی کا بھی غلط تصور بٹھا دیں گے۔ الخ

مقصد یہ ہے کہ جب تک تاریخ کے چہرے کو مسخ کر کے جمہوری حکومتوں کو اسلامی خلافتیں ثابت کرنے کے لئے ہم خود نہ واقعات کو اپنی صوابدید سے مرتب کریں گے اور گذشتگان کی غلط کاریوں

پرلیپ پوت کی چادر چڑھا کر صحیح نہ ثابت کریں گے تو ممکن ہے مسلمانوں کی نئی پود حقیقت سے واقف ہو کر خلافت راشدہ کو بادشاہت و ملوکیت کا نام دے دے اور جمہور اہل اسلام کا سارا منصوبہ خاک میں مل جائے لیکن انہیں یہ معلوم نہیں۔ ع خوشبو آ نہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے۔

دوسری خصوصیت۔ شوروی حکومت۔ اس کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ چاروں خلفاء حکومت کے انتظام اور قانون سازی کے معاملہ میں قوم کے اہل الرائے لوگوں سے مشورے کئے بغیر کام نہیں کرتے تھے، حالانکہ کتاب کی تفصیلی ابحاث میں اس کی کھلی تردید موجود ہے۔ حضرت ابوبکر کا نام تجویز کرتے ہوئے حضرت عمر نے قطعاً اہل الرائے لوگوں سے مشورہ نہیں لیا تھا اور حضرت علی وعباس و زبیر وغیرہ جیسے اکابر کو بھی اس بارے میں نظر انداز کرتے ہوئے خلافت کی کھچڑی تیاری کرلی تھی۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر نے برسر اقتدار ہوتے ہوئے بلا کسی مشورہ کے حضرت عمر کو نامزد کر کے اپنے اقتدار کے زیر سایہ لوگوں سے بعیت لے لی تھی۔ اور لطف یہ کہ معاویہ نے یزید کے لئے حکومت کی راہیں اسی طرح ہموار کیں تو وہ ملوکیت ہوگئی اور حضرت ابوبکر نے عمر کے لئے وہی طریقہ اختیار کیا تو خلافت راشدہ قرار پائی اور شوروی حکومت بھی اُسے کہا گیا۔ اور طرہ یہ کہ کتاب کے اکثر و بیشتر حصہ میں حضرت عثمان کی اقربا نوازی کو بیان کیا اور جا بجا یہ واضح کیا کہ اہل الرائے حضرات اس کے اس فعل سے ناراض تھے، چنانچہ صحابہ کبار کو مناصب حکومت سے بلا وجہ معزول کر کے اپنے خاندان کے نااہل افراد کو لوگوں کی گردنوں پر سوار کر دیا اور قطعاً اس بارے میں اہل الرائے سے مشورہ لینا کبھی گوارا نہ کیا۔ بلکہ اہل الرائے کے ٹوکنے کے باوجود بھی وہ باز نہ آئے حتیٰ کہ ان کی اپنی بیوی بھی ان کی اس جنبہ داری سے نالاں تھی اور صحابہ و صحابہ زادوں کی اکثریت اس سے متنفر ہو چکی تھی جو بالآخر اس کے قتل تک منتہی ہوئی اس حقیقت کے اعتراف کے باوجود یہ کہنا کہ اہل الرائے لوگوں کے مشورے کے بغیر کام نہیں کرتے تھے! کس قدر جرائت و جسارت ہے؟

تیسری خصوصیت۔ بیت المال کے امانت ہونے کا تصور۔ اس ذیل میں حضرت ابوبکر و حضرت عمر و حضرت علی کی مثالیں گنوائی ہیں اور حضرت عثمان کو شامل کرنے کی جرائت نہیں کی کیونکہ وہ صلہ رحمی کے نام سے بیت المال کے دروازے اہل خاندان کے لئے کبھی بند نہیں کرتے تھے۔ یہ صلہ رحمی بھی عجیب ہے کہ اپنی گرہ سے امداد کرنے کے بجائے بیت المال (جو تمام مسلمانوں کا مشترکہ ہے) سے کنبہ پروری ہوتی ہے اور لطف یہ کہ اس صلہ رحمی کا معنی سوائے عثمان کے اور کسی صحابی یا صحابی زادے کے ذہن میں نہیں تھا ورنہ وہ قطعاً معترض نہ ہوتے۔

حضرت ابوبکر کی احتیاط کے متعلق فدک کے بارے میں رقمطراز ہیں (حضرت ابوبکر نے اسے حضور کی میراث میں آپ کی صاحبزادی تک کو دینے سے انکار کر دیا تھا مگر مروان بن الحکم نے اپنے زمانہ خلافت میں اسے اپنی ملک اور اپنی اولاد کی میراث بنالیا تھا ص ۱۶۲

مودودی صاحب نے بڑے اچھوتے انداز سے خلیفہ کے غاصبانہ تصرف کو تقدس کا لباس دیا فرماتے ہیں بیت المال کا اسلامی تصور یہ تھا کہ وہ خلیفہ اور اس کی حکومت کے پاس خدا اور خلق کی امانت ہے ص ۱۶۱۔ حضرت عثمان اور اس کی حکومت نے تو اس امانت خلق کو صلہ رحمی کے بہانہ سے اقربا پروری کی بھینٹ چڑھا دیا۔ اور حضرت ابوبکر نے جناب فاطمہ کی ذاتی املاک کو جو نبی کریمؐ سے ان کو ورثہ میں پہنچی تھیں بحق سرکار ضبط کر کے بیت المال میں شامل کر لیا۔ (اس بہانہ سے کہ نبیوں کا متروکہ مال صدقہ ہوا کرتا ہے)۔

حالانکہ قرآن مجید کی آیات توریث میں نبیوں کا کوئی استثناء نہیں ہے۔ اور خبر واحد قرآن کی ناسخ نہیں ہو سکتی۔ بہرکیف اس مقام پر موضوع فدک پر مناظرہ مقصود نہیں ہے۔ البتہ سوچنے کا مقام ہے کہ ایک طرف سخت گیری اور تنگ نظری کا یہ عالم کہ ذاتی املاک کو بیت المال میں شامل کرتے ہوئے اولادِ رسول کی رنجش کی پرواہ نہیں کی جاتی اور دوسری طرف دریا دلی کی یہ حد کہ اپنے اقرباء و خاندان کے لئے صلہ رحمی کے بہانہ سے بیت المال کے دروازے کھلے ہیں اور طرہ یہ کہ افراط و تفریط کے دونو پہلو خلافتِ راشدہ کی حدود کی وسعتوں میں بلا چون وچرا سما سکتے ہیں اور سموئے جا سکتے ہیں ان میں سے کسی پہلو پر بھی زبان کشائی، اسلامی نظام حکومت کی توہین سمجھی جاتی ہے پس جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ محقق دوران کے نزدیک دونو واہ واہ کے مستحق ہیں۔

چوتھی خصوصیت۔ حکومت کا تصور۔ پانچویں خصوصیت قانون کی بالاتری پر انہوں نے تفصیلی تبصرہ کیا لیکن سر دست ہم اس سے پہلوتہی کرتے ہیں۔

البتہ چھٹی خصوصیت۔ عصبیتوں سے پاک حکومت۔ کے متعلق ہمارا جی چاہ رہا تھا کچھ کہہ دیں لیکن بھلا ہو محقق دوران کا کہ وہ حضرت عثمان کے متعلق اتنا تو جرأت سے کہہ گئے "مگر بدقسمتی سے خلیفۂ ثالث حضرت عثمان اس معاملے میں معیارِ مطلوب کو قائم نہ رکھ سکے ص ۹۹۔ ان کا یہ نظریہ بڑے رکھ رکھاؤ اور بچ بچاؤ کا غماز ہے کیوں کہ یہاں تین مرحلے ہیں (۱) انتخاب کے وقت کسی شخص میں معیار مطلوب کا لحاظ رکھنا (۲) جس میں ایک معیار مطلوب کا لحاظ رکھا گیا۔ انتخاب کے بعد اس کا اس معیار پر پورا اترنا (۳) معیار پر پورا اترنے والے انسان کا معیار مطلوب کو قائم رکھنا۔ اس مقام

پر بنیاد کی خشتِ اول ہی غائب ہے حضرت عثمان کا معیار پر پورا اترنا یا معیار کو قائم رکھنا تو درکنار انتخاب کے وقت روزِ اول سے اس معیارِ مطلوب کو سرے سے نظر انداز کیا گیا تھا۔ چنانچہ مودودی صاحب اس سے پہلے حضرت عبداللہ بن عباس سے تبادلہ خیالات کرتے ہوئے حضرت عثمان کے بارے میں حضرت عمر کے الفاظ نقل کر چکے ہیں

"اگر میں ان کو اپنا جانشین تجویز کروں تو وہ بنی معیط (بنی امیہ) کو لوگوں کی گردنوں پر مسلط کر دیں گے اور وہ لوگوں میں اللہ کی نافرمانیاں کریں گے۔ خدا کی قسم اگر میں نے ایسا کیا تو عثمان یہی کریں گے اور اگر عثمان نے یہ کیا تو لوگ ضرور معصیتوں کا ارتکاب کریں گے اور عوام شورش برپا کر کے عثمان کو قتل کر دیں گے اسی چیز کا خیال ان کو اپنی وفات کے وقت بھی تھا صد ۹۸ - صد ۹۹

حاشیہ پر رقمطراز ہیں۔

بعض لوگ اس جگہ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا حضرت عمر کو الہام ہوا تھا جس کی بنا پر انہوں نے قسم کھا کر وہ بات کہی جو بعد میں جوں کی توں پیش آگئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک صاحب بصیرت آدمی بسا اوقات حالات کو دیکھ کر جب انہیں منطقی طریقہ سے ترتیب دیتا ہے تو اسے آئندہ رونما ہونے والے نتائج دو اور دو چار کی طرح نظر آنے لگتے ہیں اور وہ الہام کے بغیر اپنی بصیرت ہی کی بنا پر ایک صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عثمان کو شوروی کمیٹی میں نامزد کرتے ہوئے ان کے اندر معیارِ مطلوب کو نظر انداز کر دیا گیا تھا اور بعض خاص جذبات ہی اس کے محرک تھے ورنہ اگر اُمت کی بہتری اور اسلامی بہبودی کا جذبہ اور خلوص دل میں ہوتا تو پوری اُمت کو آنے والے خطرات کے منہ میں نہ دھکیل دیا گیا ہوتا اور ایسے خطرناک شخص کے لئے اقتدار کا رستہ ہموار نہ کیا جاتا۔ پس حضرت عثمان کے لئے نہ معیار کا لحاظ رکھا گیا اور نہ وہ معیارِ مطلوب پر پورے اترے اس کا قائم رکھنا تو درکنار اور ذرا اسلام کے اصولِ حکمرانی کو خلفاء کے کردار سے تطبیق دیجئے اور مودودی صاحب کو تحقیق و انصاف کی داد دیجئے۔ چوتھے قاعدے کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ حکومت اور اس کے اختیارات و اموال۔ اللہ کی اور مسلمانوں کی امانت ہیں لیکن حضرت عمر اللہ کی اور مسلمانوں کی امانت کو ایسے شخص کے حوالے کر رہے ہیں جن کے متعلق بطور پیشین گوئی کے کہہ رہے ہیں کہ اس کا مآل خدا کی نافرمانی ہوگا اور ان کو پورا خطرہ تھا کہ کنبہ پروری کرتے ہوئے عدل و انصاف کے تقاضوں کو نظر انداز کریں گے۔ لیکن ساتویں خصوصیت روحِ جمہوریت کو بیان کر کے آخر میں ببانگِ دہل یہ بھی کہہ گذرے کہ خلافت راشدہ کا یہ دور ایک

روشنی کا مینار تھا، ص۲۰۱ یہ ہے آبائی کورانہ تقلید کا روح فرسا نتیجہ۔

انصاف کا تقاضا

واقعات وحقائق کا منصفانہ جائزہ لینے کے بعد یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے بعد فوراً ہی اقتدار کی طرف للچائی ہوئی نظریں اُٹھیں اور موقعہ غنیمت جان کر فرضی الیکشنی بورڈ تجویز کر کے خلافت سازی کے معاملہ میں عجلت کی گئی اور من مانی کاروائی کر گذرنے کے بعد اسے شرعی حیثیت دے دی گئی پس بیان کردہ آئین اسلامی کے ماتحت نہ پہلی خلافت منعقد ہوئی اور نہ اس کے انعقاد کے وقت کسی معیار کا لحاظ رکھا گیا چنانچہ بروایت ابن قتیبہ دینوری سرکاری وکیل حضرت عبیدہ بن جراح نے حضرت علیؑ کے اعتراض کی معقولیت کا اعتراف کرتے ہوئے یہ تسلیم کیا کہ واقعی معیار خلافت آپ (حضرت علیؑ) میں موجود ہے۔ لیکن آپ بزرگانِ قوم کے اقتدار کو اب چیلنج نہ کریں اگر وقت نے ساتھ دیا تو آپ کا بھی نمبر آجائے گا۔

جس طرح پہلی خلافت میں معیار کو ملحوظ نہ رکھا گیا تھا اسی طرح دوسری خلافت کے انعقاد کا مسئلہ ہے کہ خلیفہ اوّل نے بارِ احسان سے سبکدوش ہونے کے لئے حضرت عمر کو نامزد کر دیا اور اپنے اقتدار کے سایہ میں لوگوں سے ہاں کرالی جس طرح بعد میں معاویہ نے اسی سنت پر عمل کرتے ہوئے یزید کو مسلمانوں کی گردنوں پر سوار کر دیا لیکن معاویہ کے فعل کو ملوکیت سے تعبیر کیا گیا اور عمر کی خلافت کو راشدہ کا نام دے دیا گیا اگرچہ طریق کار میں ذرا بھر فرق نہیں ہے۔

بھلا ہو مودودی صاحب کا تیسری خلافت کے بارے میں اُن کا اس قدر تسلیم کر لینا کہ وہ معیارِ مطلوب کو قائم نہ رکھ سکے بھی غنیمت ہے کاش! ان کی تحقیق پسندی، آبائی تقلید کا جُوا گردن سے اتار پھینکنے کی جرأت کر سکتی تو اُنہیں کہنا پڑتا اور اپنی ہی تحقیق کی روشنی میں انہیں اعتراف کرنا پڑتا کہ ان میں سے کسی کے انتخاب کے وقت نہ کسی آئینِ اسلامی کا لحاظ رکھا گیا اور نہ معیارِ مطلوب کی پاس کی گئی تھی بلکہ اقتدار اُن کے ہاتھ میں آیا اور اقتدار پر وہ قابض ہو گئے۔ بعد والوں نے ان کے فعل کو آئینِ اسلامی کا نام دینا شروع کر دیا اور ان کے ہر عمل کو شرعی حیثیت دے دی گئی جس طرح ہر جیتنے والے کی ہر دھاندلی کو خوشامد پرست اور حکومت نواز جماعت جائز ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا کرتی ہے پس وہ مسلمانوں کے سیاسی قائد تھے اور یکے بعد دیگرے مسلمان حکمران تھے اس سے آگے بڑھنا انصاف کا خون کرنا ہے۔

حضرت علی علیہ السّلام ان کے اَدوارِ حکومت میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے رہے اور ان

کی صلاحیتوں کو چھپانے کی خاطر برسر اقتدار جماعت نے کبھی ان کو حکومتی کاموں میں دخل دینے کا موقعہ تک نہ دیا اور دَورِ رسالت میں ان کے سپاہیانہ خدمات اور فوجی تجربات عیاں راچہ بیان کے مصداق تھے لیکن تینوں حکومتوں میں دیدہ دانستہ ان کو نظرانداز کردیا گیا تاکہ ان کا استحقاقِ خلافت منظرِ عام پر نہ آسکے۔ اور تو اور، حضرت علی کی مسلّمہ قرآن دانی و قرآن فہمی کا علم رکھنے کے باوجود جب خلیفہ ثالث نے جمع قرآن کے لئے ایک کمیٹی کی تشکیل کی تو اس میں حضرت علی کو شامل کرنے کی جرأت نہ کی گئی اور جن لوگوں کو مامور کیا گیا وہ یقیناً بدرجہا حضرت علی سے کم پایہ رکھتے تھے۔ ان اور دیگر اس قسم کے روح فرسا واقعات و حقائق سے نتیجہ نہ اخذ کرنا اور آبائی کورانہ تقلید کے زیرسایہ تحقیق و انصاف کی گردن پر چھری پھیرتے ہوئے دعویٰ کرنا (خلافتِ راشدہ کا یہ دَور ایک روشنی کا مینار تھا) دیدہ دلیری کے سوا اور کچھ نہیں۔ حضرت عثمان کی بدعنوانیوں کی طویل فہرست گنوانے کے بعد اور خلافت کے معیار مطلوب کو قائم نہ رکھنے کا اعتراف کرنے کے باوجود بھی خلافت راشدہ کے دائرہ میں اسے جگہ دینا تحقیق کا فیصلہ نہیں بلکہ تقلید کا وبال ہے۔ جو حلق میں پھنسے ہوئے لقمے کی طرح نہ نگلا جاسکتا ہے اور نہ اُگلا جاسکتا ہے

اُصولِ حکمرانی میں نویں نمبر پر امر بالمعروف کے ذیل میں فرماتے ہیں۔ معاشرے کے ہر فرد کا فرض ہے کہ مملکت میں جہاں بھی غلط اور ناروا کام ہوتے نظر آئیں ان کو روکنے میں اپنی حد تک پوری کوشش کرے۔ اس کے پیشِ نظر حضرت عثمان کی اقربانوازی کے افسوسناک دَور میں مسلم معاشرے پر فرض عائد ہوتا تھا کہ حکومت کی غلط اور ناجائز پالیسی کو بدلنے میں حتی الامکان کوشش کریں چنانچہ جب حضرت عثمان کو سمجھانے اور معاملہ کو سلجھانے کی تمام تر کوششیں رائگاں اور بے اثر ثابت ہوئیں۔ اور بقولِ مودودی صاحب کے حضرت عائشہ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر بھی ان کی اصلاح سے مایوس ہو گیے صد۲۳۲ اور بقول ان کے پُورے مدینے کی آبادی میں سوائے چار آدمیوں کے ان کا ہمنوا کوئی نہ تھا صد۲۳۳۔ تو ایسے حالات میں مسلم معاشرہ پر فرض تھا کہ ایسی حکومت کا تختہ الٹ دیں چنانچہ بصریوں اور کوفیوں نے نہیں بلکہ اہلِ مدینہ نے اور شورشیوں نے نہیں بلکہ صحابہ اور صحابہ زادوں نے تنگ آکر خلیفہ کے قتل کا منصوبہ بنایا اور ان میں پیش پیش خلیفۂ اول حضرت ابوبکر کے صاحبزادے حضرت محمد بن ابی بکر مدینہ کے رہنے والے تھے اور ساتھ حضرت عمرو بن حمق خزاعی صحابیٔ رسول تھے جو مدینہ میں ہی سکونت پذیر تھے یہ کہنا کہ شورشیوں نے قتل کردیا واقعات و حقائق کا منہ چڑانا ہے باہر سے آنے والے تو اپنے اُوپر مسلّط ظالم اموی حکام کے استبدادی رویوں سے تنگ آکر دارالحکومت سے دادخواہی کے لئے حاضر ہوئے تھے جب اہل مدینہ کی پُوری کوششوں کے باوجود ناکامی ہوئی اور خلیفہ نے اپنے رویّہ کو بدلنے

سے انکار کر دیا تو مذکورہ بالا مدینہ کے مقتدر لوگوں نے خود ہی ان کو موت کے گھاٹ اتار کر مسلمانوں کی گردنوں سے اقرباء نواز حکومت کا جوا اُتار پھینکا۔

تمام اہل مدینہ کے نزدیک یہ قتل حق بجانب تھا سوائے ان لوگوں کے جو اقتدار کی ہوس میں حضرت علی سے انتقام کا دعویٰ لے کر اُٹھے۔ اور اہل بصرہ سے جا کر انتقام لے لیا۔ ان کا مقصد صرف مملکت میں انتشار پھیلا کر حضرت علی سے اقتدار چھیننا تھا ورنہ مارنے والے صحابی اور صحابی زادے مدینہ میں ہی تھے اگر ہمت تھی تو وہیں ان سے انتقام لیا جاتا یا حضرت علی سے ہی انتقام لینا تھا تو مدینہ میں ہی یہ آواز اٹھائی جاتی اس کا بصرہ سے دُور کا بھی تعلق نہ تھا۔ اِسی طرح جنگ جمل کے بعد جنگِ صفین اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ معاویہ نے جب دیکھا کہ طلحہ و زبیر حضرت علی سے اقتدار چھیننے میں ناکام رہے ہیں تو اس نے علم بغاوت کھڑا کر لیا اور خون عثمان کا انتقام بہانہ بنا لیا تاکہ اقتدار ہاتھ میں آ جائے۔ اور ہر طالب اقتدار ملک میں انتشار پھیلا کر ہی لوگوں کو اپنی طرف مائل کیا کرتا ہے۔

اہلِ مدینہ کے نزدیک قتل عثمان کوئی جُرم نہ تھا بلکہ مسلم معاشرہ کی فلاح کا راز اسی میں ہی مضمر تھا اِس لئے اہلِ مدینہ میں سے کسی نے بھی خلیفہ مقتول کا نہ سوگ منایا اور نہ ان کا جنازہ پڑھنے اُٹھانے اور دفن کرنے میں اُنہوں نے شرکت کی حتیٰ کہ حضرت علی علیہ السّلام نے اقتدار سنبھالنے کے بعد ہی نہ مقتول خلیفہ کے پس ماندگان کو پیغام تعزیت بھیجا اور نہ کبھی ان کے قاتلوں کے فعل کو ناجائز ٹھہرایا بنابریں حضرت علی کے نزدیک قاتلین عثمان جُرم کے مرتکب نہ تھے بلکہ انہوں نے ایک صحیح قدم اٹھایا تھا پس حضرت علی کا اُن سے بدلہ نہ لینا بلکہ ان کو عہدے و مناصب دے کر ان کی حوصلہ افزائی کرنا بالکل درست اور بجا اقدام تھا جناب مودُودی صاحب صرف آبائی تقلید کے پیش نظر ہی حضرت علیؑ کے اس اقدام کو غلطی سے تعبیر کرتے ہیں ورنہ اگر اس گرہ کو تحقیق و انصاف کے ناخنوں سے کھولتے تو اس الجھن میں نہ پڑتے اور نہ ان کو ظالم و مظلوم اور قاتل و مقتول دونو کو رضی اللہ عنہما کہنے کی ضرورت ہوتی بلکہ حق کو حق سمجھ کر اس کو سینے سے لگا لیتے اور غلط کو غلط جان کر اس سے الگ ہو جاتے

امامت اور فرقہ امامیہ (شیعانِ علیؑ)

اب تصویر کا دوسرا رُخ دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ جمہوریت کے مقابلہ میں (امامت) کا طرزِ عمل کیا ہے اور اس بارے میں فرقہ امامیہ (شیعان علی) کے عقائد کیا ہیں؟

(۱) امامت ایک دینی منصب ہے اور خدائی عہدہ ہے اور یہ الیکشن سے حاصل نہیں ہو سکتا

بے شک الیکشن جیت کر انسان بادشاہ و حکمران بن سکتا ہے لیکن امام نہیں بن سکتا جب تک کہ خدا کی جانب سے پیغمبر کی زبانی اس پر نص نہ ہو بنا بریں شیعان علی کا یہ عقیدہ ہے کہ رسالت مآب کے بعد امام منصوص حضرت علی علیہ السّلام ہیں جن کی نامزدگی کا اعلان جناب رسالت مآبؐ نے خمِ غدیر کے مقام پر ایک لاکھ سے زیادہ کے مجمع میں فرمایا تھا اور یہ حدیث بالتواتر تمام معتبر تفاسیر میں منقول ہے اور اس کے بعد ہر سابق امام بعد والے امام کو نامزد کرتا رہا۔

۲۔ امامت ایک معیاری عہدہ ہے جس طرح نبی کا بنانا انسانوں کا کام نہیں اسی طرح کسی نبی کے جانشین امام کی تعیین بھی اُمّت کے اختیار میں نہیں ہے اور اللہ ایسے افراد کو نامزد نہیں فرماتا جو معیار سے گرے ہُوئے ہوں اور شیعانِ علی کا یہی عقیدہ ہے۔

۳۔ امامت کے لئے ضروری نہیں کہ الیکشن میں اس کی جیت بھی ہو۔ دیکھئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خدا نے فرمایا اِنِّی جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (میں تجھے لوگوں کا امام بناتا ہوں) اگر عوامی سطح پر اس زمانہ میں الیکشن ہوتا تو یقیناً آبائی تقلید میں غیر اللہ کے پجاری حضرت ابراہیم کے بجائے نمرود ہی کو ووٹ دیتے اور وہی کامیاب ہوتا بلکہ عملی طور پر وہی کامیاب ہوگیا تاہم خدائی جانب سے حضرت ابراہیم کی امامت پر کوئی بُرا اثر نہ پڑا وہ ویسے کے ویسے امام ہی رہے اسی بنا پر شیعوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت علی خدا کی جانب سے باعلانِ پیغمبرؐ امام خلق تھے اگرچہ ظاہری اقتدار دوسروں کے ہاتھوں میں تھا اور اس سے حضرت علی کی امامت میں کوئی کمی نہیں آئی۔

۴۔ امامت کا عہدہ خدا اُسی کو دیتا ہے جس سے غلطی نہ ہو لہٰذا شیعوں کو لیپ پوت کر کے دامنِ امام کو محفوظ کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔

۵۔ خدا اس کو امامت کا عہدہ دیتا ہے جو باقی لوگوں سے صفات و کمالات میں افضل و اکمل ہو ورنہ ترجیح مرجوح لازم آئے گی۔ اور عقلاً محال ہے کہ اللہ افضل کو مفضول کی اطاعت پر مامور کرے کیونکہ یقیناً یہ فعل قبیح ہے اور اللہ فعل قبیح سے بالاتر ہے اور شیعانِ علی کا یہی عقیدہ ہے کہ جناب رسالتمآبؐ کے بعد حضرت علی تمام اُمت سے افضل ہیں اور آیتِ مباہلہ میں علی کو نفس رسول کہنا علی کی افضلیت پر دلیل قاطع ہے۔

۶۔ چونکہ رسُول اللہ کے بعد عہدۂ امامت نیابت رسول کا عہدہ ہے جس کی نامزدگی اللہ کے سپرد ہے تو جس طرح نبی غیر معصوم نہیں ہو سکتا اسی طرح امام بھی غیر معصوم نہیں ہو سکتا اور اہل سنّت کے امام فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ خدا کی طرف سے جس شخص کی اطاعت مطلقہ

کا حکم ہو اُسے معصوم ہونا چاہیے پس یا تو خلیفہ کی اطاعت کو شرعی حیثیت نہ دی جائے بلکہ دنیاوی حکمرانوں کی طرح اس کی اطاعت بھی تمدن انسانی اور ڈسپلن کو برقرار رکھنے کے لئے فرض سمجھی جائے تو ایسی صورت میں اس کی عصمت کا عقیدہ بھی غیر لازم ہے لیکن اگر خلیفہ کی اطاعت کو خدا اور رسول کی اطاعت کی طرح شرعی حیثیت دی جائے یعنی اس کی اطاعت واجب اور اس کی نافرمانی حرام ہو تو ضروری ہے کہ وہ معصوم ہو اور اس سے غلطی کے صدور کا امکان نہ ہو ورنہ اس کے غلط کار ہونے کی صورت میں اس کے غلط احکام میں بھی اس کی اطاعت واجب ہوگی اور خدا غلط و ناجائز احکام میں کسی کی اطاعت کا حکم نہیں دیتا۔ آیت مجیدہ یَا اَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (سورہ نساء آیت ۵۹) کی تفسیر میں امام فخر الدین رازی نے کہا ہے چونکہ آیت میں اولوالامر کی اطاعت کا حکم مطلق ہے لہٰذا اولوالامر کا آیت کی رُو سے معصوم ہونا ضروری ہے اور خداوند کریم نے جہاں کہیں غیر معصوم کی اطاعت کا حکم دیا ہے وہاں ناجائز اُمور میں ان کی اطاعت کو مستثنیٰ قرار دیا ہے چنانچہ اس نے والدین کی اطاعت کا حکم دیا لیکن یہ استثناء بھی ساتھ ذکر کیا کہ اگر وہ شرک کا حکم دیں تو ان کی اس بارے میں اطاعت نہ کرو۔ آیت مجیدہ میں رسول اللہ کی اطاعت کی طرح اولوالامر کی اطاعت کا حکم مطلق ہے اور اس میں استثناء کوئی نہیں تو صاف ظاہر ہے کہ رسول اللہ کی طرح اولوالامر کو بھی معصوم ہونا چاہیے جس شخص کی اطاعت اللہ کی طرف سے واجب ہو اگر وہ معصوم نہ ہو تو مندرجہ ذیل خرابیاں لازم آئیں گی۔

۱۔ جب وہ خود خطار کار ہوگا تو دوسرے خطار انسانوں کے لئے اس کی اطاعت کا حکم خلافِ مصلحت ہونے کے علاوہ ترجیح بلا مرجح ہوگی اور خدا اس قبیح سے مبرا ہے۔

۲۔ غیر معصوم ہونے کی صورت میں نہ اس کی سیرت اسوہ حسنہ ہوگی اور نہ اس کا امر واجب الاتباع ہوگا۔

۳۔ اس کی ہر بات میں جھوٹ یا غلطی کا امکان رہے گا لہٰذا دلوں پر اس کا قول اثر انداز نہ ہوگا۔

۴۔ خطاکار ہونے کی صورت میں دلوں سے اس کا وقار اُٹھ جائے گا پس اس کا اللہ کی جانب سے حاکم ہونا مضحکہ خیز ہوگا۔

۵۔ اگر گنہگار ہوگا تو رعایا کے باہمی مقدموں میں فیصلہ کے لئے اس سے عدل و انصاف کی اُمید نہ رہے گی پس ایسے شخص کو لوگوں پر مسلط کرنا عدلِ پروردگار کے منافی ہوگا۔

۶۔ خدا کی جانب سے مقرر کردہ ہادی نے جن چیزوں سے لوگوں کو منع کرنا ہے یا جن اُمور کا حکم دینا

ہے۔ اس پر واجب ہے کہ پہلے خود انہی اُمور کا پابند ہو اور اس کا کردار مثالی ہو ورنہ اس کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

بہر حال نبی کے جانشین میں عصمت کا ہونا ضروری ہے ورنہ اس کا قول و فعل اُمت کے لئے شرعی حیثیت سے حجت نہ ہو سکے گا مثال کے طور پر اگر حضرت عمر معصوم ہوتے تو حضرت عثمان پر ان کی نصیحت و وصیت پر عمل کرنا شرعی اعتبار سے واجب ہوتا اور اس پر عمل نہ کرنے کی صورت میں وہ خود استحقاق خلافت سے گر جاتے اور اقتدار سے الگ ہو جاتے پس اس خون خرابے کی نوبت نہ آتی اور نہ مودودی صاحب کو یہ کہنے کی ضرورت پڑتی کہ حضرت عثمان کے لئے حضرت عمر کی وصیت پر عمل کرنا شرعی حیثیت سے واجب نہ تھا۔ ص ۳۲۲

۷۔ امام میں چونکہ معصوم ہونا ضروری ہے لہٰذا وہ خدائی احکام کے تابع ہوگا۔ اور شیعان علی کا یہ عقیدہ ہے امام نہ فاسق و ظالم بن سکتا ہے نہ رہ سکتا ہے اور نماز میں صرف اس شخص کے پیچھے اقتداء جائز ہے جو ظاہری لحاظ سے نیک ہو۔ بدکردار ظالم و فاسق کے پیچھے نماز پڑھنا ناجائز ہے سوائے تقیہ کی صورت کے (جہاں جان مال و عزت کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو وہاں بنیت فرادیٰ فاسق پیشنماز کے پیچھے نماز ادا کی جا سکتی ہے) چنانچہ شیعانِ علی سلاطین زمانہ کے مقرر کردہ حکام کے ساتھ اس طرح ہی گذارا کرتے رہے ہیں بلکہ ائمہ طاہرین علیہم السّلام بھی اسی قسم کی زندگی میں بے بس رہے ہیں۔

قیادت

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی موجودگی میں مسلمانوں کی ہر حیثیت سے قیادت کا مرکز حضورؐ کی ہی ذات تھی جہاں آپ اللہ کے دین کے بانی مبلغ و محافظ تھے وہاں مملکت اسلامیہ کے اندرونی نظم و نسق اور بیرونی توسیع و تحفظ کے ذمّہ دار بھی خود تھے آپ تعلیم قرآن و تزکیۂ نفوس کے لحاظ سے جہاں مسلمانوں کے سروں پر ابرِ رحمت بن کے چھائے ہوئے تھے وہاں فوجی نظم و ضبط اور جنگی محاذوں میں سربراہی کے فرائض انجام دیتے ہوئے دشمنانِ اسلام کے سروں پر برق قہر و غضب گرانے میں خود بنفسِ نفیس سالارئ لشکر کے فرائض بھی سنبھالتے تھے گویا داخلی و خارجی اُمورِ مملکت کی انچارج آپ ہی کی ذات تھی۔ اور جس طرح اسلامی ضابطۂ حیات سیاسی و دینی ہر دو پہلوؤں پر حاوی ہے اسی طرح آپ کی قیادت بھی ہر پہلو کے لحاظ سے جامع تھی۔

جب آپ کی رحلت ہوئی تو ابھی آپ کا جنازہ گھر ہی میں تھا کہ سیاسی قیادت کے شعبہ میں سربراہی حاصل کرنے کے لئے سقیفہ بنی ساعدہ میں اجتماع ہوا اور جنگِ اقتدار شروع ہو گئی۔ پس حضرت عمر نے حضرت ابو بکر کا اچانک نام پیش کر کے رائے عامہ کو ہموار کئے بغیر اس کی بیعت بھی کر لی پھر ان

کی مخصوص جماعت نے فوراً ان کی اتباع کی اور عوام پر بعد میں یہ بیعت مسلط کر دی گئی۔ انصاری اُمیدوار سعد بن عبادہ کو بُری طرح نکال دیا گیا اور اس "اسلامی کاروائی" کا مسجد نبوی میں باقاعدہ اعلان کر دیا گیا حضرت علی نے اتمام حجت کے طور پر احتجاج کیا لیکن اس کو ٹھکرا دیا گیا اور اس رُوح فرسا داستان کو ابن قتیبہ دینوری نے اپنی کتاب الامامۃ والسیاسۃ میں درج کیا ہے جو منصف مزاج انسان کے لئے حقیقت کی نشان دہی کے لئے کافی ہے۔ حضرت علی اور ان کی عقیدت مند جماعت "جو بقول مودودی صاحب ابتداءً شیعانِ علی کہلاتے تھے"، نے ایک دن کے لئے بھی ان کی اس قیادت کو دینی قیادت کا نام نہ دیا اور نہ اس حکومت کو اسلامی حکومت اُنہوں نے تسلیم کیا بلکہ حضرت علی علیہ السّلام نے قنفذ غلام کو جو سرکاری نمایندہ کی حیثیت سے بلانے آیا تھا حضرت ابو بکر کے لئے خلیفہ رسول اور امیر المومنین کے القاب استعمال کرنے سے بھی روک دیا تھا لیکن بدلے ہُوئے حالات نے حضرت علی کو خاموش زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا اور آپ کے شیعان بھی آپ کی تاسی میں چپ ہو کر بیٹھ گئے بہرحال ہونے والے خلفاء نے سیاسی میدان جیت لیا اور اقتدار پر قابض ہو گئے لیکن وہ ان لوگوں کے دلوں کو نہ جیت سکے تاکہ یہ لوگ ان کو اپنے دین کا امام بھی مان لیتے۔ سیاسی قیادت کے بارے میں مودودی صاحب رقمطراز ہیں۔

سیاسی قیادت

ایک حصہ سیاسی قیادت کا تھا جسے طاقت سے بادشاہوں نے حاصل کر لیا تھا اور چونکہ اسے نہ طاقت کے بغیر ہٹایا جا سکتا تھا اور نہ سیاسی قیادت بغیر طاقت کے ممکن ہی تھی۔ اس لئے اُمت نے بادل ناخواستہ اُسے قبول کر لیا۔ یہ قیادت کافر نہ تھی کہ اسے رد کر دینے کے سوا چارہ نہ ہوتا اس کے چلانے والے مسلمان تھے جو اسلام اور اس کے قانون کو مانتے تھے کتاب اللہ اور سُنّتِ رسول اللہ کے ...حجت ہونے کا انہوں نے کبھی انکار نہ کیا تھا۔ عام معاملات ان کی حکومت میں شریعت ہی کے مطابق انجام پاتے تھے۔ صرف ان کی سیاست دین کے تابع نہ تھی اور اس کی خاطر وہ اسلام کے اُصولِ حکمرانی سے ہٹ گئے تھے اس لئے اُمت نے ان کی سیاسی قیادت اس حد تک قبول کر لی کہ ان کے تحت مملکت کا نظام چلتا رہے امن وامان قائم رہے، سرحدوں کی حفاظت ہوتی رہے۔ اعدائے دین سے جہاد ہوتا رہے۔ جمعہ جماعت و حج قائم ہوتا رہے اور عدالتوں کے ذریعے سے اسلامی قوانین کا اجرا برقرار ہے ان مقاصد کے لئے صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین نے اگر اس قیادت کی بیعت کی تو وہ اس معنی میں نہ تھی کہ وہ اس امر واقعی کو تسلیم کرتے تھے کہ اب امت کی سیاسی قیادت کے مالک یہی لوگ

ہیں ۔ حت ۲۰۲ ۔

ظاہری اقتدار کے زمانہ سے پہلے بعینہٖ اسی طرح حضرت علی اور آپ کے شیعہ اور ظاہری اقتدار سے دست بردار ہونے کے بعد امام حسن اور ان کے شیعہ اور شہادتِ عظمیٰ امام حسین علیہ السّلام کے بعد تمام آئمہ اور ان کے شیعہ کا سلاطین وقت کے تحت زندگی کا دستور یہی رہا۔

حضرت امام حسین کا بروقت اقدام

حضرت امام حسین علیہ السّلام کے زمانہ میں جب اقتدار کی باگ ڈور یزید بن معاویہ نے سنبھالی تو یہ شخص چونکہ اعلانیہ فاسق تھا اور سیاسی حکمرانوں میں یہ دستور پہلے سے چلا آرہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو خلیفہ و نائبِ رسُول بھی کہلواتے تھے اگرچہ حضرت علی اور اُن کے شیعوں نے ان کی دینی سربراہی کو کبھی قبول نہیں کیا لیکن عوام الناس کے لئے اقتدار اور دین دونو کو لازم و ملزوم ثابت کیا جا رہا تھا اور جمہور اہل اسلام نے تعلیماتِ اسلامیہ کو ایسا لچکدار بنا رکھا تھا کہ وہ ہر سلطانِ وقت کے احکام کو احکامِ خداوندی سمجھنے لگے تھے۔ اور ان کے خلاف آواز اٹھانا اُن کے نزدیک دین کے خلاف علم لغاوت بلند کرنے کے مترادف تھا پس امام حسین علیہ السّلام اس صُورتِ حال سے پُوری طرح واقف تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ ان حالات میں خاموشی رفتہ رفتہ دین اسلام کی ظاہری شکل کو بھی مسخ کر کے رہے گی اور باقی ماندہ صحابہ میں یہ جرأت ہی نہ تھی کہ وہ خلیفہ کہلانے والے کے کردار کے خلاف لب کشائی کر سکیں۔ پس امام حسینؑ نے دین اسلام کی آبرو کی حفاظت کی خاطر آوازِ حق بلند کی اور حقیقی اسلام کا جھنڈا بلند کر کے میدان میں نکل کھڑے ہُوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب معاویہ کے حکم سے ہر شہر و دیہات میں ہر تقریب کے موقعہ پر ہر جمعہ اور ہر عید کے خطبات میں بلکہ نجی مجالس و محافل میں بھی حضرت علی اور ان کے شیعوں پر سب و شتم کی بوچھاڑ ہوتی تھی اور لوگ خوشنودئی خدا سمجھ کر اور اُسے دین کا اہم کردار سمجھ کر ثواب کے لئے بجالاتے تھے۔ اور یقیناً اگر امام حسین علیہ السّلام خاموش رہتے تو اُمّتِ اسلامیہ خوابِ خرگوش سے بیدار نہ ہو سکتی۔ اور یہی طریقہ ہمیشہ کے لئے اسلام کا رکن بن جاتا۔

حضرت امام حسین علیہ السّلام کی پہلی ندائے حق پر اگرچہ بہت سوں نے ہاتھ بلند کئے اور کوفہ کی طرف سے ہزاروں کی تعداد میں لوگوں نے نصرت کا وعدہ کیا اور ہر ممکن قربانی کی پیش کش کی لیکن وقت جوں جوں قریب آتا گیا دست تعاون بڑھانے والوں میں غیر معمولی کمی واقع ہوتی گئی اسی دوران میں واقعات کی نزاکت کا جائزہ لے کر یزید نے عبید اللہ بن زیاد کو کوفے کی گورنری کا عہدہ دیا۔ اس نے دار الامارہ کوفہ پر قبضہ جما کر جامع مسجد کوفہ میں ایک تہدید آمیز خطبہ دیا تو جن لوگوں نے اس کے باپ

"ولد الحرام" کی گورنری کے دوران میں کوفہ کے شیعانِ علی پر ظلم کے پہاڑ ٹوٹتے دیکھے تھے وہ ان کا تصور کر کے لرزا اُٹھے پس امام حسین علیہ السلام کے ساتھ وفاداری کا عہد توڑ کر حکومتِ وقت کے ہمنوا ہو گئے اور مذہب اقتدار کو قبول کر کے ظلم واستبداد کی چکی میں پسنے سے بچاؤ کا سامان مہیا کر بیٹھے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے اقتدار پر قبضہ کرنے کے لئے اگر یہ اقدام کیا ہوتا تو یقیناً بدلے ہوئے حالات میں وہ بھی ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھ جاتے اور حکومتِ وقت کو اپنی وفاداری کی یقین دہانی کرا دیتے لیکن وہ چونکہ حق و باطل ۔ دین و سیاست بلکہ امامت اور جمہوری اقتدار کے درمیان امتیاز کا ایک مضبوط حصار تعمیر کرنا چاہتے تھے تاکہ خلافتِ نبویہ کے نام سے موسوم ہونے والی حکومتوں کے زیرِ سایہ روز افزوں بد سے بدتر ہونے والے حالات میں دینِ اسلام شاہانِ وقت کا کھلونا نہ بن جائے وہ چاہتے تھے کہ لوگوں کو ایک مرتبہ اس بات کی سمجھ آجائے کہ دین الگ چیز ہے اور اقتدار الگ چیز ہے نیز امامت اور چیز ہے اور ملوکیت اور چیز ہے۔

جنابِ رسالت مآبؐ کے بعد سے اب تک مسلمان اسلامی تعلیمات سے تدریجاً بیگانہ ہوتے ہوتے بہت دور نکل چکے تھے اور اقتدار کے سائے میں اپنی کھوئی ہوئی دولتِ اسلام اور اخلاق و کردار کی پاکیزگی کے فقدان کے احساس سے بھی وہ غافل ہو چکے تھے اب ان کو اس طویل غفلت سے متنبہ کرنے اور بے حسی کی گہری نیند سے جگانے کے لئے ایک بہت بڑے دھماکے کی ضرورت تھی پس امام حسین علیہ السلام کا بالکل قلیل جماعت کے ساتھ خراسان سے لے کر شمالی افریقہ تک اور عدن سے لے کر اُندلس تک کی لمبی چوڑی مملکت کے مطلق العنان حکمران کو للکارنا اور ان کے خلاف علم بلند کرنا ایک بہت بڑا کارنامہ تھا جس نے مسلمانوں کو بالعموم حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے کے لئے دعوتِ فکر دی اور واقعہ شہادت کے بعد خاندانِ رسالت کی دربدر تشہیر نے اس تحریک کو مزید کامیابی سے ہمکنار کر دیا اور ایک بار خواب رفتہ ملّت کو ان واقعات و حالات نے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگا دیا اور اُس وقت تک جن لوگوں نے امامت اور ملوکیت کے درمیان فرق معلوم کرنے کی کوشش نہ کی تھی یا نہ کر سکے تھے وہ اس واقعہ عظمیٰ کے بعد سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ حق پر کون ہے اور باطل پر کون اور امامت کیا چیز ہے اور جمہوریت کیا ہے؟ اور مودودی صاحب نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے جیسا کہ صہ۶۲ پر خلافت و ملوکیت کے صہ۲۱۱ کے حوالہ سے گذر چکا ہے۔

اور اس میں شک نہیں کہ واقعہ کربلا کے بعد آنے والی حکومتوں کے دلوں میں بھی یہ احساس شدت سے پیدا ہوتا رہا کہ شیعانِ علی کا مسلک جمہور اہل اسلام کے مسلک سے الگ ہے اور ان کے عقیدہ میں

امامت الگ چیز ہے اور جمہوریت سے قائم ہونے والی خلافت الگ چیز ہے اور انہیں یہ بات روز روشن کی طرح معلوم ہوگئی کہ ان کے نزدیک دینی قیادت کی علمبردار امامت ہے اور سیاسی قیادت کی علمبردار حکومتِ وقت ہے اور یہ کہ سیاسی قیادت اگر دینی قیادت کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرے تو وہ سر دھڑ کی بازی لگا کر اپنی دینی قیادت کی استقلالی حیثیت کو ختم ہرگز نہیں ہونے دیتے اور نہ وہ جمہور اہل اسلام میں جذب ہونا جانتے ہیں جن کا مذہب اقتدار کے تابع ہو بلکہ شیعان علی وہ ہیں جو اقتدار کو مذہب پر قربان کرنا جانتے ہیں لیکن کسی قیمت پر مذہب کو اقتدار کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتے ۔

اور یہ امر حقیقت ہے کہ واقعہ کربلا تاریخ اسلام میں ایسا زبردست المیہ تھا جس پر بعد میں پردہ ڈالنا کسی حکومت کے بس میں نہ رہا۔ جہاں سرکاری حکم کے ساتھ ہر مجلس و وعظ میں حضرت علی، ان کی اولاد اور ان کے شیعوں پر سب وشتم ایک سنت بن چکا تھا وہاں اس واقعہ کے بعد لوگ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ حق پر کون تھا اور باطل پر کون؟ اور یہ کہ اسلام صرف برسر اقتدار پارٹی کی ہاں میں ہاں ملانے کا نام ہے۔ یا اس کی استقلالی حیثیت کچھ اور بھی ہے؟ اور سچ ہے کہ جمہور اہل اسلام کے دانشور طبقہ کی بھی اس واقعہ کے بعد آنکھ کھلی کہ خلافت کچھ اور ہے اور اقتدار کچھ اور ہے چنانچہ انہوں نے یہاں پہنچ کر قیادت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا کہ دینی قیادت الگ ہے اور سیاسی قیادت الگ ہے جیسا کہ مودودی صاحب نے ظاہر کیا ہے۔

> سلاطین سے بے نیازی اور ان کے قہر وغضب کے مقابلہ میں ثابت قدمی مسلمانوں کے اندر دینی قیادت کی اہلیت کا معیار بن گئی تھی۔ اس معیار سے ہٹ کر اگر کوئی اللہ کا بندہ چلا تو قوم بڑی کڑی نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتی رہی اور اس کی بزرگی کو اس نے صرف اس وقت تسلیم کیا جب سلطان کے قریب جا کر بھی اس نے دین کے معاملہ میں کوئی مصالحت نہ کی۔ صـ ۲۰۳

اور آگے چل کر لکھتے ہیں "اسی طرح پہلی صدی کے وسط ہی سے دینی قیادت کا راستہ سیاسی قیادت کے راستے سے الگ ہو چکا تھا"

بہر حال شیعانِ علی تو پہلے دن سے ہی دینی قیادت اور سیاسی قیادت کے دو راستوں میں فرق معلوم کر چکے تھے لیکن اکثریت اقتدار کی رو میں بہ نکلی اور امام حسین علیہ السلام کی شہادتِ عظمیٰ نے جہاں شیعانِ علی کے ایمان میں جلا نے کو بخشی اور انہیں باطل کے سامنے دبنے کے بجائے ابھرنا سکھایا اور حق پر جم کر ثابت قدمی اور موت کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر خود اعتمادی کا جذبہ تعلیم کیا وہاں جمہور اہل اسلام کو بھی

دعوتِ فکر دی کہ دینی قیادت اور سیاسی قیادت دو رستے ہیں بلکہ پورے ادیانِ عالم کے سربراہوں کے لئے باطل سے ٹکر لینے کی راہیں ہموار کردیں یا یوں سمجھئے کہ پوری انسانیت کو انسان نما درندوں کی سخت گرفت سے بچنے کے لئے قربانیاں دے کر اور مظالم برداشت کر کے راہِ نجات کی نشان دہی کی جو رہتی دنیا تک انسانیت سے خراجِ تحسین لیتی رہے گی۔

دینی قیادت

ابتدائی دَور میں دینی قیادت اور سیاسی قیادت میں فرق کرنا اس لئے بھی مشکل تھا کہ اہلِ اسلام کی اکثریت جناب رسالت مآبؐ کی تربیت یافتہ ہونے کی حیثیت سے کم وبیش مسائلِ ضروریہ سے آگاہ تھی اور پیش آمدہ مسائل میں وہ ایک ہی جماعت کے متعلمین کی طرح بعض اوقات ایک دوسرے سے مدد لے کر کام چلا لیتے تھے اور حکومتِ وقت بھی نبوی تعلیم اور اسلامی اخلاق وکردار سے کسی حد تک متاثر تھی اس لئے انہوں نے اپنے دَورِ اقتدار میں اسلامی آئین کو ہی سرکاری قانون کی حیثیت دی وہ صوم وصلوٰۃ کے خود بھی پابند تھے اور رعایا پر بھی صوم وصلوٰۃ کی پابندی کو ضروری قرار دیتے تھے اور اس سلسلہ میں وہ بازپرس بھی کرتے تھے مقدمات کا فیصلہ بھی ان کے دور میں اسلامی قوانین کی رو سے ہوتا تھا اور سزائیں بھی تعزیرات اسلامیہ کے تحت میں دی جاتی تھیں اور جہاں حکومتِ وقت کسی مقدمہ کے فیصلہ میں اسلامی نقطۂ نظر کو نہ جان سکتی تھی اور باہمی مشورہ سے بھی اس کے حل کرنے میں کامیاب نہ ہوتی تھی وہاں حضرت علی علیہ السلام سے مشکل کشائی کی درخواست کی جاتی پس آپ حقیقی دینی قائد ہونے کی حیثیت سے اُس کو حل فرما دیتے۔ اور اس قسم کے فیصلوں سے ہی حقیقت بین نگاہیں تاڑ لیتی تھیں کہ دینی قائد کون ہے اور سیاسی قائد کون ہے؟

حکومتِ وقت نے چونکہ زمانہ پیغمبرؐ کے قرب کی وجہ سے اسلامی آئین کو ہی سرکاری قانون قرار دے دیا تھا لہذا عامۃ الناس کو یہ تاثر دلایا گیا تھا کہ یہی قیادت صرف سیاسی ہی نہیں بلکہ دینی قیادت بھی ہے اور جناب رسالت مآبؐ کے ہر حیثیت سے نائب ہونے کا حق بھی انہی کو حاصل ہے پس وہ خلیفۂ رسولؐ اور امیر المومنین کے القاب سے بھی خطاب کئے جاتے تھے لیکن حضرت علی علیہ السلام نے ان کی سیاسی قیادت کو تسلیم کرنے کے باوجود کبھی ان کی دینی قیادت کو تسلیم نہ کیا اور نہ آپ ان کو اس منصب کے اہل سمجھتے تھے اور روبرو کی باتوں میں جب حضرت علی علیہ السلام نے دینی وسیاسی ہر دو قیادتوں کا اہل اپنے آپ کو ثابت کیا تو انہوں نے اپنے لئے نہ ہر قیادت کی اہلیت کا خود دعویٰ کیا اور نہ سرکاری وکیل حضرت ابو عبیدہ جراح نے ان کی اہلیت کا اعلان کیا بلکہ آپ کے دعویٰ کی تصدیق وتائید میں اس نے چند الفاظ کہے اور حضرت ابوبکر کی سن رسیدگی اور تجربہ کاری کی بدولت ان کے حق میں اقتدار کی بحالی کی

سفارش کی جیسا کہ الامامۃ والسیاسۃ سے ہم نقل کر چکے ہیں۔

چونکہ حضرت علی نے حکمران طبقہ کی دینی قیادت کو تا آخر تسلیم نہ کیا تھا اسی لئے حکومت کی جانب سے ان کو سزا یہ دی گئی کہ ایک طرف ان کے املاک کو سرکاری طور پر ضبط کر لیا گیا جس کو فدک کہتے ہیں اس بہانہ سے کہ رسول اللہ کا مال مالِ سرکار ہے اور وہ اسلامی بیت المال کا حصہ ہے کیونکہ نبیوں اور رسولوں کا کوئی وارث نہیں ہوا کرتا۔ اور دوسری طرف ان کو حکومتی کاروبار میں شریک نہ کیا گیا نہ داخلی اُمور میں اور نہ خارجی معاملات میں

آپ کی جنگی صلاحیتیں کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھیں تاہم ان سے حکومتِ وقت نے کسی معاملہ میں سرکاری طور پر کام لینا مناسب نہ سمجھا اور انہیں پچیس سالہ دورِ حکومت میں گھر کی چار دیواری میں خاموشی کی زندگی گذارنے پر مجبور کر دیا گیا اور اس کا پس منظر اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ اگر حضرت علی کی علمی و عملی دینی و سیاسی۔ نظامی و معاشی اور فوجی و جنگی صلاحیتوں اور سرگرمیوں کو بروئے کار لانے کا موقعہ دیا جاتا۔ تو پہلا مرحلہ اگرچہ تجہیز و تکفین پیغمبر میں مصروفیت کی وجہ سے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ لیکن دوسرے مرحلہ میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ حضرت علی کے علاوہ کوئی دوسرا آدمی برسرِ اقتدار ہو سکتا بلکہ آپ کی صلاحیت و استعداد کے پیش نظر (دینی قیادت تو پہلے سے ہی تھی) سیاسی قیادت خود بخود آپ کے قدموں میں جھک جاتی اور مسلمانوں کے لئے ان کی قیادت کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہوتا جس طرح عثمان کی وفات کے بعد سیاسی قیادت خود بخود علی کے قدموں میں جھکی اور مُسلمانوں کے لئے ان کی قیادت کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔

علامہ حلّی اعلی اللہ مقامہ نے "احقاق الحق" میں حضرت علی علیہ السّلام کی خلافت بلا فصل پر آیات و احادیث کی رُو سے بہت کچھ مواد پیش فرمایا ہے اور آپ نے مسند احمد بن حنبل سے حدیث وصیت بھی خلافت علی کے استدلال میں ذکر کی ہے۔ سلمان نے رسول اللہ سے دریافت کیا کہ حضور! آپ کا وصی کون ہو گا؟ تو آپ نے فرمایا اے سلمان! میرے بھائی موسیٰ کا وصی کون تھا؟ سلمان نے جواب دیا کہ یوشع بن نون۔ تو آپ نے فرمایا میرا وصی اور وارث جو میرے قرضے بھی ادا کرے گا اور میرے وعدوں کی بھی ایفاد کریگا وہ علی بن ابی طالب ہے۔

اس کے جواب میں فضل بن روزبہان متعصب مزاج سنّی العقیدہ اپنی کتاب "ابطال الباطل" میں لکھتا ہے۔ اَلْوَصِیُّ قَدْ یُقَالُ وَ یُرَادُ بِہٖ مَنْ اُوْصِیَ لَہٗ بِالْعِلْمِ وَالْھِدَایَۃِ وَحِفْظِ قَوَانِیْنِ الشَّرِیْعَۃِ وَتَبْلِیْغِ الْعِلْمِ وَالْمَعْرِفَۃِ فَاِنْ اُرِیْدَ ھٰذَا مِنَ الْوَصِیِّ نُسَلِّمُ اِنَّہٗ کَانَ وَصِیًّا لِرَسُوْلِ اللّٰہِ وَلَا خِلَافَ فِیْ ھٰذَا وَاِنْ اُرِیْدَ الْوَصِیَّۃُ بِالْخِلَافَۃِ فَقَدْ ذَکَرْنَا بِالدَّلَائِلِ الْعَقْلِیَّۃِ وَالنَّقْلِیَّۃِ عَدَمُ النَّصِّ فِیْ خِلَافَۃِ

عَلِیٍّ وَلَوْ کَانَ نَصًّا جَلِیًّا لَمْ یُخَالِفْہُ الصَّحَابَۃُ وَاِنْ خَالَفُوْا لَمْ یُطِعْھُمُ الْعَسَاکِرُ وَ عَامَّۃُ الْعَرَبِ سِیَمَا الْاَنْصَارُ - ترجمہ. بعض اوقات وصی بول کر اس سے مراد لیا جاتا ہے وہ جس کو علم، ہدایت، حفظ قوانین شریعت اور تبلیغ علم و معرفت کے لئے وصیت کی گئی ہو، پس اگر وصی سے یہ معنی مراد ہو تو مسلّم ہے کیونکہ آپ (اس معنی میں) رسول اللہؐ کے وصی تھے اور اس میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں لیکن اگر وصیت خلافت مُراد ہو تو ہم بیان کر چکے ہیں (دلائل عقلیہ و نقلیہ کی روشنی میں) کہ خلافتِ علی پر کوئی نص نہیں ہے ورنہ اگر نص جلی ہوتی تو صحابہ مخالفت نہ کرتے اور اگر صحابہ مخالفت کرتے بھی تو فوج اور عوام خصوصًا انصار قطعًا ان کا ساتھ نہ دیتے)۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ جمہور اہلِ اسلام کے نزدیک بھی حضرت علی کی قیادتِ علمیہ و دینیہ مسلّم تھی اور جو نصوص شیعہ کی طرف سے حضرت علی کی خلافتِ بلافصل پر پیش کی جاتی ہیں سنی علماء کے نزدیک اس سے مُراد قیادتِ دینیہ ہے اور اس کے سربراہ حضرت علی تھے اور خلافت بمعنی سیاسی قیادت کے سربراہ حضرت ابوبکر تھے اور شیعانِ علی اس کا انکار نہیں کرتے۔

عزاداری

دورِ اموی میں سرکاری آرڈی ننس کے ماتحت حضرت علی ان کی اولاد امجاد اور ان کے شیعوں پر گالی گلوچ اور سب و شتم کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا واقعہ ہائلہ کربلا میں شہادتِ عظمیٰ کے بعد شیعانِ علی میں سلسلۂ عزاداری اس کا ردِ عمل ہے۔ حکام جو حضرت علی اور شیعانِ علی کو گالیاں دیتے تھے اور جمہور اہلِ اسلام ان کے ہمنوا ہو کر حکومتِ وقت کے سامنے اپنی وفاداری و ایمانداری کا ثبوت پیش کرتے تھے۔ ائمہ طاہرین کے حکم سے شیعانِ علی نے سلسلۂ عزاداری کو جاری کر کے اور ہر سال واقعۂ کربلا کی یاد منا کر ایک طرف اموی مظالم کو اجاگر کیا ہے اور دوسری طرف اپنی مظلومیت کی داستان دہرا کر اپنی بے گناہی کو طشت از بام کر کے عوام الناس اور بالخصوص اہلِ اسلام کو دعوتِ فکر دی ہے کہ ہمیں بے گناہ گالیاں دی جاتی رہی ہیں اور ہمارے خلاف ہر قسم کی غلط سلط افواہیں دورِ اموی کی ظالمانہ و جابرانہ پالیسی کی ایجاد ہیں لہذا ہمارے متعلّق جو تنفر اموی دَورِ حکومت میں پھیلایا گیا تھا وہ بالکل بے بنیاد ہے اس کا اثر یہ ہوا کہ اموی دَور کے بعد عباسی دَور اگرچہ شیعانِ علی پر مظالم کے لحاظ سے کچھ کم نہ تھا حتیٰ کہ شیعوں کے ائمہ بھی ان کے جور و ستم کا نشانہ بنے رہے لیکن اس سلسلۂ عزاداری کی بدولت شیعانِ علی بجائے گھٹنے کے بڑھتے ہی رہے اور ان کی تعداد میں روز افزوں ترقی جاری رہی نہ وہ حکومتِ وقت کے مٹانے سے مِٹ سکے اور نہ ان کے دبانے سے دب سکے۔

حکومتوں نے دیکھ لیا کہ جمہور اہلِ اسلام کے مقابلہ میں ان کی تحریک ختم نہیں ہو سکتی حالانکہ کسی تحریک

کو مٹانے کے لئے تین حربے انتہائی کارگر ثابت ہوتے ہیں۔ ۱۔ حکومتِ وقت کی طرف سے جبر و تشدد ۲۔ عوامی پروپیگنڈا۔ ۳۔ تقسیم زر و دولت اور شیعانِ علی کو مٹانے کے لئے اموی دور سے یہ تینوں طریقے حدِ امکان تک استعمال کئے گئے۔ جبر و تشدد انتہا کو پہنچایا گیا ان کے نوجوانوں بوڑھوں بچوں حتیٰ کہ عورتوں تک کو بے دریغ تہ تیغ کرنے کی انسانیت سوز حرکت کی گئی۔ عوامی پروپیگنڈا کی تو حد ہو گئی کہ سرکاری حکم سے مساجد میں منبروں پر خطباتِ جمعہ و عیدین اور بالعموم ہر مجلس و وعظ و تقریر میں حضرت علی و اولادِ علی و شیعانِ علی کے خلاف زہر اگلنا سنتِ جاریہ بن گئی اور آج تک رسالوں میں اخباروں میں چھوٹے چھوٹے پمفلٹ و اشتہاروں میں اور چھوٹی سے چھوٹی کتاب سے لے کر مذہب کی بڑی بڑی کتابوں میں حتیٰ کہ کتبِ احادیث و تفاسیر میں بھی دل کھول کر شیعانِ علی کی مذمت قربِ خداوندی کا وسیلہ قرار دی گئی۔ اور تقسیم زر و دولت کی یہ حالت ہوئی کہ جہاں ایک طرف شیعانِ علی پر مقدمات چلا کر ان پر جرمانے و تاوان لگانے کے علاوہ ان کے گھر تک لوٹ لئے گئے اور ان کی املاک و جاگیریں ضبط کر لی گئیں حتیٰ کہ ان کی عورتوں تک کو لونڈیوں کی حیثیت سے اسیری میں لایا گیا جیسا کہ بسر بن ارطاۃ سالار لشکر معاویہ کے متعلق خود مودودی صاحب نے بھی اعتراف کیا ہے صفحہ ۱۶۱ وہاں دوسری طرف جاہ پرستوں اور خوشامدیوں پر انعامات و اکرامات کے لئے سرکاری خزانوں کے منہ بھی کھول دئے گئے اور سرکاری عہدہ جات اور مناصب پر بھی ایسے لوگوں کو مسلط کر دیا گیا۔

ان تمام حیلہ سازیوں کے باوجود بھی شیعانِ علی کے ہاتھوں میں حق کا پرچم لہراتا رہا نیز ان کا دائرۂ اثر روز افزوں وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا اور جمہور مسلمین کو یقین ہو گیا کہ حکومتی تشدد و عوامی پروپیگنڈا و تقسیم زر و دولت اور جوائز و مناصب کے ذرائع شیعانِ علی کی بڑھتی ہوئی تعداد میں اتنی کمی نہیں کرتے جتنی کہ ان کی عزاداری ان کے مذہب کی ہمہ گیر مقبولیت اور ان کے حلقہ اثر میں توسیع کی باعث بنتی ہے بنا بریں جمہور کے علماء و فقہا و مفتیانِ دین و مقررین و واعظین نے اپنا زورِ علم و بیان اس کے خلاف صرف کرنا شروع کر دیا کہ عزاداری کا برپا کرنا حرام ہے شہیدوں پر رونا حرام ہے ان پر ماتم کرنا گناہ ہے اور ایسی مجالس میں شریک ہونا بدعت ہے وغیرہ حالانکہ اموی دورِ حکومت میں کسی فقیہ و مفتی کو یہ جرأت نہیں ہوئی تھی کہ حضرت علی و شیعانِ علی پر علانیہ سب و شتم کے خلاف زبان کھولتا ویسے تو یہ حدیثِ پاک ہمیشہ پیش پیش رہتی ہے اَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ عَدْلٍ (اَوْ حَقٍّ) عِنْدَ سُلْطٰنٍ جَائِرٍ سب سے افضل جہاد ظالم حکمران کے سامنے انصاف کی (یا حق کی) بات کہنا ہے (خلافت و ملوکیت صفحہ ۶۹ بحوالہ ابوداؤد ترمذی، نسائی۔ ابن ماجہ) لیکن یوں لگتا ہے کہ اموی دورِ اقتدار میں خطباء و واعظین کے صحیفۂ خاطر سے

یہ حدیث بالکل محو ہو چکی تھی، یا حکومتی مناصب وجوائز کے لالچ کے سرپوشوں میں اسے بند کر دیا گیا تھا۔

عزاداری کا اہم ترین مطمح نظر صرف یہ ہے کہ حضرت علی اور اولادِ علی کے فضائل ومحامد کی نشر واشاعت کی جائے جو امویہ وسلاطین جور کے صبر آزما دور میں طاق نسیاں کی زینت کر دیئے گئے تھے اور پھر ان پر کئے جانے والے مظالم اور ڈھائے جانے والے مصائب کا برملا تذکرہ کیا جائے جو نشۂ اقتدار میں بدمست حکمران طبقہ کے آمرانہ ومتشددانہ طرزِ حکومت کے نتیجے میں ہوئے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کو ظالم سلاطین بنی اُمیہ سے نفرت ہوتی ہے اور آلِ محمدؐ سے عقیدتمندی میں اضافہ ہوتا ہے اور لوگ یہ سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ دینی قیادت اور سیاسی قیادت کی ابتدا کہاں سے ہوئی اور کتب تاریخ کی چھان بین بخوبی اس نتیجہ تک لے جاتی ہے کہ دورِ رسالت کے بعد سے ہی یہ دونو لائنیں نکلی تھیں حضرت علی دینی قیادت کے سربراہ تھے اور مقابل میں خلیفہ کہلانے والے صرف سیاسی قیادت اور ظاہری اقتدار کے ہی مالک تھے اس طرف ظاہری اقتدار کی مسند یزید تک پہنچی تو اس طرف دینی قیادت کی باگ ڈور حسین علیہ السّلام تک پہنچ گئی اور ظاہری اقتدار نے دینی اقدار کو اپنے قدموں میں روندنا چاہا تو حضرت حسین علیہ السّلام وقت کے تقاضوں کو بھانپ کر باطل کے طوفان کے سامنے کوہ گراں بن کر ڈٹ گئے اور آخر کار خود مر مٹ کر شہادت کا جامِ شیریں پی کر راہِ حق اور راہِ باطل میں جلی امتیاز پیدا کر گئے۔

اور یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ جہاں انسان کے دل میں ایک طرف مظلوم سے محبّت ہوتی ہے وہاں ظالم سے نفرت کا پیدا ہونا بھی ضروری امر ہے اسی طرح جب حق سے محبّت ہوتی ہے تو باطل سے بیزاری کرنا بھی فطری چیز ہے تو جہاں جنگ جمل وصفین کے معاملہ میں لیپ پوت کر کے معاویہ وطلحہ وزبیر وغیرہ کا احترام باقی رکھا گیا تھا امام حسین علیہ السّلام کی شہادت عظمیٰ نے اس لیپ پوت کا پردہ بھی چاک کر کے رکھ دیا کیونکہ جب لوگ عزاداری سے متاثر ہو کر یزید سے بیزار ہوئے تو یزید کے باپ معاویہ سے بیزاری لازمی تھی کیونکہ اُسی نے ہی اُس ناخلف بیٹے کے لئے اقتدار کی راہیں ہموار کی تھیں اور معاویہ کے اقتدار کی ذمہ داری اُوپر کو جاتی ہے اور تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں اسی خطرے کے پیش نظر جمہور اہل اسلام کے مفتیان نے عزاداری کی حُرمت کا فتویٰ دے دیا اور ابن حجر مکی نے صواعقِ محرقہ میں اپنے بعض اکابر اہل سنّت کا قول نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک امام حسین کی عزاداری اس لئے ناجائز ہے کہ اس سے اکابر صحابہ پر بدظنی پیدا ہونے کا خطرہ ہے اور مودودی صاحب نے بھی اہل سنت کے ایک گروہ کی طرف یہی بات منسوب کی ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ انہی احادیث کی بنیاد پر علما کے ایک گروہ نے یزید پر لعنت

کو جائز رکھا ہے اور ایک قول ان کی تائید میں امام احمد بن حنبل کا بھی ہے مگر ایک دوسرا گروہ صرف اس لئے اس سے منع کرتا ہے کہ کہیں اس طرح اس کے والد یا صحابہ میں سے کسی اور پر لعنت کرنے کا دروازہ نہ کھل جائے صد ۱۸۳۔

اور خود بھی اسی دوسرے گروہ کے حامی معلوم ہوتے ہیں چنانچہ نیچے حاشیہ پر لکھتے ہیں:۔
" ہمیں ایسے لوگوں کے غلط کاموں کو غلط کہنے پر اکتفا کرنا چاہیے اور لعنت سے پرہیزی کرنا اولیٰ ہے "

آئمہ اثنا عشر

حضور رسالت مآبؐ کے بعد دینی قیادت کی ذمہ داریاں اُن کے صحیح جانشینوں کے سپرد تھیں جو یکے بعد دیگرے اس منصب جلیل کے اہل تھے اور اُن کی تعیین کا فریضہ اُمت کے سپرد نہیں بلکہ خدا کے ذمہ ہے اور اس نے بزبان پیغمبر نامزد فرمایا ہے۔ اور احادیث میں جو بحدِ تواتر حضرت پیغمبر سے منقول ہیں آپ کے بعد آئمہ کی تعداد بارہ ہے جس کو تمام اہل اسلام نے تسلیم کیا ہے اور یہ کہ وہ سب قریش سے ہی ہوں گے۔ مودودی صاحب نے "خلافت و ملوکیت" میں اس حدیث کو تو کھلے دل سے قبول کیا ہے کہ آپ نے فرمایا "خلافت میرے بعد تیس سال تک ہوگی اور بعد میں ملک و ملوکیت ہو جائے گی اور شرح عقائد نسفیہ میں تفتازانی نے بھی اس کو تسلیمی حیثیت سے نقل کیا ہے لیکن اس حدیث کو نقل کرنے کی جسارت نہیں کی گئی جس میں خلفاء کا بارہ ہونا مذکور ہے بلکہ اس میں سے صرف ایک فقرہ لے لیا گیا ہے کہ خلفاء قریش سے ہوں گے (خلافت و ملوکیت صد ۲۵۵) اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ خلافت کی مدت تیس برس تک معین ہونے کی صورت میں تاویل کی گنجائش نکال لی گئی ہے کہ خلافت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک راشدہ اور دوسری غیر راشدہ یعنی ملوکیت اور حدیث شریف نے خلافت راشدہ (علی منہاج النبوۃ) کے متعلق ہی فرمایا تھا کہ یہ تیس برس تک ہوگی اور بعد میں بادشاہت و آمریت کا دَور دورہ ہوگا لیکن اثنا عشر (بارہ) خلفاء والی حدیث کی تصحیح کے لئے جمہور اہل سنت کے مسلک کی رُو سے کوئی تاویل نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ خلفائے بنی اُمیہ کو ساتھ ملایا جائے تو تعداد بارہ سے بڑھتی ہے بلکہ صرف بنو اُمیہ ہی بارہ سے زیادہ ہیں۔ اور بنو العباس کی تعداد تو ان سے بھی زیادہ ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں بارہ خلفاء والی حدیث پر کافی تبصرہ کیا ہے اور بالآخر اس کی رائے کا رجحان اس طرف ہے کہ ابو بکر سے لے کر عمر بن عبدالعزیز تک کے خلفاء مراد لئے جائیں لیکن اس خیال پر خود مطمئن نہیں کیونکہ بعض کا کردار اس قدر غلط اور افسوسناک بلکہ انسانیت سوز حد تک پہنچا ہوا ہے کہ جمہور اہل اسلام کے نزدیک بھی اس پر خلافت نبویہ کے مقدس

لیل کی تطبیق محل اشکال ہے اور دوسری طرف معرفت امامت والی حدیث جو تمام اہل اسلام میں مسلّم حیثیت رکھتی ہے۔جس کو علامہ تفتازانی نے شرح عقائد نسفیہ میں نصب امام کے وجوب کے استدلال میں پیش کیا ہے حضور نے فرمایا۔ مَنْ مَاتَ وَلَمْ یَعْرِفْ اِمَامَ زَمَانِهٖ مَاتَ مِیْتَةً جَاهِلِیَّةً۔ یعنی جو شخص امام زمانہ کی معرفت کے بغیر مرجائے تو اس کی موت کفر و جہالت کی موت ہے۔اس حدیث کی رُو سے بارہ خلفاء کی جو بھی تاویل کی جائے قابلِ قبول نہیں ہوسکتی کیونکہ بارہ خلیفے جہاں بھی ختم ہوں گے اس کے بعد والے لوگوں کے لئے جہالت کی موت لازمی طور پر ماننی پڑے گی۔

اس حدیث کی رُو سے صرف شیعانِ علی کا نظریہ ہی صحیح قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ شیعوں کے نزدیک حضورؐ کے بعد حضرت علی علیہ السّلام سے لے کر حضرت مہدی علیہ السّلام تک بارہ خلیفے بنتے ہیں اور سب کے سب قریش ہی سے ہیں۔گیارہ کا زمانہ ختم ہوچکا ہے لیکن بارہویں کا زمانہ تا قیامت ہے پس ہر زمانہ کا مسلمان امام وقت کی صحیح معرفت حاصل کرکے جہالت کی موت سے بچ سکتا ہے اور عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کیونکہ جناب رسالت مآبؐ کے بعد جب تا قیامِ قیامت نئے نبی نے آنا نہیں تو کم از کم حضورؐ کے بعد قیامت تک کی کثیر التعداد اُمتِ اسلامیہ کے لئے ہر زمانہ میں ایک ہادی و حجت خدا کا وجود تو ہو، جو اُمّت کے لئے سہارا بن سکے اور اس سوال کا حل سوائے شیعی عقیدہ کے اور کسی فرقہ کے پاس نہیں مل سکتا۔

علامہ حلی نے بارہ خلفاء والی حدیث صحیح بخاری صحیح مسلم اور ابوداؤد سے نقل کی ہے اور سچی بات ہے کہ جمہور اہل اسلام اس حدیث کو دیکھ کر کشش و پیچ میں پڑجاتے ہیں نہ آبائی عقیدے کا جوا ان کی گردن سے نکلتا ہے نہ اس کی صحت سے انکار ہوسکتا ہے اور نہ اس کی کہیں تطبیق ہوسکتی ہے۔

اس حدیث کو پڑھ کر فضل بن روزبہان نے یہ تو کہہ دیا کہ حدیث صحیح ہے اور کتب صحاح میں وارد ہے لیکن اس کے مصداق کی تلاش میں وہ بھی مارا مارا پھرتا رہا لیکن ناکامی و نامرادی نے ساتھ نہ چھوڑا۔ آخر کہنے لگا "اس سے مُراد یہ لی جاسکتی ہے کہ قریش سے ہونے والے صالح خلفاء کی تعداد بارہ ہوگی۔ان میں سے پانچ تو ہیں خلفائے راشدین (ابوبکر۔عمر۔عثمان۔علی وحسن چھٹا عبداللہ بن زبیر ساتواں عمر بن عبدالعزیز۔ اور پانچ خلفائے بنی عباس میں سے ہوں گے گویا حدیث میں قریش کے بارہ صالح خلیفوں کا ذکر ہے اس کے بعد کہتا ہے۔اس حدیث سے اگر بارہ امام مُراد لئے جائیں (جو شیعہ کہتے ہیں) تو اگر خلافت سے مُراد وراثتِ علم و معرفت، بیان حجت اور قیام منصب نبوت مُراد ہو تو اس کی صحت سے کوئی انکار نہیں اور یہ معنی درست ہے لیکن اگر خلافت سے مراد زعامت کبریٰ (اقتدارِ حکومت) ہو تو یہ درست نہیں کیونکہ اقتدار بارہ میں سے صرف دو کو (علی و حسن کو) حاصل ہوسکا ہے۔اور اس سے صاف معلوم ہے کہ دورِ رسالت

کے بعد دینی قیادت حضرت علی سے لے کر حضرت مہدی علیہم السلام کے پاس رہی اور اقتدارِ حکومت پہلے خلفائے ثلثہ کے پاس تھا پھر اموی حکمرانوں کے قبضہ میں رہا اس کے بعد سلاطین بنی عباس اس پر قابض ہوئے اور پھر جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ سیاسی قیادت اہلبیت و نا اہلبیت کے معیار سے نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے مخصوص اسباب و ذرائع ہوتے ہیں اور مختلف حیلے و بہانے ہوتے ہیں۔ کبھی ایک ذریعہ سے ایک شخص کامیاب ہوجاتا ہے لیکن وہی ذریعہ دوسرے کے لئے ناکامی کا باعث بن جاتا ہے۔ اسی طرح کبھی ایک حیلہ ایک کے لئے مفید ثابت ہوجاتا ہے لیکن دوسرے کے لئے وہ نقصان دہ بن جاتا ہے بہرحال اقتدار پر قبضہ مختلف ذرائع و اسباب کے ماتحت قوموں میں تقسیم ہوتا چلا آیا ہے اور یکے بعد دیگرے قومیں اور افراد ایک دوسرے کے وارث چلے آرہے ہیں اور اقتدار کبھی شخصی کبھی جمہوری کبھی آمریت اور کبھی ملوکیت کے مختلف رنگوں میں ڈھلتا ہوا چلا جارہا ہے اور ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت کے کلیے کے ماتحت نہ حکومت کو بقا ہے اور نہ قانون کو پائداری حاصل ہے۔ صرف اللہ کی حکومت باقی ہے اور اس کا قانون پائدار ہے۔ جب اللہ اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا تو قانونِ الٰہی کو برتری حاصل ہوگی اور زمین کی حکومت اللہ کے نیک بندوں کے ہاتھوں میں ہوگی اور حضرت مہدی علیہ السلام کی آمد اور ان کا دور تمام اہل اسلام کے لئے اُمیدوں کی آخری قرارگاہ ہے۔

پہلا امام برحق اور خلیفہ رسول بلافصل حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام

آپ عام الفیل کے تیس برس بعد کعبہ میں رجب المرجب کی تیرھویں تاریخ کو متولد ہوئے اور یہ جمعہ کا دن تھا۔ ابن صباغ مالکی کا بیان ہے کہ کعبہ میں تولد کا شرف صرف حضرت علی ہی کے حصہ میں ہے نہ اس سے پہلے کسی کو یہ شرف ملا اور نہ بعد میں ملنے کا امکان ہے) اور یہ پہلا ہاشمی ہے جس کے ماں باپ دونو ہاشمی تھے (فصول مہمہ) آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی حضرت ابوطالب بن عبد المطلب بن ہاشم اور والدۂ ماجدہ کا نام نامی جناب فاطمہ بنتِ اسد بن ہاشم تھا (المجالس المرضیہ)

تذکرۃ الخواص میں بھی ہے کہ جناب فاطمہ بنت اسد طوافِ کعبہ میں مشغول تھیں کہ آپ کو دردِ زہ پیدا ہوئی۔ پس دیوارِ کعبہ شق ہوئی اور اندر داخل ہوئیں اور جوفِ کعبہ میں علی کی ولادت ہوئی۔ مستدرک حاکم میں ہے کہ علی کی ولادت کعبہ میں تواتر کے ساتھ منقول ہے۔ ج ۳ ص ۴۸۳ دلائل الصدق۔

"تذکرۃ الخواص" میں سبط ابن الجوزی لکھتے ہیں کہ حضرت عبد المطلب نے وفات سے پہلے حضرت ابوطالب کو اپنا وصی مقرر فرمایا اور رسول اللہؐ کے معاملہ میں رعایت کی انہیں بہت تاکید کی

(آگے چل کر لکھتے ہیں) ابوطالب نے رسول اللہؐ کی مدد اور کفالت میں بہترین کردار ادا کیا ہمیشہ ان کے ساتھ رہتے اور تھوڑے وقت کے لئے بھی ان کو اپنے سے جدا نہ کرتے تھے اور آپ سے ان کو اس قدر والہانہ محبت تھی کہ اپنی اولاد سے بھی ان کو عزیز تر سمجھتے تھے اور اپنے پہلو ہی میں ان کو سلاتے تھے اور عرض کیا کرتے تھے کہ بیٹا تمہارا چہرہ مبارک ہے۔ حضرت عبدالمطلب کی وفات کے وقت آپ کی عمر آٹھ برس تھی اس وقت سے لے کر اعلانِ نبوت کے دس برس بعد تک آپ نے خدمت پیغمبرؐ کا فریضہ ادا کیا (۴۲ برس) ابن سعد نے واقدی سے نقل کیا ہے جب حضرت ابوطالب کی وفات کی اطلاع حضرت علی علیہ السّلام نے حضور کو دی تو آپ بہت روئے اور حضرت علی کو حکم دیا کہ تجہیز و تکفین و تدفین کا فریضہ ادا کرو۔ خدا ان پر اپنی مغفرت نازل فرمائے۔ عباس نے پوچھ لیا کہ ان کے لئے بھی مغفرت کی امید ہے۔؟ تو آپ نے فرمایا ہاں بے شک خدا کی قسم مجھے اس کی بخشش کی توقع ہے۔ اور رسول اللہ کئی روز تک حضرت ابوطالب کے لئے دعا و استغفار کرتے رہے۔ (تذکرۃ الخواص)

ایمان ابوطالب

جن لوگوں نے حضرت ابوطالب کے ایمان میں شک کیا ہے وہ صرف ان کی تنگ نظری کا ہی نتیجہ ہے اور تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ معاویہ حضرت علی کا سخت ترین بلکہ بدترین دشمن تھا اور حضرت علی نے بعض خطوط میں ان کو سخت و سست الفاظ بھی لکھے تاہم اس نے کبھی حضرت علی کو حضرت ابوطالب کے کفر کا طعنہ نہ دیا ورنہ وہ اہل شام میں بھی یہ فخر یہ نعرہ بلند کرتا کہ میں مسلمان باپ کا بیٹا ہوں اور علی، معاذاللہ کافر باپ کا بیٹا ہے اور کم از کم ساٹھ برس تک اموی سلاطین کی طرف سے حضرت علی پر سب و شتم ہوتا رہا لیکن کبھی کسی نے حضرت علی کے باپ کے کفر کا نام تک لینے کی جرأت نہ کی اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ دَورِ اول میں حضرت ابوطالب کا مومن ہونا اس قدر مسلم تھا کہ بدترین دشمن بھی اس کا انکار کرنیکی جرأت نہ کر سکتے تھے جب دَورِ بنی عباس میں جمہور اہل سنّت کے مذہب کی منظم طور پر تشکیل ہوئی تو خلفائے بنو عباس کے خوشامدیوں نے عباس کو ابوطالب سے افضل ثابت کرنے کے لئے حضرت ابوطالب کے ایمان پر لب کشائی کی اور اندھا دھند تقلید کرنے والوں نے سلاطین کی خوشامد میں آنکھیں بند کر کے اُسے قبول کر لیا۔ کیا انہیں معلوم نہیں تھا کہ دعوت عشیرہ سے لے کر بعثت کے دسویں برس تک جب تک حضرت ابوطالب زندہ رہے۔ انہی کی سرپرستی میں کھُلم کھلا حضور تبلیغ اسلام کے فرائض انجام دیتے رہے اور آپ ہی کی بدولت کسی سرپھرے مشرک کو جرأت نہ ہو سکی کہ آپ کی تبلیغ کی راہ میں حائل ہو سکے جب حضرت ابوطالب کا انتقال ہوا تو اس کے بعد مشرکین نڈر و بے باک ہو کر حضور کے درپے ایذا ہوئے اور حالات دن بدن بد سے بدتر ہوتے

چلے گئے یہاں تک کہ آپ مکہ کو خیرباد کہنے پر مجبور ہو گئے۔ بہرحال حضرت ابوطالب مومن اور کامل الایمان بزرگ تھے اور اسلام کی جو خدمات انہوں نے سرانجام دیں وہ انہی کا ہی حصہ تھیں اور بانیٔ اسلام کے نزدیک ان کی سعی مشکور تھی۔

آپ کی والدہ ماجدہ

حضرت علی کی والدہ ماجدہ جناب فاطمہ بنت اسد کے متعلق تذکرۃ الخواص میں ہے کہ وہ ہجرت کر کے مدینہ میں تشریف لائی تھیں اور مدینہ میں ۴ھ ہجری کو آپ کا انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئیں۔ حضورؐ نے بنفسِ نفیس ان کی نمازِ جنازہ پڑھی اور اپنی قمیص ان کے لئے بطور کفن کے عنایت فرمائی۔ زہری سے منقول ہے کہ حضورؐ فاطمہ کی زیارت کے لئے جایا کرتے تھے اور اُن کے گھر میں قیلولہ بھی فرماتے تھے وہ نیک و صالحہ خاتون تھیں۔ ابن عباس سے مروی ہے آیت یَآ اَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَكَ فاطمہ بنت اسد کے شان میں اُتری اور یہ پہلی خاتون ہے جو پاپیادہ ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ پہنچی۔ اور یہی پہلی عورت ہے جس نے حضرت خدیجہ ام المومنین کے بعد مکہ میں حضور کی بیعت کا شرف حاصل کیا۔

تربیت

حضرت علی علیہ السلام کو نسب کے لحاظ سے اپنے عظیم باپ اور بلند پایہ ماں کے سپوت ہونے پر بجا ناز تھا لیکن اس سے بڑھ کر تربیت کے لئے آپ کو ایسا بلند مقام ملا جس کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا اور وہ آغوشِ رسالت تھی اسی لئے مقامِ فخر میں بطور شکر پروردگار ارشاد فرمایا مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ میں نے آغوشِ رسالت میں جگہ پائی آپ نے مجھے اپنے سینے پہ لٹایا۔ اپنے پہلو میں سلایا۔ اپنے جسمِ اقدس کو میرے جسم سے مَس کیا اور میں نے انہی کی بُوئے نبوت کی مہک سے اپنے دماغ کی فرحت حاصل کی (نہج)، علامہ حلی نے بشائر المصطفےٰ سے نقل کیا ہے کہ حضورؐ بنفسِ نفیس بچپنے میں علی کا جھولا جھلاتے تھے اور جب جاگتے تو اس کو اٹھا کر گود میں بٹھاتے اور پیار کے لب و لہجہ سے باتیں کرتے اور پھر مکہ کی پہاڑیوں اور وادیوں میں سیر کرانے کے لئے علی کو اٹھا کرلے جاتے تھے۔

محامد و مناقب

علی علیہ السلام کی فضیلت کے متعلق حضرت ابن عباس سے مروی ہے اگر درخت قلمیں ہو جائیں دریا سیاہی بن جائیں اور جن و انس لکھنے اور حساب کرنے والے ہو جائیں تب بھی علی کے فضائل کا احاطہ نہیں ہو سکتا آپ سے مروی ہے کہ خدا نے قرآن میں کوئی آیت فضیلت نہیں نازل فرمائی، مگر یہ کہ علی اس کے راس و رئیس ہیں (تذکرۃ الخواص اور مسند احمد بن حنبل وغیرہ سے منقول ہے۔ قرآن مجید میں کہیں بھی یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا نازل نہیں ہوا مگر یہ کہ علی اس کے امیر و شریف ہیں اور قرآن مجید میں خدا نے کئی دفعہ صحابہ کو سرزنش کی ہے لیکن حضرتؑ علی کا ذکر مدح و ثنا اور خیر کے ساتھ ہی فرمایا

اس سے واضح ہے کہ جن آیات میں مومنوں کو خطاب کر کے خدا نے سرزنش کی ہے ان خطابات سے حضرت علی مستثنا ہیں حدیثِ مذکور کو ابو نعیم نے حلیہ میں اور ابن حجر مکی نے صواعقِ محرقہ میں بھی ابن عباس سے نقل کیا ہے۔ (دلائل الصدق)

جمہور مسلمین کا اتفاق ہے کہ حضرت علی پہلا وہ شخص ہے جس نے حضرت رسول اللہؐ کی تصدیق کی پس وہ اول مومن ہے۔ اور علیؑ وہ ہے جس کا دامن شرک کی نجاست سے کبھی ملوث نہیں ہوا پس ان کے اسلام لانے کا سوال ہی پیدا نیز حضرت علی علیہ السلام پہلا شخص ہے جس نے حضرت رسول اللہؐ کی اقتداء میں نماز پڑھی۔ [1] (تذکرۃ الخواص)

معاویہ نے ایک مرتبہ سعد بن ابی وقاص سے کہا تو ابو تراب (علی) کو سب کیوں نہیں کرتا؟ سعد نے جواب دیا حضرت علی کے بارے میں تین باتیں مجھے یاد ہیں جو رسول اللہؐ نے فرمائی تھیں اس لئے میں علی کو سب نہیں کر سکتا۔ معاویہ نے پوچھا وہ کونسی؟ تو سعد نے جواب دیا (۱) حدیث رایت (اس حدیث کو احمد بن حنبل نے مسند میں اور بخاری و مسلم نے صحیحین میں سہل بن سعد سے نقل کیا ہے کہ حضورؐ نے جنگِ خیبر کے موقع پر فرمایا "کل میں علَم اس شخص کے حوالہ کروں گا جو خدا اور رسول کو دوست رکھتا ہے اور خدا و رسول اس کو دوست رکھتے ہیں اور خدا اس کے ہاتھ پر فتح دے گا۔ لوگوں نے علم حاصل کرنے کی انتظار میں رات بستروں پر کروٹیں لے کر بسر کی اور صبح کو ہر شخص کے دل میں اس شرف کے حصول کا لالچ تھا۔ رسول اللہ نے پوچھا علی کہاں ہے؟ تو جواب ملا کہ وہ آشوبِ چشم کی تکلیف رکھتے ہیں آپ نے بلوایا اور چشمۂ وحی پروردگار سے دُھلا ہوا دہانِ رسالت کے مقدس و پاکیزہ ظرف سے نکلا ہوا سرمۂ لعابِ نبوت چشمِ ولایت میں ڈال کر لب ہائے مبارک کو حرکت دی اور علی کے حق میں دعا فرمائی پس علم جنگ عطا فرما کر روانہ جہاد کیا)۔ (۲) نصاریٰ نجران کے ساتھ مباہلہ کے موقع پر اَبنَاءَنَا کی جگہ حسن حسین نِسَاءَنَا کی جگہ فاطمہ زہرا اور اَنفُسَنَا کی جگہ پر حضرت علی کو ہمراہ لے گئے اور فرمایا خدایا یہ میرے اہل بیت ہیں۔ احقاق الحق میں علامہ حلی نے دعویٰ کیا ہے کہ آیت مجیدہ کی اس تفسیر پر تمام مفسرین کا اجماع ہے) (۳) رسول اللہؐ جب جنگ تبوک کی طرف جانے لگے تو علی کو اپنا خلیفہ بنا گئے۔ جب حضرت علی نے ساتھ جانے کی خواہش ظاہر کی تو آپ نے فرمایا کیا تو اس بات پر راضی نہیں کہ تیری مجھ سے وہ نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی۔ معاویہ نے یہ سُن کر کہا کہ پہلے کی بہ نسبت اب تو میرے نزدیک زیادہ قابلِ ملامت و نفرت ہے کیونکہ جب تو علی کے اس قدر فضائل جانتا ہے پھر تو نے اس کی اطاعت سے کنارہ کشی کیوں کی اور اس کی بیعت چھوڑ کر الگ کیوں ہو گیا؟ اگر تیرے بجائے میں نے حضور کی زبانی یہ باتیں سُنی ہوتیں تو عمر بھر علی کی نوکری کرتا (تذکرۃ الخواص)

---

[1] مروج الذہب ج ۲ صفحہ ۳۱

نقلاً از مسند احمد و مروج الذہب وغیرہ (حدیث منزلت کو صحیح بخاری و مسلم میں بھی ذکر کیا گیا ہے اور فضل بن روزبہان جیسے متعصب مزاج نے بھی اسے تسلیم کیا ہے۔ (دلائل الصدق)

بروز خندق عمرو بن عبدود عامری کے مقابلہ سے جب تمام مسلمان عاجز آچکے تھے اور سورہ احزاب میں خداوند کریم نے مسلمانوں کی حالت خوف اس طرح بیان کی ہے بَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ۔ ڈر کے مارے دل حنجروں تک پہنچ گئے تھے۔ وَتَظُنُّونَ بِاللّٰہِ الظُّنُونَا اور تم لوگ اللہ پر بدگمان ہو رہے تھے اور تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ مسلمانوں پر سنسنی چھا گئی تھی اُس وقت حضرت علی علیہ السلام نے نہایت جرأت سے میدانِ کارزار کی طرف قدم بڑھایا تو تمام تاریخیں متفق ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا بَرَزَ الْاِیْمَانُ کُلُّہٗ اِلَی الْکُفْرِ کُلِّہٖ (سب کا سب ایمان سب کے سب کفر کے مقابلہ میں جا رہا ہے) علامہ نے اس روایت کو اتفاقی قرار دیا ہے اور فضل بن روزبہان نے اس کو صحیح روایت مانا ہے (دلائل الصدق)

حدیث مواخاۃ جو متفق علیہ ہے اور کتبِ صحاح میں مذکور ہے جب حضرت رسالت پناہ نے مہاجرین و انصار میں بھائی چارہ قائم کیا تو حضرت علی کو اپنا بھائی قرار دیا۔ (دلائل الصدق)، مروج الذہب ج ۲ ص ۳۱

حضرت علی علیہ السلام کے وفورِ علم اور وسعتِ معلومات کا کوئی مسلمان انکار ہی نہیں کر سکتا چنانچہ علامہ حلی نے مسند احمد و صحیح مسلم سے نقل فرمایا ہے کہ اصحاب پیغمبر میں سے کسی کو سوائے علی کے اس دعویٰ کی جرأت نہ ہوئی، جو چاہو مجھ سے پوچھ لو، سوائے علیؑ کے۔ اور رسول اللہؐ نے ان کے حق میں فرمایا تھا اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا (میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے)

اس پر فضل بن روزبہان نے حدیث کو تسلیم کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس سے حضرت علیؑ کے وفورِ علم واقعات کے استحضار اور مختلف علوم و معارف میں ان کی دسترس کا پتہ چلتا ہے اور حضرت علی کے متعلق یہ سب باتیں قابلِ تسلیم ہیں۔

دوشِ رسول پر سوار ہو کر کعبۃ اللہ سے بت توڑنا حضرت علی کا وہ شرف ہے جس میں آپ کا کوئی سہیم و شریک نہیں ہو سکتا۔ اور اس روایت کو مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵ مسند احمد ج ۱ ص ۸۴، اور کنز العمال ج ۶ ص ۴۰۷ سے نقل کیا گیا ہے۔

اور حضرت علی علیہ السلام کی امامت حقہ پر واضح ترین وہ حدیث ہے جس میں علی کو مع الحق اور حق کو مع علی کہا گیا ہے۔

حق علیؑ کے ساتھ

علامہ حلی نے "احقاق الحق" میں حدیث ۲۴۷ "فی الجمع بین الصحاح الستۃ" جناب رسول اللہؐ نے فرمایا اللہ علی پر رحم کرے۔

" اے اللہ حق کو ادھر پھیر دے جس طرف علی ہو" اور جمہور نے روایت کی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا
عمار کو۔ میری اُمت میں میرے بعد ناخوشگوار اُمور ہوں گے اور اختلاف اس وقت تک ہوگا کہ آپس میں
آزادانہ تلوار کا استعمال ہوگا اور باہمی قتل و قتال اور ایک دوسرے سے بیزاری کا بازار گرم ہوگا اے
عمار تجھے باغی گروہ قتل کرے گا جب کہ تو حق کے ساتھ ہوگا اور حق تیرے ساتھ ہوگا۔ علی تجھے ہلاکت
کے قریب نہ کرے گا اور ہدایت سے دور نہ لے جائے گا۔ اے عمار جو شخص تلوار حمائل کر کے دشمن
کے مقابلہ میں علی کی حمایت کرے گا اللہ بروز محشر اُسے بطور انعام دو موتیوں کے ہار پہنائے گا۔ اور
جو شخص گلے میں تلوار لٹکا کر علی کے خلاف اس کے دشمن کی مدد کرے گا۔ اللہ بروز محشر اس کے گلے میں
جہنم کے دو طوق ڈالے گا جب اس قسم کی نوبت آجائے تو میرے دائیں جانب بیٹھے ہوئے شخص یعنی علی
کا دامن نہ چھوڑنا۔ اگر تمام لوگ ایک وادی میں ہوں اور صرف علی دوسری وادی میں ہو تو اس وادی میں قدم
رکھنا جس میں علی ہو اور باقی تمام لوگوں کو چھوڑ دینا۔ اے عمار۔ علی ہدایت پر رہے گا۔ اے عمار علی کی اطاعت
میری اطاعت ہے اور میری اطاعت اللہ کی اطاعت ہے اور حضرت عائشہ سے مروی ہے۔ آپ
نے فرمایا اَلْحَقُّ مَعَ عَلِیٍّ وَعَلِیٌّ مَعَ الْحَقِّ لَنْ یَفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ (یعنی حق علی
کے ساتھ اور علی حق کے ساتھ ہے۔ یہ دونوں ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔ یہاں تک
کہ حوض کوثر پر دونوں میرے پاس وارد ہوں گے)

بہر حال تمام وہ اوصاف جو انسان کو پستی سے بلندی کی طرف لے جاتے ہیں حضرت علی میں بدرجہ
اتم موجود تھے اور بعض ایسے صفات جن میں سے دو ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے مثلاً شجاعت اور نرم مزاجی
اسی طرح جرأت و خوفِ خدا میں گریہ۔ حضرت علی میں یہ صفات بھی درجہ کمال پر تھے۔ آج تک چشمِ فلک
نے نہ میدانِ کارزار میں علی جیسا بہادر دیکھا اور نہ مسجد میں اس جیسا کوئی خوفِ خدا سے گریہ کناں دیکھا
وہ ایک ہی وقت میں جہاں بے مثال جری اور دلیر تھے نرم مزاج اور رحیم بھی تھے وہ دشمنوں کے لئے
برق، قہر قہار تھے۔ اور دوستوں کے لئے سایہ رحمت پروردگار تھے اسی طرح علوم و فنون۔ محاسن و
مکارم اور مناقب و معارف کے لحاظ سے فیوض و برکات کا بحر بیکراں اور سمندر بے پایاں تھے اسی
بنا پر ابن عباس کا قول ہے کہ میرا اور جملہ اصحاب رسول اللہؐ کا علم علی کے علم کے مقابلہ میں اس طرح
حقیر تھا جس طرح ایک قطرۂ آب سات سمندروں کے مقابلہ میں۔ (الغدیر)

بہر حال علی کی ذات والاصفات ہی اس قابل تھی جس پر حضورؐ کو مکمل اعتماد تھا۔ اسی لئے
تو شبِ ہجرت انہی کو اپنے بستر پر سلا کے گئے اور اپنی امانتیں ادائیگی کے لئے حضرت علی کے ہی سپرد

کر گئے اور آخری حج (حجۃ الوداع) کے موقع پر خمِ غدیر کے وسیع و عریض میدان میں لاکھوں کے سامنے علی کی جانشینی کا اعلان بھی کیا۔ اس سے پہلے سورہ برائت کی تبلیغ کے لئے حضرت ابوبکر کو نامزد کر کے بحکم پروردگار حضرت علی کو اس کے پیچھے روانہ فرمایا کہ یہ اور اس قسم کے پیغامات بحکمِ خداوندی یا میں پہنچا سکتا ہوں یا وہ جو مجھ سے ہو۔ جب بعض قرآن کی تبلیغ کے لئے ایک آدمی کو حضور نے بحکم خدا اہل نہ سمجھا تو پورے قرآن کی تبلیغ کے لئے پوری اُمت کے لئے اسے کس طرح موزوں سمجھ سکتے تھے۔

رسالت مآبؐ کی وفات کے بعد ظاہری اقتدار میں رسہ کشی کا ہونا فطرتِ انسانیہ کا تقاضا تھا۔ اور اس پر شرعی اقتضا کو مقدم کرتے ہوئے حقدار کے لئے موقع فراہم کرنا بہت مشکل تھا پس اقتدار دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ سیاسی قیادت حضرت ابوبکر کے ہاتھ میں آگئی[1] اور دینی قیادت اپنی بلند صلاحیتوں کے پیش نظر حضرت علی کے ہی پاس رہی جس طرح بعض علمائے اہلِ سنت نے بدل ناخواستہ اس کا اعتراف کر لیا ہے۔ ان کے بعد حضرت عمر تختِ حکومت پر متمکن ہوئے تقریباً دس[2] سال ان کا دورِ اقتدار رہا پھر حضرت عثمان برسرِ اقتدار آئے تقریباً ۱۲ برس[3] حکومت کرنے کے بعد قتل کر دئے گئے۔ اس پچیس سالہ دور میں حضرت علی حکومت وقت کے تحت ایک عام شہری کی حیثیت سے بسر کرتے رہے نہ ان کے علمی فیوض سے آزادانہ طور پر کسی کو کچھ حاصل کرنا نصیب ہوا اور نہ ان کی نظامی و معاشرتی استعدادات کو بروئے کار لانے کا موقعہ دیا گیا اور نہ ان کی جنگی و فوجی صلاحیتوں کی بدولت ان کی جرأت و شجاعت سے استفادہ کرنا مناسب سمجھا گیا۔

زمانۂ اقتدار

رفتہ رفتہ حالات بد سے بدتر ہو چکے تھے اور جمہور اہلِ اسلام کو کوئی ایسا انسان نظر نہ آتا تھا جو ملک بھر میں پھیلے ہوئے ظلم و استبداد سے پیدا شدہ اضطراب کے خلاف اپنی صلاحیتوں کو اُجاگر کرے پس چار و ناچار لوگ علی کے دروازہ پر آئے اور اُن سے اقتدار سنبھالنے کی درخواست کی لیکن آپ وقت کی نزاکت کو خوب سمجھ چکے تھے اور جانتے تھے کہ اب حکومت حکومت نہیں رہی، بلکہ کانٹوں کا ہار بن چکی ہے لیکن صحابہ کے مسلسل اصرار سے آپ عنانِ اقتدار سنبھالنے پر مجبور ہو گئے اور اس کیفیت کا تذکرہ آپؑ نے اپنے خطبہ شقشقیہ میں بھی فرمایا ہے۔

اب ایک مرتبہ پھر دینی و سیاسی قیادت پچیس سالہ وقفہ کے بعد یکجا ہو گئی لیکن جن حکام نے دینی تقاضوں سے آزاد ہو کر حکومت کی چاشنی لی تھی انہیں کب دینی قیادت کے سامنے جھکنا گوارا تھا جب کہ ان کا اسلام لانا بھی محض زندگی کی حفاظت کی خاطر ہی تھا نہ کہ اسلام کی صداقت کی خاطر اور فتح مکہ کے موقع پر ہی وہ اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے تھے پھر زیادہ دیر تک صحبت نبوی میں رہنے کا موقعہ بھی نہ ملا تھا تاکہ ان کے اخلاق و کردار اور عادات و اطوار پر اسلام کی تعلیمات کا اثر ہوتا اور

---

[1] مدت خلافت ۲ سال ۳ ماہ ۸ دن مروج الذہب ج ۲ ص ۳۰۴ [2] ۱۰ سال ۱۱ ماہ ۱۳ دن [3] مروج الذہب ص ۳۰۵

پھران کے دلوں میں ایک طرف اسلامی حقیقت پختہ نہ تھی اور دوسری طرف جنگ بدر کے مقتول رشتہ داروں کا جذبہ انتقام بھی کارفرما تھا۔ ان تمام حالات وحقائق کے پیش نظر خلیفہ مقتول کے قتل کا ملزم حضرت علی کو ٹھہرا کر اس بہانے سے بغاوت کی داغ بیل ڈال لی اور رفتہ رفتہ اقتدار کے حصول کی کوشش میں دعوئ خلافت تک پہنچے۔ ان حالات کے پیش نظر حضرت علی نے مدینہ کے بجائے کوفہ کو دارالسلطنت قرار دیا تاکہ جنگ وجدال کی وجہ سے مدینہ نبوی کی حرمت ضائع نہ ہو۔ حضرت علی کے پنجسالہ دورِ حکومت میں آپ کو کبھی چین نصیب نہ ہوا حتیٰ کہ جو غلط اقدامات شرعی نقطۂ نظر سے سابق حکومتوں میں کئے گئے تھے۔ ان کی بھی اصلاح نہ ہو سکی اور آپ کا قیمتی وقت جنگ جمل وصفین ونہروان میں الجھ کر رہ گیا۔ کاش امتِ اسلامیہ ایسے عالم وفاضل مدبّر ومقنن اور مصلح ومحسن نائب رسول سے خاطر خواہ استفادہ نہ کر سکی آپ نے عدل وانصاف حقوق نفس حقوق معاشرہ حقوق تمدن حقوق رعایا اور حقوق سلطان کے متعلق جو مفصل ہدایات پیش فرمائیں وہ رہتی دنیا تک اسلامیان عالم کی رہنمائی کرتی رہیں گی۔ آپ کی شہادت ۶۳ برس کی عمر میں ۴۰ھ میں ہوئی عبدالرحمٰن بن ملجم مرادی آپ کا قاتل ہے انیس رمضان کی صبح کو تلوار کی ضرب لگی جب کہ آپ جامع مسجد کوفہ میں نماز پڑھ رہے تھے دو دن بستر علالت پر بے چین رہے اور اکیس ماہ مبارک کی رات عالم جاودانی کی طرف چل بسے۔ آپ کا مزار نجف اشرف میں زیارت گاہ اہلِ اسلام ہے۔ آپ کے اقتدار کا زمانہ ۴ سال ۹ ماہ اور ایک دن ہے۔ مروج الذہب ج۲ ص۳۰۵

دوسرے امام

حضرت حسن بن علی بن ابی طالب علیہ السلام

آپ کی ولادت باسعادت ۱۵ رمضان ۳ھ مدینہ منورہ میں صدیقہ طاہرہ حضرت فاطمہ زہرا بنت رسول اللہؐ کے بطن مبارک سے ہوئی۔ آپ کا نام نامی حضرت رسالت مآبؐ نے حسن رکھا آپ کی کنیت ابو محمد اور لقب مجتبیٰ زیادہ مشہور ہے۔ آپ کی تقریباً سات برس کی عمر میں آپ کے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی رحلت ہوئی۔ بچپنے میں آپ کی تربیت اپنے نانا جان کے زیر اثر ہوئی۔ ساتویں دن آپ کا عقیقہ بھی رسول اللہؐ نے کیا تھا۔ کئی دفعہ حضورؐ ان کو اپنے دوشِ اقدس پر سوار کر کے سیر کراتے تھے بعض اوقات آپ منبر پر جلوہ گر ہوتے تو امام حسن ان کے پہلو میں ہوتے تھے امام حسن کا چہرہ رسول اللہؐ کے چہرہ کے مشابہ تھا بعض اوقات حالت سجدہ میں آپ رسول اللہؐ کی پشت پر سوار ہو جاتے اور وہ سجدہ سے سر بلند نہیں کرتے تھے جب تک یہ اُتر نہ جائیں۔ حضور کی

محبت کا یہ عالم تھا کہ گود میں بٹھا کر بہت دیر ان کو بوسے دیا کرتے تھے حضرت رسالت مآب سے یہ حدیث
کتبِ صحاح میں مروی ہے آپ نے فرمایا میرے شہزادے حسن وحسین جوانانِ جنت کے سردار ہیں حضور
کی وفات کے تھوڑے عرصے کے بعد ان کے سر سے اپنی والدہ ماجدہ جناب فاطمہؑ زہرا کا سایہ بھی اُٹھ گیا۔

ابتدائی بچپنے میں باپ کے علاوہ نانا اور ماں کا سایہ عاطفت بھی رہا۔ اس کے بعد حضرت علیؑ کے
زیر سایہ جوان ہوئے۔ حضرت عثمان کی حکومت کے زمانہ میں آپ بھرپور جوان تھے لیکن عمدہ صلاحیتوں اور
خوبیوں کے باوجود مخصوص مصالح کے پیش نظر ان کو عوامی ملکی وملی خدمات کا موقعہ نہ دیا گیا۔ بس اپنے پدر عالیمقدار
کے ساتھ گوشۂ عزلت میں بسر کرتے رہے۔

زہد وتقویٰ کا یہ عالم تھا کہ ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء میں ذکر کیا ہے آپ نے بیس حج مدینہ سے
پاپیادہ کیں حالانکہ سواریاں بھی ہمراہ ہوا کرتی تھیں آپ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے شرم آتی ہے کہ بارگاہِ پروردگار
کی طرف سوار ہو کر جاؤں۔ بعض روایات میں پچیس حجوں کا ذکر بھی ہے (تذکرۃ الخواص)

حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد آپ کی بیعت کی گئی اور آپ کو سیاسی قیادت کی
مسند سونپ دی گئی اور دینی قیادت کے لئے شبِ شہادت حضرت علی علیہ السلام نے اپنی تمام اولاد کو
بلا کر امام حسن کی امامت وسیادت کی وصیت کر دی تھی اور ملاقاتیوں کو بھی فرما دیا تھا کہ حضرت رسالتمآب
کے بعد امام حسنؑ انکا دوسرا خلیفہ ہے جس کے ہاتھ میں دینی وسیاسی ہر دو قیادتیں جمع ہیں اور واقعتاً آپ اپنے
باپ کے بعد اس کے اہل بھی تھے آپ نے اپنے باپ کی طرح کوفہ ہی کو دار السلطنت رکھا۔

معاویہ حضرت علی کی خلافت کے زمانہ میں بغاوت کا اعلان کر چکا تھا اور کافی علاقے اُس نے
اپنی جنگی سرگرمیاں جاری رکھتے ہوئے اپنے ساتھ ملا لئے تھے حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد
اس کے لئے مزید سہولتیں پیدا ہو گئیں۔ معاویہ نے امام حسن کے خلاف جنگی محاذ کو بہت کافی طاقتور بنا لیا۔
چنانچہ اس نے بھاری فوجی جمعیت کے ساتھ عراق پر حملہ کرنے کے لئے اپنے ایک جرنیل کو روانہ کر دیا معاویہ
خود بھی جنگی چالوں میں کسی سے کم نہ تھا لیکن اس کا وزیر اعظم عمرو عاص جس نے فیصلہ تحکیم میں مسلمانوں کے اتحاد
کی عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی اور اس سے پہلے جنگِ صفین کی شکست کو قرآن کو نیزوں پر
بلند کر کے فتح سے تبدیل کر چکا تھا وہ سیاست کا گرو گھنٹال تھا اُس نے چند ہی دنوں میں حالات کی ایسا
کایا پلٹ کر رکھ دی کہ امام حسن کے لئے قدم قدم پر کانٹوں کا جال بچھا ہوا تھا پس آپ نے حالات سے
مجبور ہو کر اقتدار سے دستبردار ہو جانے اور کرسیٔ اقتدار کو معاویہ کے حوالہ کرنے میں بھلائی سمجھی۔ آپ کے
اقتدارِ ظاہری کا زمانہ ماہ ربیع الاول ۴۱ھ کے آخر تک کل چھ مہینے اور چند دن تھا۔ آپ اقتدار سے

دست بردار ہو گئے۔ اور کشت و خون کے لرزہ خیز انجام کو بھانپ کر حکومت سے استعفا دے دیا۔

اس کے بعد کچھ عرصہ تک آپ کوفہ میں رہے پھر معاویہ نے ان کو شام آنے کی دعوت دی۔ پس آپ دمشق تشریف لے گئے اور چند دن وہاں رہ کر مدینہ میں آ گئے۔ تقریباً سینتالیس برس کی عمر میں ۲۸ صفر ۵۰ھ کو زہر سے شہید ہوئے۔ معاویہ نے جعدہ بنت اشعث کے ذریعہ سے زہر دلوائی تھی مروج الذہب ج ۲ ص ۳۰۳

واقدی سے منقول ہے کہ امام حسن نے وصیت کی تھی کہ مجھے قبر رسول کے پاس دفن کیا جائے لیکن بنی اُمیہ نے وہاں دفن نہ ہونے دیا۔

اور حضرت عائشہ بھی امام حسن کے روضہ رسول میں دفن ہونے کے خلاف تھیں (تذکرۃ الخواص) پس آپ کی لاش مبارک کو جنت البقیع میں سپرد خاک کیا گیا۔

تیسرے امام

حضرت حسین بن علی بن ابی طالب علیہ السلام

ولادت باسعادت ۳ شعبان المعظم ۴ھ مدینہ منورہ میں سیدۂ طاہرہ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے بطن مبارک سے ہوئی۔ آپ کا نام نامی بھی حضورؐ نے رکھا۔ ساتویں دن عقیقہ کیا۔ آپ کی کنیت ابو عبداللہ اور لقب سید الشہدا زیادہ مشہور ہے۔ چھ برس کی عمر میں نانا کا سایہ عاطفت سر سے اُٹھ گیا پھر شیعی روایت کے ماتحت زیادہ سے زیادہ نانا کے بعد ۳ ماہ تک ماں کا سایہ سر پر رہا اور یہ بھی ختم ہو گیا۔

حضور کی ان سے بے حد محبت تھی کندھوں پر سوار کر کے دونو بھائیوں کو مدینہ کی گلیوں میں بعض اوقات پھراتے رہے ان کے لبھائے مبارک کے بار بار بوسے لیتے تھے حدیث صحیح میں آپ نے فرمایا حسن و حسین جوانان جنت کے سردار ہیں۔ آپ آیت تطہیر کے بھی مصداق ہیں کیونکہ حضور نے حضرت علی حضرت فاطمہ امام حسن اور حسین ان سب کو اٹھا کر کے ان کے اُوپر ایک چادر ڈال دی اور آیت تطہیر پڑھی اور پھر کہا اے خدا یہی میرے حقیقی اہل بیت ہیں (تذکرۃ الخواص نقلاً از مسند احمد بن حنبل) آپ بھی حالت سجدہ میں بعض اوقات رسول اللہ کی پشت مبارک پر سوار ہو جایا کرتے تھے اور اتنے تک حضور سر نہ اٹھاتے جب تک یہ اپنی مرضی سے اتر نہ جاتے۔ آپ کا بھی دستور تھا کہ ہر سال پاپیادہ حج بیت اللہ کو جاتے تھے (تذکرۃ الخواص)

ایک دفعہ امام حسینؑ مسجد نبوی میں داخل ہوئے جب حضرت عمر منبر رسول پر بیٹھ کر تقریر کر رہے تھے تو آپ نے دیکھ کر فرمایا میرے باپ کے منبر سے اُتر آؤ۔ حضرت عمر نے اٹھا لیا اور اپنے پہلو

میں ان کو بٹھالیا۔ (تذکرۃ الخواص)

آپ چھ برس ابتدائی اپنے نانا رسول اللہ کے زیر سایہ رہے پھر خلفائے ثلثہ کے سیاسی اقتدار کو دیکھا۔ پانچ برس اپنے والد ماجد کی حکومت کے سائے میں کوفہ میں رہے اور سیاسیاتِ ملکیہ میں نمایاں کردار ادا فرمایا چنانچہ جنگِ صفین میں آپ نے جنگی صلاحیتوں کا بھی مظاہرہ فرمایا۔ حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد چھ ماہ تک امام حسن علیہ السلام کے اقتدار کا زمانہ دیکھا۔ پھر اپنے بھائی کے ہمراہ واپس مدینہ میں پلٹ کر آگئے اور بیس برس متواتر معاویہ کے دورِ اقتدار میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے رہے سنہ ۶۰ھ ۲۲ رجب کو معاویہ مرگیا اور اس کا بیٹا یزید عنید تخت نشین ہوا۔ ہوا کے ساتھ ساتھ اسلامی اقدار کو بدلنے والے جمہور مسلمانوں نے اس کے ہاتھ پر بیعت کرلی اور زہری کہتا ہے مجھے سعد بن ابی وقاص اور عبداللہ بن عمر پر تعجب آتا ہے کہ انہوں نے حضرت علی کی بیعت تو نہ کی لیکن یزید کی بیعت کرلی۔ (تذکرۃ الخواص)

حالات مذہبی و سیاسی پلٹا کھا چکے تھے سابق حکومتوں نے مذہب اور سیاست کو اور دین و حکومت کو ایک سمجھ رکھا تھا۔ پہلی تین حکومتوں میں عوام کے ذہن نشین کرنا کہ "اقتدار الگ ہے اور دین الگ ہے" بہت مشکل تھا کیونکہ زمانہ پیغمبرؐ کے قرب کی وجہ سے اسلامی تعلیمات سے متاثر عوام چونکہ سلاطین وقت کو بھی ظاہری طور پر اسلامی کردار کا حامی پاتے تھے لہذا وہ اس دقیق فرق کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ اس لئے حضرت علی نے تھوڑے دنوں تک مجالسِ انصار میں پہنچ کر اپنی آواز بلند کی تو اس نتیجہ تک پہنچے کہ سردست خاموشی ہی بھلی ہے پس حسب ضرورت مسائل بیان کردیتے تھے جب کوئی دریافت کرتا تھا ورنہ خاموش ہی رہتے تھے۔

رفتارِ زمانہ

رفتہ رفتہ حکومت و اقتدار کا نشہ اپنا اثر ظاہر کرتا رہا اور اسلامی معاشرہ سیاسی رنگ میں ڈھلتا گیا اور عثمانی دور میں لوگوں کی آنکھیں کھلنی شروع ہوئیں کہ اسلام کچھ اور تھا اور یہ حکومت کچھ اور ہے لیکن کرسئ اقتدار کی حمایت میں پیش کردہ روایتی مواد حکومت پر لب کشائی نہیں کرنے دیتا تھا لوگ خلیفہ کی ہر بے راہ روی کو دامن تاویل میں جگہ دیتے رہے لیکن حالات دن بدن خراب ہوتے چلے گئے اور خلیفہ لوگوں کی اس چشم پوشی سے مزید جرات اپنے اندر محسوس کرتا گیا اور آگے بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ عوام کا دامن صبر و ضبط اور دائرہ تاویل و تمثیل تنگ ہوگیا اور اکابر صحابہ کے اصلاحی اقدامات بھی ناکام ہوگئے پس انجام کار حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔

اب حضرت علی کی ظاہری بیعت تو ہوگئی اگر ان کو آرام و سکون سے سلطنت کے امور کو

سنبھالنے کا موقعہ ملتا تو سیاسی اقتدار کی طرف سے لائی ہوئی خرابیاں تدریجاً ختم ہو جاتیں اور اسلام اپنے اصلی خدوخال میں منظرِ عام پر پلٹ کر آ جاتا لیکن ہوسِ اقتدار کے متوالے اور کرسئ حکومت کے دیگر خواہشمند فوراً قتلِ عثمان کا بہانہ لے کر میدان میں کود پڑے اور حضرت علی کو اصلاحی اقدامات کا موقعہ تک نہ دیا بس دین وسیاست اور اسلام واقتدار میں نمایاں فرق معلوم نہ کیا جا سکا اور عوام الناس کی حالت یہی رہی کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِهِمْ (لوگ بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں) پس حضرت علی کے بعد معاویہ برسرِ اقتدار آیا تو اس نے دینی و مذہبی اقدار کو کافی حد تک ختم کر دیا لیکن جمہور اہلِ اسلام اس کے اغلاط کو بھی صحابیت کے دامن میں چھپانے کی کوشش میں رہے اور جنگ جمل وصفین ونہروان میں تھوڑا بہت جو حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے کا موقعہ ملا تھا معاویہ کے دورِ حکومت میں اس کے اثرات کو ختم کر دیا گیا اور سرکاری احکام کے ذریعے سے حضرت علی اور اولادِ علی پر لعن وطعن کی جو بدعت شروع ہوئی۔ اس نے پھر حکومت کو دین اور اقتدار کو مذہب بنا کر رکھ دیا اور اس دورِ پرآشوب میں جن لوگوں نے حضرت علی کے حق میں اچھی عقیدت کا اظہار کیا ان کو عبرتناک اور سخت سے سخت تر سزائیں دی گئیں۔ خاندانوں کے خاندان برباد کر دئے گئے اس جرم میں کہ وہ علی سے محبت کرتے تھے۔ حتٰی کہ روضۂ رسول کے سامنے مسجدِ نبوی میں منبرِ رسول کے اوپر اموی خطیب حضرت علی کو گالیاں دیا کرتا تھا اور اولادِ علی کو مجبوراً سب کچھ سن کر برداشت کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ مودودی صاحب بھی "خلافت و ملوکیت" ص۱۷۴ پر اس امر کا اعتراف کر چکے ہیں۔

ان حالات کے پیشِ نظر ایک زبردست اقدام کی ضرورت تھی اور لوگوں کو کافی طاقت وقوت کے ذریعے اس لمبی غفلت اور طویل نیند سے جگانا تھا اور انہیں ایک بار پھر باور کرانا تھا کہ اقتدار اور دین دو الگ الگ چیزیں ہیں اور اب حضرت علی کے زمانہ کی طرح حالات نہ تھے کہ لوگ اقتدار اور مذہب میں فرق نہ کر سکیں کیونکہ اُس وقت اقتدار کا رویہ مذہب کے قریب قریب تھا اس لئے فرق کرنا عوام کے لیے مشکل تھا لیکن اس وقت اقتدار کا راستہ مذہب کے راستے سے بہت دور نکل گیا تھا۔ اور حکومت کا طرزِ عمل اسلامی کردار سے بہت مختلف ہو چکا تھا اس لئے صرف ٹھوکر مار کر عوام کو جگانا ضروری تھا پس امام حسین علیہ السلام نے یزید کی تخت نشینی کا اعلان ہوتے ہی کمرِ ہمت باندھی اور توکل کی پشت پر سوار ہو کر عزمِ صمیم کر کے گھر سے نکل پڑے اور بالآخر اسلامی تقدیر کی کایا پلٹ کر رکھ دی اور لوگوں کے لئے حق و باطل اسلام واقتدار اور امامت و ملوکیت کے درمیان ایک ایسا امتیازی نشان قائم کر دیا جس کو کبھی مٹایا نہیں جا سکتا۔

آپ جب مدینہ سے چلے تو مکہ ہی منزلِ مقصود تھی اور چہار ماہ کا عرصہ وہاں رہے۔ عبداللہ بن زبیر بھی مکہ ہی میں تھا۔ اموی غیر اسلامی حکومت اور اُن کے مظالم کے تذکرے اور اسلامیانِ عالم کے لئے اس سے نجات پانے کی تدابیر بھی زیرِ غور آتی رہیں لیکن پوری طاقت کے بغیر کسی اقتدار کا تختہ الٹنے کا تصور بھی کوئی دانا انسان نہیں کر سکتا اور خصوصاً جب کہ یزید جیسا مذہب و دین کی قیود سے آزاد ناخدا ترس انسان تختِ حکومت پر متمکن ہو جس سے اقتدار کی حفاظت کے لئے ہر بڑے سے بڑے گناہ اور سخت سے سخت جرم کو کر گذرنے کی توقع کی جا سکتی ہو اور ایسے حالات میں جب کہ لوگوں میں دینی قیادت اور سیاسی قیادت کے درمیان فرق کا تصور بھی نہ ہو۔ بنا بریں مودودی صاحب کا یہ دعویٰ قطعاً حقائق سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔ "بلاشبہ وہ اہلِ عراق کی دعوت پر یزید کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لئے تشریف لے جا رہے تھے" ص۱۷۹ خلافت و ملوکیت۔ بلاشبہ مودودی صاحب کا یہ شبہ غلط ہے جس کو اگلے لفظوں میں خود انہوں نے اپنے قلم سے باطل کر کے رکھ دیا ہے۔ فرماتے ہیں "یہ تو امر واقعہ ہے کہ وہ کوئی فوج لے کر نہیں جا رہے تھے بلکہ اُن کے ساتھ اُن کے بال بچے تھے اور صرف ۳۲ سوار اور چالیس پیادے۔ اسے کوئی شخص بھی فوج چڑھائی نہیں کہہ سکتا" اگر اسے فوج چڑھائی کوئی نہیں کہہ سکتا تو ایک بہت بڑی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے روانگی اسے کون کہہ سکتا ہے؟

مقصدِ عظیم

بے شک حضرت حسین علیہ السلام حکومتِ وقت کی سیاسی قیادت کا نہیں بلکہ اس کے ضمن میں جو اُنہوں نے اسلامی حکومت اور دینی قیادت کا دعویٰ کر رکھا تھا اس کا پردہ چاک کرنے جا رہے تھے یعنی ان کی اسلامی برتری اور مذہبی سربراہی کا تختہ اُلٹنے جا رہے تھے اور اس کے لئے فوج کی ضرورت نہیں تھی بلکہ اس کے بجائے عزمِ صمیم اور قلبِ قویم کی ضرورت تھی جس کو وہ اپنے سینہ میں رکھتے تھے پس آپ فتح مند ہوئے اور یزید کی دینی قیادت کا تختہ بالآخر اُلٹ ہی گیا۔ اور اس وقت تک جو لوگ برسرِ اقتدار طبقہ کی دینی قیادت کے قائل تھے انہیں اسلام کے صحیح راستہ کو معلوم کرنے میں آسانی ہو گئی اور وہ سمجھنے کے قابل ہو گئے کہ پیغمبرؐ کے زمانہ کے فوراً بعد ہی سے قیادت دینی و قیادت سیاسی کے دونوں شعبے الگ الگ ہو گئے تھے اور سیاسی حکمران محض سیاست کے مفاد کے لئے ہی مذہب سے رابطہ قائم رکھے ہوئے تھے بلکہ مذہب پر اپنی اجارہ داری کا جھنڈا لہرا رکھا تھا اور شہادتِ عظمیٰ حسین نے حقیقت کے منہ پر پڑے ہوئے سب پردے چاک کر ڈالے اسی وجہ سے جمہور اہلِ اسلام کے بعض علماء نے عزاداری کی حرمت کا فتویٰ دیا ہے کہ اس سے بعض صحابہ کے متعلق بدگمانیوں کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے اور یزید پر لعن کرنا بھی اسی لئے ناجائز قرار دیا ہے کہ کہیں یزید کا باپ اور دیگر صحابہ

اس لپیٹ میں نہ آجائیں جیسا کہ مودودی صاحب نے خلافت و ملوکیت کے صفحہ ۱۸۳ پر اس امر کا انکشاف کیا ہے۔

یہاں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اس قسم کے گھناؤنے جرم کے بعد بھی کیا وہ لوگ اپنے آپ کو دین و اسلام کا علمبردار تصور کرتے تھے؟ تو اس کی حقیقت "خلافت و ملوکیت" میں تاریخ طبری، کامل ابن اثیر اور البدایہ کے حوالوں سے ملاحظہ ہو۔

اس کے بعد اُن (خواتین) سمیت تمام شہدائے کربلا کے سر کاٹ کر کوفہ لے جائے گئے اور ابن زیاد نے نہ صرف بر سرِ عام ان کی نمائش کی بلکہ جامع مسجد میں منبر پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کیا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَظْهَرَ الْحَقَّ وَ اَهْلَهٗ وَ نَصَرَ اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ یَزِیْدَ وَ حِزْبَهٗ وَ قَتَلَ الْكَذَّابَ بْنَ الْكَذَّابِ الْحُسَیْنَ بْنَ عَلِیٍّ وَ شِیْعَتَهٗ ص۱۸۱

ترجمہ: اس اللہ کا شکر ہے جس نے حق اور حق والوں کو کامیاب کیا اور امیر المومنین یزید اور اس کے لشکر کی مدد کی اور (معاذ اللہ) کذاب بن کذاب حسین بن علی اور اس کے شیعوں کو قتل کیا۔"

اس سے صاف واضح ہے کہ یزید کے حکام یزید اور یزیدیوں کو اہل حق سمجھتے تھے اور حسین اور شیعانِ حسین کو اہل باطل قرار دیتے تھے اور جمہور اہل اسلام ان کے اس نعرہ میں ان کے ہمنوا تھے اور جس مسلک کو یزیدیوں کی طرف سے حق کا نام دیا جاتا تھا حضرت حسین اور شیعانِ حسین کے نزدیک وہی باطل تھا۔

یزیدیوں نے سرہائے شہدائے کربلا اور مخدرات عصمت کو شہر بشہر اور در بدر پھرانے میں حکومت کی بھلائی سمجھی وہ یہ خیال کرتے تھے کہ اس طریقے سے لوگوں پر حکومت کا رعب طاری ہو گا اور شیعانِ علی کی تحریک ختم ہو جائے گی پس جمہوری حکومت سے دینی قیادت کا الگ نعرہ ختم ہو جائے گا اور مذہب صرف جمہور اہل اسلام ہی رہے گا جو ہر کرسی اقتدار سنبھالنے والے کے ہاتھوں میں کھلونا بن کے رہ جائے گا اور اس کا وہی حشر ہو گا جو شریعت موسوی و عیسوی کا ہوا، لیکن اس کا الٹا اثر یہ ہوا کہ جہاں جہاں سے یہ اسیرانِ آل محمدؐ کا لٹا ہوا قافلہ گزرتا گیا لوگوں کے دلوں میں حکومت کے خلاف جذبات اُبھرتے گئے اور لوگ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ اقتدار کا راستہ کہاں جاتا ہے اور دینی قیادت کی منزل مقصود کیا ہے؟

اس کے بعد یزیدی فوج کے ہاتھوں مدینۃ الرسول کی تاراجی قتل عام اور بے حرمتی کے روح فرسا واقعہ نے پھر دوسری دفعہ اہل اسلام کے دل ہلا دئے، ان کو خلافت کے روپ میں یزید کفر و عناد اور زندقہ و الحاد کا مجسمہ نظر آنے لگا، پھر اسی فوج کے ہاتھوں کعبہ کی بے حرمتی اور حرم پروردگار کی توہین نے ذرا بھر بھی انصاف رکھنے والوں کے لئے قطعاً شک و شبہ کی گنجائش نہ باقی رکھی کہ دین و اقتدار

دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ واقعہ ہائلہ کربلا ۱۰ محرم ۶۱ھ بروز جمعہ ہوا۔

فتح مبین

ان واقعات کے نتیجہ میں اموی سلطنت کی طرف سے عامۃ المسلمین کے دلوں میں تنفر کی لہر دوڑ گئی۔ پس اقتدار کے قدم لڑکھڑانے لگ گئے۔ شہادتِ حسینی کا المیہ چونکہ عراق کا حادثہ تھا اس لئے خونِ حسین کے انتقام کا نعرہ بلند کرکے مختار بن ابی عبیدہ ثقفی نے اموی حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا لوگ دھڑا دھڑ اس کے جھنڈے تلے جمع ہوئے اور کوفہ کا پایۂ تخت پوری طرح ان کے زیرنگیں ہوگیا۔ اموی فوج نے مقابلہ کیا لیکن بُری طرح انہوں نے شکست کھائی اور قاتلانِ حسین کو مختار نے چن چن کر بُری طرح مروایا اور تاراجی مدینہ و توہین کعبہ سرزمین حجاز کے المیے تھے اس لئے عبداللہ بن زبیر نے اس صوبے میں اموی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی اور اس صوبے پر اس کے اقتدار کا سکہ بیٹھ گیا پس اسلامی سلطنت تین گروہوں میں تقسیم ہوگئی۔ مختار کے مفصل واقعات ہماری

اب مختار اور ابن زبیر کے درمیان جنگِ اقتدار نے سر اٹھایا اور دو نو طرف سے بے تحاشا خون کے دریا بہنے لگے۔ بنی اُمیہ کے لئے ان کی باہمی جنگ مفید ثابت ہوئی۔ مصعب بن زبیر کے ہاتھوں مختار مارا گیا اور زیادہ لڑائیوں کی وجہ سے فوج پر کمزوری مسلط ہوگئی پس بنی اُمیہ کی مجموعی طاقت کے مقابلہ میں ابنِ زبیر کی فوجیں نہ ٹھہر سکیں اور یہ بھی مارا گیا اور اقتدار پھر ایک مرتبہ بنی اُمیہ کے بدترین خاندان (بنی مروان) کے ہاتھ میں آگیا اور تمام اسلامیانِ عالم دوسری دفعہ پھر اموی سلاطین کے مظالم کی زد میں آگئے۔

عراق کی سرزمین جہاں ایک وقت حضرت علی کی حکومت کا پایۂ تخت تھا اور واقعہ عظمیٰ کربلا بھی اسی سرزمین پر ہوا اس کے نتیجہ میں مختار نے انتقامِ خونِ حسین کا نعرہ بلند کرکے شیعی تحریک کو اس صوبہ میں کافی مضبوط کر لیا تھا۔ اِسی لئے اموی حکومت کی جانب سے یہاں کا گورنر حجاج بن یوسف کو مقرر کیا گیا جس کے نزدیک انسان کی جان کی قیمت ایک چیونٹی کے برابر بھی نہ تھی۔ حضرت علی اولادِ علی اور شیعانِ علی پر سب وشتم کا دور دَورہ زوروں پر ہوگیا اور شیعانِ علی کو بلا دریغ تہ تیغ کیا جانے لگا۔ اور اس کے ظلم کی داستان مودودی صاحب اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

> اس (حجاج بن یوسف) کے زمانے میں جو لوگ قید کی حالت میں کسی عدالتی فیصلے کے بغیر قتل کئے گئے صرف ان کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار بتائی جاتی ہے جب وہ مرا ہے تو اس کے قیدخانوں میں ۸۰ ہزار بے قصور انسان کسی مقدمے اور کسی عدالتی فیصلے کے بغیر سڑرہے تھے اور یہ ظالم گورنر تھا جس کے حق میں عبدالملک نے اپنی اولاد کو مرتے وقت وصیت کی کہ "حجاج بن یوسف کا ہمیشہ لحاظ کرتے رہنا کیونکہ یہ وہی ہے جس نے ہمارے لئے سلطنت ہموار کی دشمنوں

کو مغلوب کیا اور ہمارے خلاف اٹھنے والوں کو دبا دیا[۱۸۶]۔

اچھا ہوا کہ جمہور اہل اسلام کے مسلک کی تشکیل اموی دور میں نہ ہوئی ورنہ اگر مذہب جمہور کی تشکیل اموی دور میں ہوتی تو چوتھی جگہ خلیفہ ہونا تو درکنار حضرت علی کا صحابہ میں بلکہ اہل اسلام کی فہرست میں بھی نام نظر نہ آتا اور شیعانِ علی سے حضرت علی کے اسلام کا ثبوت طلب کیا جاتا۔

بہر حال شہادتِ حسین نے جہاں ایک طرف شیعان علی میں ثبات قدم اور غیرت نفس کا جذبہ بھر دیا وہاں جمہور اہل اسلام کو اس اُصول (قیادتِ دینی و سیاسی کی وحدت) کے توڑنے پر مجبور کر دیا اور ثابت کر دیا۔ اقتدار اور دین لازم و ملزوم نہیں ہیں اور دینی و سیاسی قیادت کے راستے الگ الگ ہیں۔ وہ اگرچہ اپنی آبائی تقلید اور کثرت کی ہاؤ ہو کے تاثر سے نکل جانے کی جرأت کر کے شیعان علی کے ہمنوا تو نہ ہوئے لیکن اپنے سابق طریق پر بھی جم نہ سکے اور ان کو مجبوراً دینی قیادت کا راستہ سیاسی قیادت سے الگ کرنا پڑا یزید اور اس کے بعد کے سلاطین جور کے کردار بد پر پردہ ڈالنا چھوڑ دیا البتہ وہ معاویہ و عثمان کی غلط کاریوں پر لیپ پوت کا پردہ دے کر آبائی تقلید کی لاج رکھتے ہوئے ان کے احترام کو خیرباد نہ کہہ سکے اور ان سے سابق حکمرانوں کے متعلق تو سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ واقعہ کربلا کی مفصل رُوداد " اصحاب الیمین میں پڑھیئے۔

چوتھے امام

حضرت علی بن الحسین زین العابدین علیہ السّلام

آپ کی ولادت باسعادت مدینہ منورہ میں حضرت علی علیہ السلام کی خلافت ظاہریہ کے زمانہ میں ۳۸ھ ۲۵ جمادی الاولیٰ کو ہوئی۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا نام نامی شاہِ زنان تھا۔ بعض مورخین نے سن ولادت ۳۳ھ اور بعضوں نے ۳۷ھ بھی لکھا ہے (تذکرہ)

قول مشہور کی بنا پر واقعہ کربلا میں آپ کی عمر شریف تقریباً ۲۳ برس تھی۔ مشہور روایت یہ ہے کہ آپ کی ولادت کے چند دن بعد آپ کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔

واقعہ کربلا میں آپ پورے جوان تھے لیکن بیماری کی وجہ سے شریک جنگ نہ ہوئے آپ اسیری کے علاوہ ماؤں بہنوں پھوپھیوں اور دیگر مخدرات خانوادۂ عصمت کی بے پردگی کے روح فرسا واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے لیکن اپنے صبر و ضبط اور ہمت و استقلال میں فرق نہ آنے دیا۔ زندان شام سے رہائی کے بعد واپس مدینہ میں پہنچے اور پورے ۳۵ برس کی بقایا زندگی گوشۂ عزلت میں بحالتِ غم بچشم نم گذار دی۔

زہد وتقویٰ کا یہ عالم تھا کہ آپ وضو کو دیکھ کر بدن تھرا جاتا تھا اور رنگ زرد ہو جاتا تھا۔ جب وجہ پوچھی جاتی تو فرماتے تھے تمہیں کیا خبر کہ میں کس کے دربار میں حاضری کی تیاری کر رہا ہوں؟ آپ نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو جسم مبارک میں لرزہ طاری رہتا تھا۔ دریافت کرنے پر فرماتے تھے تمہیں کیا معلوم کہ میں کس ذات سے مناجات کرنا چاہتا ہوں (تذکرۃ الخواص)

بلندی اخلاق وکردار کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے آپ کو دل کھول کر ناسزا الفاظ کہے۔ آپ خاموشی سے سب کچھ سنتے رہے پھر آپ اس کے گھر میں گئے لوگوں کا خیال تھا کہ آپ انتقامی کاروائی کریں گے لیکن آپ نے اس سے فرمایا کہ جو کچھ تو نے مجھے کہا ہے اگر درست تھا تو خدا مجھے معاف کرے اور اگر غلط تھا تو خدا تجھے معاف کرے پس اس نے آپ سے معافی مانگ لی۔

ہر رات کو ایک ہزار رکعت پڑھنا آپ کا معمول تھا (تذکرہ) اس پر ابن تیمیہ کا اعتراض محض اس کی اموی عصبیت کا اظہار ہے (اور یہاں اس کے جواب کا مقام نہیں ہم نے اس کا مفصل جواب مقدمہ تفسیر انوار النجف اور کتاب عقائد لمعۃ الانوار میں دے دیا ہے) آپ کا یہ دستور تھا کہ ہر رات کو روٹیوں کا گٹھا اٹھا کر مساکین مدینہ کو غذا پہنچاتے تھے جب آپ کی رحلت ہوئی تو معلوم ہوا کہ پورے ایک سو خاندان کے افراد آپ کے زیر کفالت زندگی گذار رہے تھے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے میرے والد ماجد حضرت علی بن الحسین علیہما السلام نے فرمایا پانچ قسم کے لوگوں کو دوست نہ بنانا۔

(۱) فاسق۔ کیونکہ وہ ایک لقمہ یا اس سے بھی کم قیمت پر تم کو فروخت کر دے گا۔

(۲) بخیل۔ تجھے ضرورت کے وقت اپنے مال کی اعانت سے (ازراہ بخل) محروم کرے گا۔

(۳) جھوٹا۔ اس کا قول سراب بے حقیقت کی مانند ہے قریب کو بعید اور بعید کو قریب ظاہر کریگا۔

(۴) احمق۔ وہ نفع پہنچانے کے ارادے سے بھی تجھے نقصان دے بیٹھے گا۔

(۵) قاطع الرحم۔ کیونکہ اس کو میں نے کتاب اللہ میں متعدد مقامات پر ملعون پایا ہے۔

سیاسی انقلاب

آپ کی زندگی میں سیاسی انقلابات کافی رونما ہوئے آپ کی ڈیڑھ دو برس کی عمر میں آپ کے دادا بزرگوار حضرت علی علیہ السلام کی شہادت ہوئی پھر چھ ماہ کے بعد آپ کے چچا بزرگوار امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام بھی اقتدار سے دستبردار ہو گئے اور کرسئ اقتدار پر معاویہ کا مکمل قبضہ ہو گیا۔ ۲۲ رجب سنہ ۶۰ھ کو معاویہ مر گیا اور اقتدار کا مالک یزید کو مقرر کیا گیا ماہ محرم سنہ ۶۱ھ میں کربلا کا دل ہلا دینے والا سانحہ عظمیٰ پیش آیا۔ پھر دو سال بعد ذوالحجہ سنہ ۶۳ھ میں واقعہ حرہ پیش

آیا جب کہ اہلِ مدینہ نے یزید کے ظلم وستم اور کفر وعناد کی داستانیں سن کر اس کی بیعت توڑ ڈالی اور عمرو بن حنظلہ کو اپنا سربراہ بنالیا۔ یزید نے مسلم بن عقبہ کو ۱۲ ہزار فوج دے کر تاراجی مدینہ کے لئے بھیجا۔ اس ظالم نے مدینہ کو فتح کر کے تین دن تک فوجیوں کو شہر میں ہر قسم کا اودھم مچانے کی کھلی چھٹی دے دی۔ مدینہ نبوی میں لوٹ کھسوٹ اور قتل وغارت کا خوب بازار گرم ہوا چنانچہ نہایت محتاط اندازے سے سات سو معززین اور دس ہزار عوام مارے گئے۔ اور عورتوں کی آبروریزی کی کوئی حد باقی نہ رہی حتیٰ کہ کم از کم ایک ہزار عورتیں زیادہ سے زیادہ دس ہزار عورتیں زنا سے حاملہ ہوئیں۔ (تذکرۃ الخواص)

اور بعض روایات میں ہے کہ مسجد نبوی میں اس قدر قتلِ عام ہوا کہ خون منبر نبوی سے جاری ہوا اور قبر مطہر بھی خون آلود ہوگئی۔

اس روح فرسا واقعہ میں حضرت علی بن الحسین علیہ السلام اپنے گھر (مدینہ) میں ہی تھے اور آپ نے بہت سے آدمیوں کو اپنے گھر میں پناہ بھی دی تھی۔ واقعہ حرہ کے تین ماہ بعد یزید واصل جہنم ہوا (تذکرہ) تاراجی مدینہ کے بعد یہی ظالم فوج مکہ پر چڑھ دوڑی اور حرم کعبہ کی انہوں نے توہین کا ارادہ کیا۔ ظالم سپہ سالار مسلم بن عقبہ راستہ ہی میں مرگیا اور حصین بن نمیر کو اپنا جانشین مقرر کرگیا انہوں نے منجنیقوں سے کعبہ پر پتھر برسائے اور غلافِ کعبہ کو نذرِ آتش بھی کیا اور وہاں ماہ ربیع الاول میں یزید کی موت کی خبر پہنچ گئی۔ علیہ لعنۃ اللہ پھر عبد الملک کے زمانہ میں دوبارہ حجاج بن یوسف کی زیر سرکردگی بھی بیت اللہ پر سنگ بارانی ہوئی۔ یزید کے بعد اس کا بیٹا معاویہ بن یزید تخت نشین ہوا لیکن اس نے فوراً استعفا دے کر اقتدار سے علیحدگی اختیار کر لی اس لئے کہ وہ اس اقتدار کا مالک اولادِ علی کو سمجھتا تھا اور بنی امیہ اس کے نزدیک غاصبین تھے۔

پس بنی امیہ نے مل جل کر مروان بن الحکم کو تختِ اقتدار پر بٹھا دیا یہ بھی ۳ رمضان ۶۵ھ کو مرگیا (نور المشرقین) مروان کے بعد اس کا بیٹا عبد الملک بن مروان تخت نشین ہوا۔ اس نے اموی عصبیت کے ماتحت عراق میں حجاج بن یوسف جیسے سفاک انسان کو گورنر بنا کر شیعان علی پر ظلم کے جو پہاڑ گرائے کوئی دوسری حکومت اس کی نظیر پیش نہ کرسکی۔

عبد الملک بن مروان کے بعد اس کا بیٹا ولید بن عبد الملک تخت حکومت پر متمکن ہوا۔ اور اسی کے دورِ حکومت میں ۲۵ محرم ۹۵ھ کو حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام نے زہر سے شہادت پائی اور مدینہ کے قبرستان جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

پانچویں امام

حضرت محمدؐ بن علی بن الحسین الباقر علیہ السلام

آپ کی ولادت یکم رجب ۵۷ھ مدینہ منورہ میں ہوئی آپ کی والدہ ماجدہ جناب فاطمہ بنت حسن بن علی علیہم السلام تھیں۔ آپ کی کنیت ابوجعفر ہے۔ آپ پہلے فاطمی ہیں جن کے ماں اور باپ دونو فاطمی تھے۔ تذکرۃ الخواص میں ہے کہ آپ کا لقب باقر یا تو کثرت سجدہ کی وجہ سے ہے یا وسعتِ علمی کی بناء پر اور شاکر دھاوی بھی آپ کے القاب میں سے ہیں۔ آپ سے ابوحنیفہ نے بھی روایات لی ہیں دگو یا وہ بھی آپ کے شاگردوں میں تھے) (تذکرہ)

صحیح قول کے مطابق آپ کی شہادت، ذوالحجہ ۱۱۴ھ ہے جب کہ آپ کی عمر ۵۷ برس اور کچھ ماہ تھی جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ آپ علم وفضل اور زہد وتقویٰ میں اپنے اہلِ زمانہ سے افضل تھے آپ کو ہشام بن عبدالملک کے حکم سے زہر دلوائی گئی۔

آپ نے اپنی زندگی میں بڑے انقلابات دیکھے اور سخت سے سخت مراحل سے گذر کر آپ آگے بڑھے تقریباً آپ کی عمر ساڑھے تین برس تھی جب واقعہ ہائلہ کربلا پیش آیا پھر اپنے تمام کنبہ کے ساتھ حالتِ اسیری میں آپ شام بھی گئے اور وہاں سے رہا ہو کر مدینہ میں آئے۔ آپ کے بچپنے کے زمانہ ہی میں واقعہ حرہ پیش آیا جس میں بہت سے سادات بے خانماں ہو گئے۔ آپ اپنے والد ماجد کے زیر سایہ مدینہ میں ہی رہے۔ حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام کی شہادت کے وقت آپ کی عمر تقریباً ۳۹ برس تھی۔ ولید بن عبدالملک کے بعد آپ نے سلیمان بن عبدالملک کا دور دیکھا پھر عمر بن عبدالعزیز کا زمانہ دیکھا اور اس کے بعد یزید بن عبدالملک کا دور آیا۔ پھر ہشام بن عبدالملک تخت نشین ہوا تو اس نے آپ کو سیاسی اغراض کی بناء پر ایک دفعہ دمشق آنے کی دعوت بھی دی چنانچہ آپ تشریف لے گئے اور بخیریت واپس آئے۔

امام محمد باقر علیہ السلام کے بھائی حضرت زید کو ہشام بن عبدالملک نے شہید کرا کے سولی پر لٹکایا۔ ہشام کی طرف سے کوفہ کا گورنر یوسف بن عمر ثقفی تھا جو بہت ظالم تھا۔ زید کا سر کاٹ کر شام بھیجا گیا اور لاش کو عریاں کر کے کناسۂ کوفہ میں سولی پر لٹکایا گیا اور مروج الذہب مسعودی ج ۲ ص ۱۸۲ کی روایت کے مطابق پورے پچاس مہینے برہنہ لاش سولی پر لٹکی رہی ہشام کے بعد جب ولید بن یزید بن عبدالملک تخت نشین ہوا تو اس نے لاش کو جلا دینے کا حکم دیا۔

مذہب جمہور کی تشکیل و تنظیم

حضرت امام محمد باقر علیہ السّلام کے زمانہ سے پہلے مذہب جمہور اہل سنت کا کوئی ضابطہ نہ تھا اور نہ اُصول و فروع میں ان کا کوئی خاص مسلک تھا بلکہ اقتدار کے ساتھ ساتھ مذہب چلتا رہا اور سیاسی قیادت ہی دینی قیادت پر حکمران رہی۔ اگرچہ واقعہ کربلا واقعہ حرہ اور واقعۂ توہین بیت اللہ نے اُمت اسلامیہ کو بار بار جگایا اور آلِ محمدؐ کی صداقت علم فضل زہد و تقوے نے پُوری اُمت کو اپنی قیادت دینیہ کی طرف متوجہ کیا لیکن ساٹھ سال یا بقولے ایک ہزار ماہ کے طویل عرصہ میں بنی اُمیّہ کے سرکاری احکام اور متشدّدانہ نظام کے ماتحت حضرت علی، ان کی اولاد اور ان کے شیعان پر سب و شتم تنقیص و توہین اور تذلیل و تحقیر بلکہ تکفیر کے مسلسل رویے نے عامۃ المسلمین کے دل آلِ محمدؐ سے متنفر کر دیئے تھے۔ عمر بن عبدالعزیز کے امتناعی حکم سے اتنا بھی غنیمت ہے کہ کسی حد تک شیعان علی پر کئے جانے والے مظالم میں تخفیف ہوگئی اور لوگ حضرت علی اور ان کی اولاد کا نام سن کر برداشت کرنے لگ گئے اور رفتہ رفتہ ان کے محامد و مناقب بھی زبانوں پر آنے شروع ہوگئے

بہر حال بنی اُمیّہ کے دَورِ اقتدار کے بعد حضرت علی یا ان کی اولاد امجاد کے متعلق یہ تو تصوّر ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ ان ہی کو دینی قیادت کا سربراہ تسلیم کیا جائے آئمہ شیعہ کے ساتھ اتنی نرمی ہوئی کہ علانیہ ان پر سب و شتم بند ہوگیا لیکن شیعانِ علی ان کی دینی قیادت کے قائل ہونے کی وجہ سے ویسے کے ویسے معتوب رہے حکومت کی نظروں میں بھی اور جمہور اہل اسلام کی نگاہوں میں بھی۔

بنی اُمیہ کے مسلسل اسلام کش رویے کے پیش نظر جمہور اہل اسلام میں یہ احساس ضرور پیدا ہوا کہ دینی قیادت کا راستہ سیاسی قیادت سے الگ ہے لیکن اب ان کی حالت ایک طویل و عریض جنگل میں راہ گم گشتہ مسافر کی سی ہوگئی کیونکہ ایک طرف اقتدار کی پوجا کے جمہوری تقلیدی رویہ کے ماتحت وہ آلِ محمدؐ کی دینی قیادت کو تسلیم نہیں کرتے تھے اور دوسری طرف اقتدار سے ہر وقت اسلام دشمنی کا دھوأں بلند ہوتا دیکھ کر انہیں دینی قائد کہنا بھی گوارا نہ کرتے تھے پس اس قافلہ کا نہ کوئی سالار تھا نہ پیش رو، جس کا جس طرف کو منہ آیا روانہ ہوا اور چند آدمی اپنے پیچھے لگا لئے اور اُمتِ اسلامیہ ایک شتر بے مہار کی طرح یا راہ گم کردہ مسافر کی طرح اپنی صحیح منزل کے رُخ سے بے خبر ایک عرصہ تک چلتی رہی اور مودودی صاحب نے اُمت کی اس بے کسی و بے بسی کو اپنے ادیبانہ رنگ میں اس طرح بیان کیا ہے۔

> دوسرا حصہ دینی قیادت کا تھا جسے بقایائے صحابہ و تابعین و تبع تابعین۔ فقہاء و محدثین اور صلحائے اُمت نے آگے بڑھ کر سنبھال لیا اور اُمت نے اپنے دین کے معاملہ میں پورے اطمینان کے ساتھ ان کی امامت تسلیم کر لی یہ قیادت اگرچہ منظم نہ تھی اگرچہ اس کا کوئی ایک امام نہ تھا

جیسے سب نے اپنا مرشد مان لیا ہو۔ اگرچہ اس کی کوئی با اختیار کونسل نہ تھی کہ جو دینی مسائل پیدا ہوں ان کے بارے میں بروقت وہ ایک فیصلہ صادر کر دے کہ وہ پوری مملکت میں مان لیا جائے یہ سب لوگ انفرادی حیثیت میں کام کر رہے تھے۔ الخ خلافت و ملوکیت صفحہ ۲۰۲ ، ۲۰۳

آگے چل کر رقمطراز ہیں :۔

امام ابوحنیفہ کے وقت تک کسی نے ان اختلافی مسائل میں جمہور اہل اسلام کے مسلک کی باقاعدہ توضیح نہیں کی تھی جو ایک پورے نظام فکر کی شکل میں مرتب ہوتی بلکہ مختلف فقہاء و محدثین مختلف مواقع پر اپنے اقوال ، فتاوی ، روایات یا طرز عمل سے منتشر طور پر اس کے کسی پہلو کو واضح کرتے رہتے تھے ۔ صفحہ ۲۲

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں ۔

امام ابوحنیفہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے "الفقہ الاکبر" لکھ کر ان مذہبی فرقوں کے مقابلہ میں عقیدۂ اہل سنت والجماعت کو ثبت کیا ۔ صفحہ ۲۳

اس کے مقابلہ میں شیعانِ علی کا مسلک مسلسل ایک دینی قیادت کے ماتحت رہا جس میں کبھی کوئی رخنہ نہیں آیا۔ ابوحنیفہ ۸۰ھ میں پیدا ہوا۔ اس وقت شیعہ مسلک میں امامِ وقت حضرت علی بن الحسین زین العابدین علیہ السلام تھے اور ان کی مذہبی قیادت ان کے سپرد تھی۔ ہر پیش آمدہ مسئلہ میں وہ ان کی طرف رجوع کرتے تھے ۹۵ھ میں آپ کی شہادت ہوئی تو امام محمد باقر علیہ السلام شیعانِ علی کے مسلک کی رو سے قیادتِ دینیہ کے سربراہ تھے اور بقول صاحب تذکرۃ الخواص ابوحنیفہ نے آپ سے بھی حدیث کا درس لیا تھا۔ آپ کے حلقۂ درس میں ہزاروں تشنگانِ علومِ دینیہ اپنی علمی پیاس بجھاتے اور آپ کے علمی بحرِ ذخار سے کسبِ فیض کرتے تھے۔ آپ جب تقریر فرماتے تو علوم و معارف کا دریائے بے کراں منبعِ دہانِ امامت یا سرچشمۂ لسانِ ہدایت سے موجزن معلوم ہوتا تھا جمہور اہل اسلام کا بڑے سے بڑا عالم آپ کے سامنے طفلِ مکتب نظر آتا تھا۔ آپ کا حوزہ علمیہ وہی مسجدِ نبوی تھی جہاں سے پیغمبرؐ کی زبانِ وحی ترجمان سے صحیح اسلام کی تعبیر و قرآن کی تفسیر منظرِ عام پر آکر ظلمت کدۂ عالم کو بقعۂ نور بنانے میں مصروف ہوا کرتی تھی۔ حضرت باقر العلوم نے علوم نبویہ اور معارف ربانیہ کی تعلیم و ترویج سے جہاں مسلمانانِ عالم کو اپنا فیضِ عام پہنچایا وہاں شیعانِ آلِ محمد کو مذہب کے اصول و فروع کی کافی تفصیلات سے آگاہ فرمایا۔

ابوحنیفہ کی تشکیل مذہبِ جمہور کے متعلق مودودی صاحب لکھتے ہیں ۔

جس فتنے کے زمانے میں امام نے عقیدۂ اہل سنت کی یہ وضاحت پیش کی تھی اُس کی تاریخ کو نگاہ میں رکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ان کا بڑا کارنامہ تھا جس سے اُنہوں نے امت کو راہ اعتدال پر قائم رکھنے کی سعی بلیغ فرمائی تھی ۔اس عقیدے کے معنے یہ تھے کہ امت اس ابتدائی اسلامی معاشرے پر پورا اعتماد رکھتی ہے جو نبیؐ نے قائم کیا تھا اس معاشرے کے لوگوں نے جو فیصلے بالاتفاق یا اکثریت کے ساتھ کئے تھے اُمت ان کو تسلیم کرتی ہے جن اصحاب کو انہوں نے یکے بعد دیگرے خلیفہ منتخب کیا تھا اُن کی خلافت کو بھی اور ان کے زمانے کے فیصلوں کو بھی وہ آئینی حیثیت سے درست مانتی ہے اور شریعت کے اس پورے علم کو بھی وہ قبول کرتی ہے جو اس معاشرے کے افراد (یعنی صحابہ کرام) کے ذریعے سے بعد کی نسلوں کو ملا ہے ۔ یہ عقیدہ اگرچہ امام ابوحنیفہ کا اپنا ایجاد کردہ نہ تھا بلکہ اُمت کا سواد اعظم اس وقت یہی عقیدہ رکھتا تھا مگر امام نے اسے تحریری شکل میں مرتب کر کے ایک بڑی خدمت انجام دی کیونکہ اس سے عام مسلمانوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ منتفرق گروہوں کے مقابلہ میں ان کا امتیازی مسلک کیا ہے ۔" ص ۲۳۶ ۔

چھٹے امام

حضرت جعفر بن محمد الصادق علیہ السّلام

آپ کی ولادت ۷، اربیع الاول ۸۳ھ مدینہ منورہ میں ہوئی آپ کی کنیت ابوعبداللہ ہے ۔آپ کی والدہ ماجدہ اُم فروہ بنت قاسم بن مُحمّدؐ بن ابی بکر تھی ۔آپ سن و سال میں ابوحنیفہ سے اڑھائی تین برس چھوٹے تھے ۔

آپ کا زمانہ دینی و سیاسی ہر دو لحاظ سے انقلابات کی آماجگاہ تھا ۔ہشام بن عبدالملک کی دعوت پر جب آپ کے والد امام محمّدؐ باقر علیہ السّلام دمشق تشریف لے گئے تو آپ ان کے ہمراہ تھے ۔ ہشام بن عبدالملک کے بعد اس کا بھتیجا ولید بن یزید بن عبدالملک تخت نشین ہوا اور اس کے بعد مروان الحمار وارثِ تخت ہوا اور یہ شخص بنی اُمیہ کا آخری تاجدار تھا ۔

بنوالعباس کی تحریک ہشام کے زمانہ ہی سے چل رہی تھی اور بنو اُمیہ کے مظالم لوگوں کو بنوالعباس کی تحریکِ انقلاب کے ساتھ متفق ہونے کی دعوت دے رہے تھے اور لوگ دن بدن بنو اُمیہ سے متنفر ہو کر بنوالعباس کے حامی ہوتے جا رہے تھے اور آخر کار بنو اُمیہ کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا ۔

بنو عباس کی تحریک کی کامیابی کا راز آلِ محمد کی مظلومیت کی داستانیں تھیں اور انہی کی نیابت کا دعویٰ کر کے عوام سے ہمدردیاں حاصل کی گئی تھیں۔

ربیع الاول ١٣٢ھ میں جب ابو العباس سفاح کے ہاتھ پر کوفہ میں خلافت کی بیعت ہوئی، تو اس کے چچا داؤد بن علی نے اپنی تقریر میں اس امر کا اظہار بھی کیا چنانچہ مودودی صاحب لکھتے ہیں۔

ہم اس لئے نہیں نکلے ہیں کہ اپنے لئے سیم و زر جمع کریں یا محلات بنوائیں اور ان میں نہریں کھود کر لائیں بلکہ ہمیں جس چیز نے نکالا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارا حق چھین لیا گیا تھا اور ہمارے بنی عم (آل ابیطالب) پر ظلم کیا جا رہا تھا اور بنی اُمیہ تمہارے درمیان بُرے طریقے سے چل رہے تھے انہوں نے تم کو ذلیل و خوار کر رکھا تھا۔ الخ۔ صد ١٩٢۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے زمانہ میں علوم و معارف کا بحر موجزن اور عزم و استقلال کا پہاڑ تھے۔ آپ کا حلقہ درس بہت وسیع تھا۔ اطرافِ مملکتِ اسلامیہ سے تشنگانِ علوم کھچ کھچ کر آتے تھے اور چشمہ فیض سے سیراب ہو کر اپنے اپنے وطن کو پلٹتے تھے۔ تقریبًا چار ہزار یا اس سے کچھ زیادہ تعداد ہے ان فقہا و محدثین کی جو حوزۂ علمیہ میں شریک درس ہو کر آپ کے شجرۂ علم سے خوشہ چینی کر کے اور خوانِ معرفت سے ریزہ چینی کر کے آنے والی نسلوں کے لئے منبع فیض بن کر پلٹے۔

آپ نے سفیان ثوری سے فرمایا۔ اگر نعمت کی بقا چاہتے ہو تو شکرِ پروردگار ادا کرو کیونکہ خدا فرماتا ہے لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ اگر رزق میں وسعت چاہتے ہو تو استغفار کرو۔ اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ الخ اور اگر سلطان جائر کا خوف ہو تو لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ پڑھا کرو۔

حلیۃ الاولیاء سے منقول ہے آپ نے اپنی بعض اولاد کو وصیّت فرمائی۔

(١) جو اپنے تقسیم شدہ رزق پر قناعت کرے گا وہ مستغنی رہے گا۔

(٢) جو غیر کے مال پر للچائی ہوئی نظر ڈالے گا وہ فقیر مرے گا۔

(٣) جو اللہ کی تقسیم پر راضی نہ ہوا گویا قضا و قدر میں اللہ پر اس کا گمان اچھا نہیں۔

(٤) جو اپنی غلطیوں کو حقیر سمجھے وہ بڑی سے بڑی غلطیوں کا مرتکب ہوتا ہے۔

(٥) جو دوسروں کے عیوب کی پردہ دری کرے اس کے اپنے عیوب کی پردہ دری ہوتی ہے۔

(٦) جو لبغاوت کی تلوار اٹھائے وہ اسی ہی تلوار سے خود قتل ہوتا ہے۔

(٧) جو اپنے مومن بھائی کے لئے کنواں کھودے وہ پہلے خود ہی اس میں گرتا ہے۔

(٨) جو جاہلوں کے ساتھ میل ملاپ رکھتا ہے وہ جلدی ذلیل ہوتا ہے۔

(۹) جس کا علماء سے میل جول ہو وہ عزت پاتا ہے۔

(۱۰) جو بُرے معاشرہ میں قدم رکھتا ہے وہ جلد متہم ہوتا ہے۔

(۱۱) حق بات کہو خواہ تلخ ہی ہو اور اس میں تمہارے لئے ذاتی فائدہ ہو یا نقصان۔

(۱۲) چغل خوری سے بچو کیونکہ یہ لوگوں کے دلوں میں بغض کا بیج بوتی ہے۔

(۱۳) سخاوت کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو۔

(تذکرۃ الاولیا علامہ سبط ابن جوزی)

آپ کا زمانہ بنو اُمیہ کے زوال اور بنو العباس کے عروج کا زمانہ تھا بنو اُمیہ کے آخری تاجدار بنو العباس سے ترساں و ہراساں رہے اور اُن کے خطرہ کو اپنے سر سے ٹالنے کی تدابیر میں مصروف رہے اس لئے حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام کی آزادانہ مذہبی تبلیغ و ترویج میں خلل انداز نہ ہو سکے پس نہ در پے ایذاء ہونے کا ان کو وقت ملا اور نہ آپ کی اشاعتِ مذہب پر پابندی عائد کرنا اُن کے بس میں رہا۔ کیونکہ ایسا کرنے سے عباسیوں کی تحریک میں مزید تقویت پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ پس آپ نے علومِ آلِ محمد کو خوب نشر کیا اور دین اسلام کی قیادت کی ذمہ داری جو آپ کے سپرد تھی اُسے خوب نبھایا اور حضرت رسالتمآب صلعم نے اسلام کو جن خطوط پر پیش کیا تھا اور نا اہل قیادت کی وجہ سے وہ دھندلا چکے تھے آپ نے اُنہی خطوط کو اجاگر کیا اور سلاطینِ وقت کی ہر دَور کی بدعات کا پردہ چاک کیا جس کو جمہور اہل اسلام نے مذہب کا حصہ سمجھ رکھا تھا۔ اور علانیہ طور پر حکومت کے دخل و اثر سے بے نیاز ہو کر چونکہ آپ ہی نے اُصول و فروع مذہب کی تفصیلات کو منظرِ عام پر پیش کیا اس لئے شیعانِ آلِ محمد صلعم کے مسلک کو جعفری اور ملت کو ملتِ جعفریہ امامیہ کہا جاتا ہے۔

اس کے مقابلے میں جمہور اہلِ اسلام کا مسلک بھی اس وقت تک سلاطین دور کی مسلسل سرپرستی میں تربیت پاتا رہا اور صحابہ و تابعین و تبع تابعین خواہشاتِ اقتدار کے خلاف زبان کھولنے کو چونکہ موت کا پیغام سمجھتے تھے اس لئے ان کی ہاں میں ہاں ملانا ہی ان کا مذہب تھا اور ہر ایک کو اچھا کہنا ہر ایک کا احترام کرنا اور کسی صحابی و تابعی کے کسی فعل یا قول پر تنقید نہ کرنا حتیٰ کہ ان سے صادر ہونے والے فعل حرام تک کو حرام کہنے کی جُرأت نہ کرنا اُن کی بغاوت کو بغاوت نہ کہنا دو گروہ لڑ پڑیں تو ایک کو حق ماننے کے باوجود دوسرے کو جہنمی نہ کہنا اور دونو پر حسن ظن رکھنا اور دونو کی برابر عزت کرنا وغیرہ منافیٔ عقل و دین باتیں ان کا مذہب بن چکی تھیں اور یہی عقیدہ ان کو راسخ کرایا گیا تھا اور اسی کو وہ حقیقی اسلام سمجھتے تھے بلکہ حضرت رسالت مآب تک اس مطلب کی حدیثیں بنا کر منسوب کر دی تھیں جو حضورؐ کی ذات پر افترا محض تھیں کیونکہ دینِ خدا میں متضاد اُمور کے عقیدہ کی کوئی گنجائش نہیں بلکہ وہ حق کو حق اور باطل کو علانیہ باطل کہتا ہے

دو میں سے جو سچا ہے اس کو سچا اور جھوٹے کو جھوٹا کہتا ہے اور یہی اس کی تعلیم ہے" جھوٹے اور سچے کو نیز حق اور باطل کو برابر قابلِ احترام سمجھو اور کسی صحابی پر تنقید نہ کرو، اقتدار کے بنائے ہوئے اُصول تھے، جو نبی علیہ السلام تک منسوب کئے گئے۔

بنی اُمیہ کے جور و ستم اور اسلام دشمنی کے اَن گنت آثار اور شعائر اللہ کی اعلانیہ توہین کے واقعات نے اگرچہ اہل اسلام کو جھنجھوڑ کر جگایا اور انہیں دینی و سیاسی قیادت کے راستوں میں امتیاز پیدا کرنے کی دعوت دی لیکن بنو اُمیہ کی سر پر چمکنے والی تلواروں نے کسی کو اس دعوتِ فکر پر کان دھرنے کی مہلت نہ دی بس ایک شیعانِ علی ہی تھے جنہوں نے پہلے دن سے قیادتِ دینیہ سے وابستگی کے صلہ میں جورِ مسلسل اور ظلمِ پیہم کا مقابلہ کرتے ہوئے سیاست کو مذہب نہ بنانے کا عہد کر رکھا تھا اور دامنِ امامت سے وابستہ چلے آ رہے تھے۔

جمہور اہلِ اسلام کے دلوں پر بنی اُمیہ کی حکومت کے طویل و عریض عرصہ میں حضرت علی و آلِ علی و شیعانِ علی پر ہونے والے سب و شتم کی وجہ سے شیعانِ علی سے حسد و کدورت کا زنگ تو بیٹھ ہی چکا تھا وہ آئمہ آلِ محمدؐ کو علم و فضل اور کردار و افعال میں اگرچہ یکتائے روزگار تسلیم کرتے تھے لیکن سابق آبائی تقلید کے پیشِ نظر ان کی دینی قیادت تسلیم کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے۔

نیز بنی اُمیہ کے مسلسل مظالم اور اسلام دشمن پالیسی کی بدولت وہ الگ دینی قیادت کی تلاش میں تھے جو آلِ محمدؐ کی سربراہی میں نہ ہو تاکہ شیعانِ علی کے متعلق اموی دَور کے ہوش ربا و حیا سوز بے حقیقت پروپیگنڈہ کی زد سے بچ جائیں اب جونہی عباسی تحریک کے زور پکڑنے سے اموی حکومت کی چولیں ڈھیلی ہوئیں اور فقہائے جمہور اہلِ اسلام کی زبانوں سے قفل کھلے نیز اظہارِ خیالات کے لئے آزادی کا وقفہ ملا تو جمہور اہل اسلام کے لئے شیعانِ علی کے مسلک کے مقابلہ میں دینی قیادت کی تشکیل کرتے ہوئے الگ مذہب کی طرح ڈالی گئی اور یہ کام حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے ہی زمانہ میں حضرت ابو حنیفہ نے انجام دیا اس نے نہایت ہی محتاط اندازہ سے خلافت کے متعلق اپنے عقیدے کی وضاحت کی اور سابق جمہوری عقائد منتشرہ کو یکجا کر کے خوب لیپ پوت کی راہیں ہموار کیں اور صحابہ و تابعین کی غلط کاریوں پر پردہ ڈالنا اور لیپ پوت سے ان کے احترام کو باقی رکھنے کی کوشش کرنا خواہ اس میں اجتماع ضدین کو بھی برداشت کرنا پڑے شعارِ مذہب قرار دیا اور شیعانِ علی سے نفرت اور ان کی بات تک نہ سننا مذہب و صحابہ کی محبت کا تقاضا قرار دیا گیا اور بعد میں آنے والے فقہا نے عزاداری کو بھی اس وجہ سے حرام کہہ دیا کہ اس سے یزید اور اس کے باپ اور باقی اکابر صحابہ کے متعلق بدظنی پیدا ہوتی ہے اور یزید پر باوجود اس کو

برا کہنے اور سمجھنے کے لعنت کرنا ممنوع قرار دے دیا تاکہ یہ لعنت اُوپر نہ چلی جائے جیساکہ مودودی صاحب نے بعض علمائے اہل سنت کے امتناعی قول کی وجہ بیان کی ہے صـ۱۸۳ سچ ہے (چور کی ڈاڑھی میں تنکا۔) اور چونکہ حضرت ابوحنیفہ نے ہی مذہب جمہور کی داغ بیل ڈالی تھی اس لئے مذہب بھی ان ہی کی طرف منسوب ہوا اور وہ حنفی کہلانے لگے۔

پس یہ زمانہ جس طرح سیاسی انقلاب میں ایک بڑی اہمیت کا حامل تھا اسی طرح مذہبی سرگرمیوں کے لحاظ سے بھی اسے بہت اہمیت حاصل ہے بنی اُمیہ کو اپنے اقتدار کے بچانے کی فکر تھی اور بنو عباس کو اس کے حاصل کرنے کا طمع تھا اور جب انقلاب آچکا تو بنی عباس کو اس کے مضبوط کرنے کی ضرورت تھی۔ پس اس زمانہ میں کتب تفسیر وحدیث وتاریخ کی تدوین بھی شروع ہوئی اور فقہی مسائل کی نشر واشاعت بھی دل کھول کر کی گئی اور لوگوں نے آزادانہ طور پر مذہبیات میں حصہ لیا۔

ابوالعباس سفاح کے بعد منصور عباسی ۱۳۶ھ میں تخت نشین ہوا جسے دوانیقی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اور یہ ۱۵۸ھ تک حکمران رہا ابتدائی دورِ حکومت میں بنو العباس کے سلاطین اپنی طبائع پر زور دے کر فقہائے اسلام کے فیصلوں کو سہہ لیتے تھے اگرچہ ان کے مزاج سے متصادم ہی ہوتے تھے کیونکہ ایک طرف انہوں نے بنی اُمیہ کا قلع قمع کرنا تھا اور ان کے معتقدین کو نیست ونابود کرنا ان کے لئے ضروری تھا اور دوسری طرف ہر طرف سے سر اٹھانے والی بغاوتوں کو دبانا اقتدار کی بحالی ومضبوطی کے لئے ان کے فرائض میں سے تھا اس لئے علماء وفقہا کی کھری کھری باتوں کو وہ خندہ پیشانی سے یا طبیعت پر زور دے کر برداشت کرنے کی کوشش کرتے تھے تاکہ ان کے خلاف یہ ایک نیا فتنہ نہ کھڑا ہو جائے۔

حلیۃ الابو نعیم میں ہے ایک مرتبہ ابوجعفر منصور دوانیقی کے منہ پر مکھی بیٹھی وہ اُسے بار بار اٹھاتا تھا اور وہ بار بار واپس آجاتی تھی آخر کار تنگ آکر امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس نے پوچھا کہ "خدا نے مکھی کو کیوں پیدا کیا ہے؟" آپ نے فرمایا "جبار لوگوں کے تکبر کو توڑنے کے لئے" یہ سن کر وہ بہت شرمندہ ہوا لیکن غصہ کو ضبط کر کے چپ ہو گیا۔ (تذکرۃ الخواص)

جب عباسیوں کے خلاف اٹھنے والی بغاوتیں فرو ہو گئیں اور ان کا اقتدار پوری طرح قائم ہو گیا تو انہوں نے ظلم واستبداد میں بنو اُمیہ سے بھی قدم بڑھا کر رکھا اور شیعانِ علی کو پھر انہوں نے ظلم کی زنجیروں میں جکڑنا شروع کیا اور سادات علویہ کی دشمنی ان کے دلوں میں گھر کر گئی انہی کے پر آشوب دور میں سادات نے رفتہ رفتہ مدینہ کو چھوڑ کر جنگلوں کی خاک چھاننا شروع کی اور دُور دراز کے سفر طے

کر کے ترکستان ایران اور ہندوستان وغیرہ ممالک میں منتشر ہوتے گئے حتی کہ آج دنیائے اسلام میں
کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں سادات آباد نہ ہوں۔

منصور دوانیقی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ شیعانِ علی کی دینی قیادت کی سربراہ حضرت امام جعفر صادق
علیہ السلام کی ذات گرامی ہے اور وہ ان سے کسی حد تک خوفزدہ بھی رہتا تھا کہ کہیں ان کا اجتماع بڑھتے
بڑھتے خروج تک نوبت نہ پہنچ جائے اور کئی دفعہ اس نے آپ کو اپنے پاس بلا کر قتل کی دھمکیاں بھی دیں
لیکن جرأت نہ کر سکا۔ آخر کار مدینہ کے عامل کے ذریعے سے زہر دلوا کر آپ کو شہید کر کے رہا۔ آپ کی
تاریخ شہادت ۱۵ شوال ۱۴۸ھ ہے۔ آپ جنت البقیع میں اپنے باپ دادا کے پہلو میں دفن
ہوئے۔ ان کے دو برس بعد ۱۵۰ھ میں ابو حنیفہ کی وفات ہوئی۔ (ص ۲۲۴ خلافت و ملوکیت)

ساتویں امام

حضرت موسیٰ بن جعفر الکاظم علیہ السلام

آپ کا نام موسیٰ لقب کاظم اور کنیت ابو الحسن ہے آپ مدینہ منورہ میں ۷ صفر ۱۲۸ھ کو
پیدا ہوئے اپنے والد ماجد حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی شہادت کے وقت آپ بیس برس
کے نوجوان تھے آپ کی والدہ ماجدہ حمیدہ خاتون بربریا بقولے اندلس کے رہنے والی تھیں۔

آپ کی پیدائش اموی دورِ حکومت میں ہوئی پھر بچپنے کا کچھ زمانہ ابو العباس سفاح کی حکومت
میں گذارا۔ جب منصور بادشاہ ہوا تو آپ کی عمر آٹھ برس تھی اور جب مہدی عباسی تخت نشین ہوا تو آپ
کا سن مبارک تیس برس کا تھا۔ مہدی آپ کو بغداد لے گیا اور وہیں کچھ عرصہ آپ اس کی قید میں رہے
اور پھر اس نے رہا کر کے واپس مدینے بھیج دیا اس کے بعد ہادی عباسی نے حکومت کی پھر ہارون بادشاہ
ہوا تو حج کے سفر میں مدینہ میں پہنچا۔

حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام قبر رسول اللہ پر موجود تھے کہ ہارون نے حضور پاک کی قبر کو خطاب
کر کے سلام دیا اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا ابْنَ الْعَمِّ۔ اے میرے چچا کے بیٹے آپ پر میرا سلام ہو۔
یا رسول اللہ کہہ کر سلام نہ کہا تاکہ رعایا پر اپنی قرابت کو ظاہر کر کے فخر کرے) حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام
نے اس کے تکبر و نخوت کو توڑتے ہوئے قبر مبارک کی طرف متوجہ ہو کر اس طرح سلام دیا۔ اَلسَّلَامُ
عَلَيْكَ يَا اَبَتَاهُ۔ اے والد گرامی میرا تجھ پر سلام ہو۔ یہ سنتے ہی ہارون کے مکر و فریب کا دامن چاک

ہو گیا اور شرمندگی سے اس کا منہ بدرنگ ہو گیا ظاہراً کہنے لگا "خدا کی قسم اے ابوالحسن واقعی یہ فخر و شرف آپ کے لئے ہی ہے" لیکن دل ہی دل میں غصہ سے جل بھن گیا پس آپ کو اپنے ہمراہ بغداد لے گیا اور سنہ ۱۷۹ھ سے سنہ ۱۸۳ھ تک آپ کو زندان میں رکھا اور اسی حالت میں ماہ رجب میں آپ کی رحلت ہوئی۔ (تذکرۃ الخواص)

اس لحاظ سے آپ کی عمر شریف ساٹھ برس بنتی ہے۔ بعض مورخین نے ۲۵ رجب سنہ ۱۸۳ھ تاریخ شہادت لکھی ہے اور اس لحاظ سے آپ کی عمر شریف ۵۵ برس ہوتی ہے۔ بعضوں نے ۵۴، ۵۷، ۵۸ برس کا قول بھی کیا ہے (تذکرۃ الخواص) علم و فضل زہد و تقوے اور دیگر صفاتِ نفسیہ و ذاتیہ میں آپ یکتائے زمانہ تھے اپنے باپ کے بعد شیعانِ علی کے آپ ساتویں نامزد امام تھے آپ بغداد کے قبرستان میں دفن ہوئے جسے آج کل کاظمین کہتے ہیں۔ آپ کو باب الحوائج کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

آٹھویں امام

حضرت علی بن موسیٰ الرضا علیہ السّلام

آپ کی ولادت ۱۱ ذوالقعدہ سنہ ۱۴۸ھ مدینہ منورہ میں ہوئی آپ کی والدہ ماجدہ کا نام نامی نجمہ لقب خیزران اور کنیت ام البنین تھی۔ بقول واقدی آپ تقریباً بیس برس کی عمر میں مسجد رسول اللہ میں بیٹھ کر فتویٰ دیا کرتے تھے۔

آپ نے منصور، مہدی، ہادی اور ہارون و امین و مامون کے دورِ حکومت دیکھے مامون نے آپ کو مدینہ سے خراسان بلوایا راستہ میں جب آپ نیشاپور پہنچے تو وہاں کے علماء و فضلا نے آپ کا شاندار استقبال کیا اور آپ سے بہت سی احادیث حاصل کیں ان میں ایک حدیث سلسلۃ الذہب کے نام سے مشہور ہے جس میں آپ نے اپنے آبائے طاہرین علیہم السلام کی سند سے جناب رسول اللہ کا فرمان سنایا کہ حدیث قدسی میں اللہ فرماتا ہے "کلمہ لا الٰہ الا اللہ" میرا قلعہ ہے جو شخص میرے اس قلعہ میں وہ میرے عذاب سے محفوظ ہوگا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کلمہ توحید پڑھنے والے کے لئے جنت ہے اور امان ہے دوزخ سے لیکن اس کی کچھ شرطیں بھی ہیں وَاَنَا مِنْ شُرُوْطِہَا اور ان میں سے ایک شرط میں ہوں یعنی آل محمد کی اطاعت و محبت اور انہی کو اپنا دینی قائد مان کر ان کی ہدایات کی روشنی میں اسلامی خطوط پر چلنا ہی لا الہ الا اللہ کے اقرار کا حقیقی مفہوم ہے۔ نیشاپور میں چند روزہ قیام کے بعد آپ مرو تشریف لے گئے جہاں مامون فروکش تھا اور مامون نے آپ کو اپنا ولیعہد

مقرر کیا و اطرافِ مملکت میں بھی امام علی رضا علیہ السّلام کی ولیعہدی کی اطلاعات بھیج دیں حتیٰ کہ سرکاری سکہ پر بھی آپ کے نام کی مہر لگوائی لیکن اس سے عباسی خاندان کے لوگ بگڑ گئے اور بغاوتوں تک نوبت پہنچ گئی۔

۲۰۳ھ میں امام کو انگوروں میں زہر دیا گیا جس سے آپ کی شہادت واقع ہوئی۔ آپ کی تاریخ شہادت بنا بر مشہور ۲۳ ذوالقعدہ ۲۰۳ھ ہے اور بعض کے نزدیک ۱۶ صفر ہے۔ آپ کی عمر شریف تقریباً ۵۵ برس تھی۔ آپ کا مدفن طوس ہے جسے آج کل مشہد کہا جاتا ہے۔

نویں امام

حضرت محمدؐ بن علی التقی علیہ السّلام

آپ کی ولادت باسعادت ۱۰ رجب ۱۹۵ھ کو مدینہ منورہ میں ہوئی۔ آپ کی کنیت ابوجعفر اور لقب تقی و جواد زیادہ مشہور ہیں۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا نام نامی بقول صاحبِ تذکرہ سکینہ تھا۔ جب حضرت امام علی رضا علیہ السّلام شہید ہوئے تو آپ کی عمر تقریباً ۸ برس تھی۔

مامون آپ کے کمالاتِ ظاہرہ وصفاتِ باہرہ کی بنا پر آپ کا گرویدہ تھا حتیٰ کہ اپنی بیٹی ام الفضل کا رشتہ آپ سے کر دیا۔ عباسیوں کو اس پر بہت غصّہ آیا چنانچہ انہوں نے اپنے مفتیٔ زماں اور قاضیٔ دوراں یحییٰ بن اکثم (جو اس وقت حکومت اسلامیہ میں چیف جسٹس کے عہدہ پر فائز تھا) کو علمی مسائل میں آپ کا امتحان لینے پر مجبور کیا تاکہ لاجواب ہونے پر امام کی سبکی ہو اور مامون کی نظروں میں اس کا بڑھتا ہوا وقار ختم ہو چنانچہ دربار شاہی میں بر سر عام یحییٰ بن اکثم نے آپ کو چھیڑا۔ اُسے نہیں معلوم تھا کہ یہ حجتِ خدا ہیں اور خاندانِ رسالت اور دودمانِ نبوّت کے چشم و چراغ علومِ دینیہ میں لوگوں کے لئے مشعل راہ ہوا کرتے ہیں اور خطیب منبر سلونی کے وارث اُمّتِ نبویہ کے لئے علُومِ پروردگار کے نبوی محل کا دروازہ ہوا کرتے ہیں پس آپ نے اسے سوال وجواب میں مبہوت و ششدر کر دیا اور حاضرین کے دلوں میں بالخصوص مامون کے دل میں آپ کی قدر و منزلت پہلے سے بھی بڑھ گئی اور واقعہ کی تفصیل ہم نے اپنی تفسیر انوار النجف کی جلد ۸ صفحہ ۱۶۹ تا صفحہ ۱۷۲ بیان کی ہے۔

بغداد میں ایک مرتبہ مامون کا گذر ہوا تو راستہ میں بچے کھیل رہے تھے شاہی سواری کو ادھر آتا ہوا دیکھ کر سب بچے دوڑ گئے لیکن امام عالی مقام نے اپنے مقام کو نہ چھوڑا قریب پہنچ کر شاہی سواری رک گئی اور مامون نے سوال کیا۔ اے شہزادے۔ باقی سب بچے راستہ چھوڑ کر دور ہٹ گئے ہیں

لیکن کیا وجہ ہے کہ آپ کھڑے رہے ہیں؟ تو آپ نے نہایت متانت سے جواب دیا راستہ تنگ نہیں تھا تاکہ میرے ہٹ جانے سے کشادہ ہوتا اور مجرم میں نہیں تھا کہ ڈر کے مارے کہیں بھاگ جانے کی کوشش کرتا۔ مامون نے اپنی مٹھی کی طرف اشارہ کر کے کہا بتاؤ اس میں کیا چیز ہے؟ آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا خدا نے اپنی قدرت سے فضائے بسیط میں بحر پیدا کئے ہیں جب بادشاہ اپنے بازوں کو شکار کے لئے چھوڑتے ہیں تو وہ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں پکڑ لاتے ہیں اور بادشاہ انہیں مٹھی میں بند کر کے اولادِ انبیاء کا امتحان لیتے ہیں یہ سن کر مامون کہنے لگا واقعی آپ امام علی رضا کے فرزند ہیں۔

آپ شیعانِ علی کے نویں امام ہیں جب مامون کے بعد معتصم ۲۱۸ھ میں تخت نشین ہوا تو اس نے اس امام کو عین عالمِ شباب میں (۲۵ برس کی عمر میں) زہر دے کر شہید کر دیا۔ آپ کی تاریخ شہادت ۲۹ ذوالقعدہ ۲۲۰ھ ہے اپنے جدِ پاک امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے پہلو میں کاظمین میں دفن کئے گئے۔

دسویں امام

حضرت علی بن محمدؐ النقی علیہ السلام

آپ کی ولادت ۵ رجب ۲۱۴ھ مدینہ منورہ میں ہوئی ۶ برس کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا آپ کی والدہ ماجدہ کا نام نامی سمانہ تھا آپ کی کنیت ابوالحسن اور لقب نقی و ہادی زیادہ مشہور ہیں علم فضل زہد و تقویٰ کے علاوہ تمام صفاتِ فاضلہ میں اپنے اہل زمان سے فوقیت رکھتے تھے اور اپنے والد بزرگوار کے بعد شیعان علی کا مرجع دینی تھے۔

جب متوکل عباسی نے آپ کو مدینہ سے بغداد طلب کیا تو اہلِ مدینہ آپ کے فراق میں بہت روئے انہیں آپ پر عباسی حکومت کے تشدد کا خطرہ تھا یحییٰ بن ہرثمہ آپ کو بلانے آیا تھا اس نے آپ کے گھر کی پوری تلاشی لی سوائے قرآن مجید اور کتب علمیہ کے اور کچھ نہ پایا آپ پہلے بغداد پہنچے پھر سامرہ میں آپ کو لے جایا گیا کیونکہ متوکل کا قیام وہاں تھا یحییٰ بن ہرثمہ کی رپورٹ پر متوکل نے آپ کی عزت کی سامرہ میں رہ کر آپ نے متعدد واقعات میں مسائل مشکلہ میں متوکل اور درباری علماء کی رہنمائی فرمائی جس سے آپ کا ان پر علمی رعب طاری ہو گیا۔

ایک دن متوکل نے آپ سے خواہش کی کہ کچھ اشعار سنائیں آپ نے معذرت پیش کی لیکن اس نے اصرار کیا تو آپ نے چند اشعار پڑھے جن میں حکومتی تکبر و رعونت کے بعد حکمرانوں کے انجام

قبر و برزخ کا تذکرہ تھا۔ اشعار سن کر متوکل اس قدر رویا کہ اس کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی پس آپ کو چار ہزار دینار دے کر عزت و جلال کے ساتھ اس نے رخصت کیا۔

آپ کو معتز عباسی نے زہر سے شہید کیا آپ کی تاریخ شہادت ۳ رجب ۲۵۴ھ ہے۔ آپ کی عمر شریف چالیس برس تھی۔ آپ سامرہ میں دفن ہوئے آپ کا ایک فرزند سید محمد ہے جن کا روضہ بغداد و سامرا کے درمیان سڑک کے قریب واقع ہے۔

گیارہویں امام

حضرت امام حسن بن علی العسکری علیہ السّلام

آپ کی ولادت ۱۰ ربیع الثانی ۲۳۱ھ کو سامرہ میں ہوئی ان کی والدہ ماجدہ کا نام نامی سوسن تھا جو ایک کنیز تھیں آپ علم فضل زہد و تقویٰ اور جملہ صفات فاضلہ میں اپنے پدر عالی قدر کے وارث تھے اپنے والد کی شہادت کے وقت آپ کی عمر ۲۳ برس تھی آپ کا لقب عسکری ہے معتمد عباسی کے حکم سے آپ کو زہر دیا گیا اور آپ کی شہادت ۸ ربیع الاوّل ۲۶۰ھ میں ہوئی جب کہ آپ کی عمر ۲۹ برس تھی۔

بارھویں امام

حضرت ابوالقاسم حجۃ بن الحسن المہدی علیہ السّلام

آپ کی ولادت باسعادت ۱۵ شعبان ۲۵۶ھ کو ہوئی۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا اسم گرامی حضرت نرجس خاتون ہے جو روم کے شاہی خاندان سے حضرت شمعون وصی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسل سے تھیں۔ ان کی حضرت امام حسن عسکری علیہ السّلام سے شادی کا مفصل واقع کتب تاریخ میں درج ہے آپ اپنے والد ماجد کی شہادت کے بعد غائب ہوئے اور نواب اربعہ کی یکے بعد دیگرے وساطت سے آپ کا اپنے شیعوں کے ساتھ رابطہ قائم رہا لیکن ۳۲۹ھ ۱۵ شعبان کے بعد سے نیابت خصوصی کا سلسلہ ختم ہو گیا اور غیبت کبریٰ شروع ہوئی۔ جب اللہ چاہے گا تو حضرت مہدی علیہ السّلام تشریف لائیں گے اور دنیا جس طرح ظلم و جور سے پر ہو چکی ہو گی وہ عدل و انصاف سے اُسے پر کر دیں گے۔

مسلمانوں میں حضرت مہدی کی آمد اور حضرت عیسیٰ کی رجعت کا عقیدہ مسلمات میں سے ہے فرق صرف اس میں ہے کہ وہ پیدا ہو چکے ہیں یا پیدا ہوں گے۔ شیعانِ علی کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ پیدا ہو چکے ہیں اور غائب ہیں جب حکم خدا ہوگا غیبت کا پردہ چاک ہوگا اور وہ اپنے مخصوص انداز میں ظاہر ہو کر ظلمت کدۂ عالم کو بقعۂ نور بنائیں گے اور بعض اہل سنت علماء بھی ان کی ۱۵ شعبان ۲۵۶ھ کی ولادت کے قائل ہیں۔

شیعان علی کے عقیدہ کی رو سے وہ خود غائب ہیں اور ان کی غیبت میں علمائے اعلام و مجتہدین عظام ان کی نیابت کا فریضہ ادا کرتے ہوئے عوام میں روشنی کا مینار ہیں اور زمان غیبت میں قیادت دینیہ انہی کے سپرد ہے۔ جب ان کا ظہور ہوگا تو قیادتِ دینیہ اور سیاست ملکیہ دونوں کے سربراہ وہ خود ہوں گے۔ عجل اللہ فرجہ۔

شیعہ مکتب فکر

دور اموی کی شیعہ کش پالیسی کے ماتحت شیعہ مکتب فکر کے متعلق عوام کو ایسی غلط فہمیوں میں مبتلا کیا گیا تھا اور ان کے متعلق سرکاری طور پر ایسے زہریلے پروپیگنڈے کئے گئے تھے کہ ان کی وجہ سے عامۃ المسلمین کی نظروں میں شیعان علی کا مسلک کفر و زندقہ کے مترادف تھا اور حکومتی پالیسی کا تقاضا یہ تھا کہ اسلام صرف اس جمہوری طرز عمل کو قرار دیا جائے جس پر پیغمبر کے بعد سے سلاطین اسلام عمل پیرا ہیں اور انہی کی قیادت کو اسلامی و دینی قیادت قرار دیتے ہوئے اس کے خلاف سوچنے یا کرنے والوں کو دائرہِ اسلام سے خارج تصور کیا جائے اور اسی پالیسی کے ماتحت پہلی تینوں حکومتوں میں حضرت علی بلکہ جملہ بنی ہاشم کو بڑے عہدے تو درکنار کسی معمولی سے معمولی سرکاری ملازمت میں بھی حصہ نہ دیا گیا اور معاویہ کے دور سے اس پالیسی کو تشدد کا رنگ دے کر برسر منبر حضرت علی و اولادِ علی کو سب و شتم کرنے کا سرکاری منصوبہ تیار ہوا تاکہ آنے والی نسلیں حضرت علی و اولادِ علی کے متعلق غلط تاثر لے کر پروان چڑھیں۔ عمر بن عبدالعزیز کے دورِ حکومت تک کے ساٹھ سالہ عرصہ میں اس اسلام سوز پالیسی پر بڑی شدت سے عمل کیا اور کرایا گیا ہر اس شخص کو مقرب بارگاہ ہونے کا موقعہ ملا جس نے حضرت علی و اولادِ علی سے دل کھول کر دشمنی کا اظہار کیا حتیٰ کہ معاویہ نے اپنے باپ کو بھرے دربار میں زانی ثابت کر کے زیاد بن ابیہ کو اپنا بھائی اور شاہی خاندان کا ایک خاص فرد ثابت کیا جس نے خاص طور پر شیعانِ علی کو اپنے ظلم کا نشانہ بنایا۔ چنانچہ خلافت و ملوکیت کے صفحہ ۱۶۴-۱۶۵-۱۷۵-۱۷۷-۱۷۹ وغیرہ پر قدرے اظہار کیا گیا ہے۔

اگرچہ دولت امویہ کی جگہ جب دولتِ عباسیہ نے لی تو اعلانیہ حضرت علی پر سب و شتم کا

دروازہ تو بند ہو گیا لیکن اُموی تعصب و عناد کی چنگاریاں بعض دلوں میں سلگتی رہیں اور جن لوگوں نے بچپنے سے بڑھاپے کے دور تک حضرت علی و اولادِ علی و شیعانِ علی پر سب وشتم اور ان کے متعلق کفر و زندقہ کا پرچار ہی سُنا اُن کے دل کب صاف ہو سکتے تھے اگر بعد میں کسی نے ان کی تعریف و مدح کی تو ان لوگوں نے اس کو کذب اور جھوٹ سے ہی تعبیر کیا جو کان پوری زندگی میں حضرت علی کے متعلق گالی گلوچ سنتے رہے تھے وہ حضرت علی کی تعریف کی احادیث پر کیسے باور کر سکتے تھے پس عوام میں شیعانِ علی کے متعلق تنفر ویسے کا ویسا باقی رہا اور اموی دور کے پروپیگنڈے سے متاثر و متعصب علماء نے اپنی کتابوں میں شیعانِ علی کے متعلق زہریلے اثرات چھوڑنے میں کوئی کسر باقی نہ اٹھا رکھی جس طرح ابن تیمیہ کے متعلق خود مودودی صاحب نے بھی اعتراف کیا ہے صـ۳۱۳ ۔ اس دشمن علی کا یہ دستور ہے کہ حضرت علی کے متعلق وارد ہونے والی ہر فضیلت و منقبت کا بالعموم صاف انکار کرتا ہے ورنہ اُسے رد کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا اور اس کی کتاب منہاج السنۃ" دورِ اموی کی شیعہ کش پالیسی کی عکاس ہے اور اس کا لفظ لفظ شیعہ دشمنی کا غماز ہے اور اس کی پوری کتاب سے حضرت علی و اولادِ علی کے متعلق حسد و بغض کا اظہار ہوتا ہے۔

اس صورتِ حال کے پیش نظر شیعی عقائد کا منظرِ عام پر لانا ضروری ہے تاکہ غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکے شیعہ مسلک کی اساس جن اُصولوں پر ہے اُن میں بنیادی حیثیت عقیدہ توحید کو حاصل ہے ۔ اس کے بعد عقیدۂ نبوت و عقیدۂ قیامت ہے ۔ جمہور اہل اسلام کسی حد تک ان عقائد میں شیعہ مسلک سے متفق ہیں لیکن عقیدۂ توحید کے ساتھ عقیدۂ عدل اور عقیدۂ نبوت کے ساتھ عقیدہ امامت شیعوں کے مختصات میں سے ہے۔

عقیدۂ توحید

شیعانِ علی کے مسلک میں اللہ ذات صفات افعال و عبادت کے لحاظ سے یکتا و تنہا ہے نہ اس کا شریک نہ سہیم نہ ضد نہ ند نہ معاون نہ معاضد نہ مشیر نہ وزیر نہ ماں نہ باپ نہ بیٹی نہ بیٹا نہ بیوی اور نہ کوئی رشتہ دار ہے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدٌ۔

توحید ذات ۔ یعنی وہ واحد بسیط ہے مرکب نہیں نہ اُس کی کوئی جزو تحلیلی ہے نہ ترکیبی اور نہ خارجی ہے نہ ذہنی ۔ تمام موجودات کا وہ واحد خالق ہے وہ ہر شے سے اوّل ہے اس کی اول کوئی نہیں وہ ہر شے سے آخر ہے اس کی آخر کوئی نہیں وہ فاعل مختار ہے مجبور نہیں جس طرح تمام اشیاء وجود میں اس کی ایجاد کی محتاج ہیں اسی طرح بقا میں اس کے ابقا کی محتاج ہیں تمام نظامِ عالم اس کی حسن صنعت و کمال حکمت کا کرشمہ ہے نہ اس میں اس کو تھکان ہوتی ہے اور نہ اس پر غفلت طاری ہوتی ہے نہ کسی کی مدد کا محتاج

ہے اور نہ مشورہ کا حاجتمند ہے جن وانس دیو و پری روح و ملک نبی و رسول اور ولی و مرشد خاکی و نوری۔ جاندار و بے جان ذوی العقول و بے عقل مجرد و مادی سافل و عالی۔ بحری و بری ارضی و سماوی۔ فرشی و عرشی اور ناسوتی و لاہوتی تمام مخلوق اس کے قبضۂ قدرت میں ہے وہی ایک ہر ایک کا ولی و کارساز ہے اور یہ سب کے سب اُسی ایک اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ۔

توحید صفات ۔ یعنی اللہ تمام صفاتِ کمال کا جامع ازلی و ابدی ہے اور سب صفات اس کی عین ذات ہیں وہ قدیم عالم قادر حی مرید مدرک متکلم اور صادق ہے وہ احدی الذات ان تمام صفاتِ کمال کا منبع وحید ہے بایں طور کہ یہ صفات اس کی ذات میں تعدد کی موجب نہیں ہوسکتیں جس طرح نفسِ انسانی متعدد خوبیوں کے باوجود متعدد نہیں ہوتا بلکہ واحد ہی رہتا ہے اور اللہ ہر اس صفت سے پاک منزہ ہے جو دامنِ جلال و جمال پروردگار کے لئے باعث نقص و عیب ہے پس وہ نہ مرکب ہے نہ جسم نہ محلِ حوادث ہے نہ مرئی۔ اس کا کوئی شریک ہے نہ ساتھی اور نہ وہ کسی شے میں حلول کرتا ہے نہ کسی کا محتاج ہے اس کے متعلق جامع فقرات وہ ہیں جو رئیس الموحدین و امیر المومنین حضرت علی علیہ السّلام نے مقامِ توحید میں ارشاد فرمائے ہیں۔ مَنْ وَصَفَهٗ فَقَدْ حَدَّهٗ وَمَنْ حَدَّهٗ فَقَدْ عَدَّهٗ وَمَنْ عَدَّهٗ فَقَدْ اَبْطَلَ اَزَلَهٗ وَمَنْ قَالَ كَيْفَ فَقَدِ اسْتَوْصَفَهٗ وَمَنْ قَالَ اَيْنَ فَقَدْ حَيَّزَهٗ عَالِمٌ اِذْ لَا مَعْلُوْمَ وَرَبٌّ اِذْ لَا مَرْبُوْبَ وَقَادِرٌ اِذْ لَا مَقْدُوْرَ

«لمعتہ الانوار صـ ۱۴۷ نقلاً از نہج البلاغہ خطبہ صـ ۱۴۸»

توحید در افعال ۔ یعنی خلق رزق امانت و احیاء و جملہ امور تکوینیہ اور عالم امکان کے اندر صانع ازل و حکیم مطلق کے یدِ قدرت کی صنعت و حکمت کے چھوٹے بڑے کارخانے اُسی کی تدبیر اتم و نظام اکمل کے مرہونِ منت ہیں وہ بغیر آنکھوں کے دیکھتا ہے بغیر کانوں کے سنتا ہے اور بغیر زبان کے بولتا ہے اسی طرح وہ اپنے تمام افعال میں اعضاء و جوارح کا محتاج نہیں۔ قرآن مجید میں کُن کا لفظ صرف سمجھانے کے لئے ہے ورنہ وہ پیدا کرنے میں کُن کہنے کا محتاج نہیں تاکہ زبان کا ہونا لازم آئے پس اس کے ارادے سے فعل ہوجاتا ہے وہ اپنے افعال میں نہ کسی کو شریک کرتا ہے اور نہ اُس کا کوئی شریک بن سکتا ہے اور نہ اُس نے کسی کو اپنے افعال کے اختیارات کا حامل بنایا ہے پس وہ خود ہی اس سارے اقتدار کا واحد مالک ہے۔

توحید در عبادت ۔ یعنی تمام کائنات کی عبادت کا مستحق وہ ایک اللہ ہے پس انسانوں جنوں

فرشتوں نبیوں رسولوں اماموں اور ولیوں کا وہی معبود حقیقی ہے اور اللہ کی جانب سے آنے والے جملہ انبیاء ورسل وحجج اور نازل ہونے والے جملہ صحیفے وکتب اُسی ایک خدا کی عبادت کی دعوت دیتے رہے ہیں پس وہی عبادتِ خلائق کا واحد مرجع اور ساری مخلوق کی حاجات کا واحد مرکز ہے وہی دعاؤں کو سننے والا ہے اور وہی جود وکرم اور عطا وبخشش کے لحاظ سے ہر ایک کا داتا ہے۔

عقیدہ عدل - عدل بھی اگرچہ صفاتِ کمال میں سے ایک صفت ہے اور ذاتِ خدا جمیع صفاتِ کمال کی جامع ہے لیکن جمہور اہل اسلام کے اشعری العقیدہ لوگوں کے مقابلہ میں اس کو استقلالی حیثیت دی گئی ہے وہ کہنے کو تو عدلِ خداوندی کے قائل ہیں لیکن وہ بعض ایسے اُمور کا عقیدہ رکھتے ہیں جن سے عدل کی نفی لازم آتی ہے مثلاً اُن کے نزدیک افعال کا حُسن وقبح ذاتی نہیں بلکہ جس چیز کا خدا حکم دے دے وہ حسن بن جاتا ہے اور جس چیز سے وہ منع کرے وہ قبیح بن جاتا ہے ورنہ حکم یا نہی سے پہلے وہ دونو ایک جیسے تھے مثلاً احسان وظلم اور سچ اور جھوٹ برابر ہیں لیکن جب اللہ نے احسان اور سچ کا حکم دیا تو وہ حسن بن گئے اور جب اُس نے ظلم اور جھوٹ سے روکا تو وہ قبیح بن گئے پس ہم شریعت کے پابند ہونے کی وجہ سے کسی فعل کے حُسن یا قباحت کا فیصلہ کرتے ہیں لیکن اللہ چونکہ ہر پابندی سے بالاتر ہے لہذا اُس کا ہر فعل ہر قسم کی پابندیوں سے بالاتر ہے پس وہ جو کرے حسن ہوگا اور جو نہ کرے وہ قبیح ہوگا اگر وہ کسی نیک کو جہنم میں اور کسی بد کو جنت میں بھیج دے تو وہ قبیح نہیں بلکہ حسن ہوگا کیونکہ حسن اور قبح افعال کا ذاتی نہیں تاکہ اللہ کے فعل یا امر کو اُس کی موافقت سے حسن یا قبیح کہا جا سکے۔

عقیدہ شیعہ کی رُو سے افعال کا حسن وقبح ذاتی ہے اور خدا حسن کا حکم دیتا ہے اور قبیح سے منع فرماتا ہے۔ عقلِ سلیم اور وجدانِ مستقیم خود اس کے لئے فیصل کافی ہے جس طرح دیکھنے کی چیزوں میں خوش شکل وبدشکل کا فرق ہے۔ آوازوں میں قمری اور بلبل کی آواز اور گدھے وگدھ کی آواز میں فرق ہے۔ چھونے کے لئے ملائم اور سخت میں فرق ہے۔ سونگھنے کے لئے خوشبو اور بدبو میں فرق ہے اور قوت ذائقہ میٹھی اور تلخ میں واضح فرق محسوس کرتی ہے۔ اِسی طرح عاداتِ انسانیہ میں ملائم ومنافر اور مرغوب ومبغوض کے درمیان کھلا ہوا فرق موجود ہوتا ہے مثلاً احسان وصدق اچھی عادات ہیں اور ظلم وکذب بُری عادات ہیں اور یہ امتیاز ان خواص واوصاف میں ذاتی ہے نہ کہ اعتباری حتی کہ جو لوگ کسی دین وملت کے پابند نہیں وہ بھی لسانِ عقل اور زبان فطرت سے ان کا فرق سن چکے ہیں اور کسی ملت ومذہب پر ایمان نہ لانے کے باوجود اس فرق پر ایمان رکھتے ہیں۔ اگر امر خداوندی اور نہی ایزدی کے بعد ان کا حُسن وقبح قائم ہوتا تو کافر وملحد لوگ یقیناً اس فرق سے نا آشنا ہوتے حالانکہ مسلمانوں کی طرح ان امور کی اچھائی وبرائی کے وہ بھی قائل

ہیں اور یہ اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ افعال کا حسن وقبح ذاتی ہے اور اللہ حسن کا امر کرتا ہے اور قبیح سے روکتا ہے اور اسی کا نام ہے عدل اگر اس کے خلاف کرے تو وہ ظلم ہے اور ساحت الوہیت ظلم سے پاک ومنزہ ہے بنابریں نیک کو جہنم میں بھیجنا ظلم ہے اور اللہ سے اس کا صدور ناممکن ہے وہ خود بھی عادل ہے اور لوگوں کو بھی عدل کا حکم دیتا ہے۔

عقیدۂ نبوت۔ شیعانِ علی کا نبوت کے بارے میں عقیدہ یہ ہے کہ انسانوں کی ہدایت کے لئے خداوند کریم نے اپنے لطف وکرم سے بعثت انبیاء کا انتظام فرمایا پس آدم سے لے کر حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی مبعوث ہوئے جو سب کے سب گناہانِ صغیرہ وکبیرہ سے معصوم تھے ان میں سے پانچ انبیاء حضرت نوح حضرت ابراہیم حضرت موسٰے حضرت عیسٰی اور حضرت محمد مصطفٰے علیہم الصلوٰۃ والسلام اولوالعزم کہلاتے ہیں اور تمام نبیوں کے سلطان وسردار حضرت محمد مصطفٰے ہیں اسی طرح ان کی اُمت تمام اُمتوں کی سردار ہے۔ آپ کی شریعت گذشتہ تمام انبیاء کی شرائع کی ناسخ ہے اور آپ کی کتاب قرآن مجید تمام کتب سماویہ و صحفِ الٰہیہ سے افضل و برتر ہے۔ آپ کا لایا ہوا دین اسلام تمام ادیان سے بہتر اور مکمل ہے۔ آپ آخری نبی ہیں ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا لہٰذا آپ کی شریعت آخری شریعت ہے اور دین اسلام آخری اور مکمل دین ہے اور قرآن مجید قیامت تک کے لئے انسانی، دینی و تمدنی ضرورتوں اور پیش آمدہ مسائل کی وضاحت کا مکمل کورس اور دستور العمل ہے اور صداقت سید الانبیاء اور حقانیت اسلام کے اثبات کے لئے ہر دور میں زندہ معجزہ ہے حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت انسانیت کا مکمل درس ہے ان کا حلال قیامت تک کے لئے حلال اور ان کا حرام قیامت تک کے لئے حرام رہے گا۔ ان کی شریعت کے کسی دستور وقانون کا انکار یا اس کی توہین کفر ہے۔ اسی طرح ان کی پیش کردہ کتاب "قرآن مجید" کی کسی آیت کا انکار یا توہین کفر ہے۔ ان کی اطاعت باعث نجات وخوشنودیٔ پروردگار ہے اور ان کی نافرمانی باعثِ عذاب اور غضب پروردگار ہے۔ ان کے دوستوں سے دوستی ومحبت واجب ہے اور ان کے دشمنوں سے دشمنی ونفرت واجب ہے پس صحابہ کرام میں سے جو لوگ حضور کی تعلیمات پر ثابت قدم رہے ان سے محبت کرنا واجب ہے لیکن جو لوگ دنیاوی اقتدار کے پھندے میں آکر حضور کی تعلیمات کو فراموش کر بیٹھے اور جنہوں نے سیاستِ ملکیہ کی خاطر شرعی تقاضوں کو بھلا دیا ان کا کوئی احترام نہیں پس ان سے نفرت کرنا ایمان ہے کیوں کہ دین میں اُصول پرستی ہے نہ کہ شخص پرستی۔

آپ کی پوری زندگی انسانیت کا مکمل لائحہ عمل اور اسوہ حسنہ تھی آپ مکہ میں پیدا ہوئے آپ کے والد ماجد کا نام حضرت عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف تھا اور آپ کی والدہ کا نام حضرت آمنہ بنت وہب تھا۔ آپ نے چالیس برس کے بعد اعلانِ نبوت فرمایا۔ شیعہ عقیدہ ہے کہ انبیاء کے والدین کافر نہیں ہوتے اور حضرت رسالت مآبؐ کے والدین بلکہ آبائی سلسلہ تا آدم و حوا مسلمان تھا اور یہ نورِ نبوت کسی بھی زمانہ میں کافر و مشرک لیشت و رحم میں نہیں رہا بلکہ پاکیزہ اصلاب اور طاہرہ ارحام میں منتقل ہوتا رہا۔ وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ کی تاویل خاندانِ نبوت نے یہی فرمائی ہے۔ مزید وضاحت "لمعۃ الانوار" میں ہم نے کی ہے۔

عقیدۂ امامت۔ شیعانِ علی کے نزدیک عہدۂ امامت و خلافت عہدۂ نبوت کا قائمقام ہے چونکہ آپ خاتم الانبیاء تھے پس نبی تو آسکتا نہیں اور دین کی حد قیامت تک ہے لہذا ہدایت اُمت کے لئے قیامت تک کے لئے خلفاء آئمہ کا انتظام ضروری ہے اور نبی کے لئے جن جن اوصاف کا ہونا ضروری ہے ان کے بعد ان کے قائم مقام کے لئے سوائے صفت نبوت کے باقی تمام اوصاف کمال کا ہونا ضروری ہے اور حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ و آلہٖ چونکہ اسلامیانِ عالم کے لئے دینی و سیاسی ہر دو قسم کی قیادت کے سربراہ تھے وہ جس طرح عقائد اعمال اور اخلاق و عادات کی اصلاح کے علمبردار تھے اسی طرح تمدنی زندگی اور معاشرتی بہبود میں نظامی اُمور کی کفالت بھی آپ کے ذمہ تھی اور سرحداتِ اسلام کی حفاظت اور دشمنانِ اسلام سے نبرد آزمائی یا صلح و صفائی کی تدابیر بھی آپ ہی کے حیطۂ اختیار میں تھیں لہذا ان کے حقیقی جانشین کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان تمام امور میں اُمتِ اسلامیہ کی سربراہی کے لئے استعداد تام کا حامل ہو۔ وہ جہاں علومِ قرآنیہ و معالمِ دینیہ و سننِ نبویہ کا عالم کامل ہو وہاں سیاستِ ملکیہ اور صولتِ سلطانیہ کے لئے بھی اہلیت و موزونیت تامہ رکھتا ہو۔ پس وہ اوصافِ باطنہ و کمالاتِ ظاہرہ سے آراستہ ہو اور دینی قیادت کے لئے اپنے پورے اہلِ زمان سے افضل، اعلم، ازہد و اتقیٰ ہو بلکہ صفت عصمت سے پیراستہ ہو تاکہ اس کی اطاعت اطاعتِ خدا اور رسول قرار دی جاسکے اور ان تمام اُمور کو مدنظر رکھتے ہوئے شیعانِ علی کے مسلک میں حضور رسالت مآبؐ کے بعد قیادت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی چنانچہ سیاسی قیادت مخصوص طریق کار سے حضرت ابوبکر نے سنبھال لی جس کو جمہوریت کا نام دیا گیا اور دینی قیادت حضرت علی علیہ السلام کو حاصل تھی کیونکہ دینی قیادت کا عہدہ جمہوری طرزِ عمل سے اور اجماعی طریق کار سے نہیں ملا کرتا بلکہ یہ خدائی عہدہ ہے وہ جس کو چاہے دے دیتا ہے اور اس کی اہلیت کا اندازہ بھی سوائے خدا کے کسی کو نہیں ہوسکتا پس دینی قیادت

یعنی امامت حقہ کی تعیین اُمت کے اختیار میں نہیں کہ جسے چاہے چن لے بلکہ جس طرح خدا اپنے اختیار
وعلم سے نبی کو نامزد کرتا ہے اسی طرح وہ اپنے علم و اختیار سے خلیفہ نبی اور امام اُمت کو نامزد کرتا ہے
جس کا اعلان و اظہار رسول کے ذمہ ہوتا ہے اور حضرت علی کی امامت و خلافت کا اعلان حضرت
رسالت مآب نے حجۃ الوداع سے واپسی پر اپنے خطبۂ غدیریہ میں ایک لاکھ سے زیادہ حاجیوں کے
مجمع میں فرمایا تھا جو تواتر سے منقول ہے اور سوائے اموی پراپیگنڈہ سے متاثر ہونے والے متعصب
مزاج لوگوں کے اس کا انکار کسی نے نہیں کیا۔ اور حضرت علی سے لے کر حضرت مہدی علیہ السلام تک
یکے بعد دیگرے آئمہ نائبین رسول ہوئے اور ہر امام اپنے بعد والے امام کو نامزد کر کے دنیا سے اٹھا
اور یہی رسول اللہ کے بارہ خلیفے ہیں جن کا احادیث میں صراحت سے اعلان کیا گیا ہے اور سوائے
اس کے اثنا عشر خلیفہ کی حدیث کا کوئی دوسرا معقول مصداق بن ہی نہیں سکتا۔ مزید تفصیلات گذشتہ
صفحات میں حسب ضرورت گذر چکی ہیں پس شیعہ لوگ صحابہ کو صحابہ مانتے ہیں اور ان میں سے جو تعلیمات
نبویہ پر برقرار رہے اُن کا احترام کرتے ہیں لیکن جو حق سے پھر گئے ان سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی
طرح جو لوگ مسند اقتدار پر آگئے شیعہ ان کو سلاطین وقت مانتے ہیں امام اُمت اور قائد ملت نہیں
مانتے کیونکہ اقتدار سے سیاسی قیادت مل سکتی ہے نہ کہ دینی و شرعی قیادت اور یہ واضح ہے۔

عقیدۂ قیامت: شیعان علی قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں وہ دن حساب کا ہے
کہ تمام جن و انسان دوبارہ زندہ ہو کر اللہ کے سامنے پیش ہوں گے اور ان سے ذرہ ذرہ کا حساب لیا
جائے گا۔ نیکوں کو جزا اور بُروں کو سزا ملے گی۔ حضرت رسول اللہ نے قیامت کے متعلق جن اُمور کی
خبر دی ہے یا قرآن مجید میں جن اُمور کا تذکرہ ہے شیعان علی ان سب کو حق مانتے ہیں پس حشر و نشر حساب
صراط لواء الحمد کوثر اور جنت و جہنم سب کا ہونا حق اور صحیح ہے اور شفاعت پر بھی شیعان علی کا ایمان ہے
کہ مستحقین شفاعت کی شفاعت ہوگی۔ حضرت محمد مصطفےٰ ص اور ان کی آل امجاد اور بعض مخلص مومن بھی
شفاعت کریں گے اور نیک نصیب لوگ ان کی شفاعت کی بدولت عذاب جہنم سے نکل کر جنت میں
داخل ہوں گے۔

اسی طرح ملائکہ، جنات، ارواح، لوح و قلم، عرش و کرسی، حجابات و سرادقات و معجزات و کرامات
و وحی و الہام و سوال منکر و نکیر و فشار قبر و قرآن مجید و جملہ کتب سماویہ و صحف نازلہ اسی طرح جملہ احکام شرعیہ
واجبہ و مکروہہ و مسنونہ و محرمہ و مباحہ غرضیکہ جو باتیں حضور رسول اللہ ص نے پہنچائیں اور جس طرح پہنچائیں
شیعان علی سب کو اسی طرح مانتے ہیں جس طرح حضورؐ نے ماننے کا حکم دیا اور جن اُمور کا ثبوت شریعت

میں ضروری ہے ان کا انکار کفر والحاد ہے۔ پس عبادات، معاملات، عقود اور تعزیرات کے معاملہ میں حضور کی ہدایات اور فرمائشات واجب الاذعان اور واجب العمل ہیں ان کی مخالفت فسق اور انکار کفر ہے۔ عقائدِ شیعہ پر مفصل و مدلل بیان ہماری کتاب لمعتہ الانوار فی عقائد الابرار میں پڑھیئے۔

کرسئ اقتدار کے رائج الوقت ذرائع

ہر دور میں طلب اقتدار کے لئے نفوسِ انسانیہ حرص و ہوس کے دیوؤں کو اپنی چرب لسانی، سحر بیانی یا قلم کاری و مضمون نگاری یا دیگر مناسب و مقبول ذرائع کی بدولت امن و سکون کے دیوتاؤں کا روپ دے کر عوام الناس کو اپنا گرویدہ بناتے ہوئے مضبوط پارٹیاں بنا کر کرسئ اقتدار پر براجمان ہوتے چلے آئے اور تجربہ شاہد ہے کہ کرسئ اقتدار کا طالب کرسی حاصل ہونے سے پہلے عوام سے جس قدر والہانہ محبت سے پیش آتا ہے۔ کرسی ملنے کے بعد اس سے کہیں زیادہ عوام کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے اور کامیابی سے پہلے عوام سے جس قدر خلق و تواضع سے پیش آتا ہے کامیابی کے بعد اُس سے کہیں زیادہ بدخلقی اور تکبر مزاجی کا اظہار کرتا ہے نہ اُسے کئے ہوئے وعدوں کی پاس ہوتی ہے نہ کسی کی احسان مندی کا اُسے احساس ہوتا ہے اور نہ اُسے غیرت انسانیہ اور شرافتِ بشریہ کا لحاظ ہوتا ہے پس اقتدار کے نشے میں وہ اپنے تئیں ایک بلند شخصیت بلکہ اعلیٰ مخلوق قرار دیتے ہوئے تمام انسانوں کو ذلت اور حقارت بھری نگاہوں سے دیکھتا اور اقتدار کی لاٹھی سے سب کو حیوانوں کی طرح ہانکنے میں وہ سرور محسوس کرتا ہے۔ حتیٰ کہ قبل از اقتدار کے اچھے خاصے اور بے تکلف دوستوں اور قابلِ قدر بزرگوں کو بھی اس کی بارگاہِ رفعت تک پہنچنے کے لئے کافی کچھ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور عوام کے لئے تو اُس تک باریابی صرف مشکل ہی نہیں بلکہ محال ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں شکایات سُنی جائیں تو کیونکر اور تکالیف و مصائب کا مداوا ہو تو کیسے؟ پس بیچارے عوام کی چیخ و پکار حاجتمند افراد کا شور و غوغا مظلوموں کی فریاد بے کسوں کی دہائی اور کمزوروں کی نالہ و زاری اگرچہ ایک طرف عرشِ بریں تک مسلسل پہنچ جاتی ہیں لیکن ایوانِ حکومت میں بسنے والوں کے کانوں میں جوں تک نہیں رینگتی ہاں جب قادر مطلق کی بے آواز لاٹھی حرکت میں آتی ہے اور بے کسوں و بے بسوں کی آہیں بارگاہِ اجابت تک پہنچتی ہیں اور ایوان حکومت کی چولیں ہلنے لگتی ہیں تو اقتدار کے متوالوں کی بھی آنکھیں کھلتی ہیں لیکن اتنے میں کرسئ اقتدار چھن جاتی ہے اور صاحب تخت تختہ دار پر یا زندان کی تحریک کوٹھری کی طرف منتقل ہو کر اپنے تکبر و رعونت کی سزا بھگتنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ایک کے بعد دوسرا پھر تیسرا وعلی ہذا القیاس۔ اور ہر بعد میں اقتدار حاصل کرنے والا۔ اپنے سے پہلے حکمران کے انجام بد سے سبق حاصل کرنے کے بجائے ان ہی اغلاط کا بلکہ اس سے بھی زیادہ کا اعادہ کرتا ہے جو سابق صاحب اقتدار کے زوال کی موجب بنی تھیں اور لطف یہ کہ اقتدار حاصل کرنے کے لئے جن جن اغلاط کو سابق حکمران کی طرف منسوب کرکے اپنے لئے راستہ ہموار کرتے ہوئے عوام کی تائید حاصل کی جاتی ہے اقتدار حاصل ہونے کے بعد بعینہٖ اسی نوعیت کی غلطیوں کا اعادہ ہوتا ہے اور اس انجام سے نشۂ اقتدار بالکل غافل کر دیتا ہے جو سابق کو پیش آیا تھا۔

ایسے خوش بخت انسان بہت کم ہیں جو انسانیت کے فطری تقاضوں کو سمجھتے ہوں اور خود بھی اُن کے مطابق اپنے احساسات وجذبات کی باگ ڈور موڑ سکنے پر قادر ہوں لیکن ایسے لوگ اقتدار کی رسہ کشی میں شامل ہونے سے گریزاں رہتے ہیں اس لئے کہ زمانہ ساتھ دینے سے انکاری ہوتا ہے کسی بھی اہم کام کی طرف اسباب وذرائع کے بغیر اقدام کرنا دانشمندانہ فعل نہیں اور بالخصوص جمہوری طریقہ اقتدار کے ماتحت اس میدان میں پیش قدمی کے لئے جن جن اسباب وذرائع اور جس قسم کے جائز وناجائز ہتھکنڈوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ انسانی اقدار کو سمجھنے اور اپنانے والے افراد کی ہمت اور دسترس سے بہت دُور ہوتے ہیں پس ایسے لوگ ہی اس میدان میں کود سکتے ہیں جو جائز وناجائز ہر رنگ اختیار کر سکنے پر قادر ہوں جو وعدہ کرنے میں سچ وجھوٹ کے درمیان ملاوٹ کر سکیں اس کو پورا کرنے یا کر سکنے کی فکر سے بے نیاز ہوں اسی طرح درست وغلط کہنے یا کرنے میں نہ فرق کریں نہ شرمائیں، نہ کترائیں اور نہ گھبرائیں بلکہ سیاسی میدان میں اس قدر دلیر ہوں کہ اگر بھرے مجمع میں ان کی بات جھوٹی بھی ثابت ہو جائے تو اُن کے چہرہ پر نہ عرق خجالت آئے نہ ماتھے پر شکن نہ زبان میں لکنت اور نہ مسکرانے و ہنسنے میں فرق آئے اسی طرح پارٹی کو مضبوط کرنے کے لئے ہر آدمی سے ہر قسم کا وعدہ کرنے میں جھجک نہ محسوس کریں اور مدمقابل کو جائز وناجائز طور پر ہر برے کیچڑ میں ملوث کرنے پر پوری جرأت کا مظاہرہ کر سکیں۔ پس نہ دوسرے کی توہین کو گناہ سمجھیں اور نہ اپنی توہین کو ہتک سمجھیں اور اس قسم کی دریا دلی کے ساتھ ساتھ مالی ذرائع میں بھی کافی وسعت ہو۔

اور اس میں شک نہیں کہ ایسوں کا مقابلہ ایسے ہی کر سکتے ہیں پس اس میدان میں جو جیتے گا وہ لازماً ایسا ہی ہوگا جیسا کہ بیان ہو چکا ہے تو ایسی صورت میں انسانی تقاضوں کا جب سرے سے خون ہو جاتا ہے تو بعد میں انسانیت کی لاج کون رکھے؟ پس اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اقتدار کی کرسی ہر وقت ڈانواں ڈول رہے گی اور تخت حکومت ہر وقت تختۂ دار یا زندان کا پیش خیمہ رہے

گا اور ساتھ ساتھ انسانیت کی کشتی ظلم و جور کے تلاطم میں ہچکولے کھاتی پھرے گی اور عوام الناس امن و سکون کے لئے ترستے ہوئے زندگی کو خیر باد کہہ کے چلتے رہیں گے۔

اور اس بیان کے بعد یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ جمہوری ذرائع سے اقتدار کی منتقلی صحیح اور حقدار انسانوں کی طرف بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے کیونکہ افرادِ انسانیہ میں کثرت غیر سنجیدہ لوگوں کی ہوا کرتی ہے اور سنجیدہ افراد بہت کم ہوتے ہیں اور جو ہوتے ہیں وہ اس میدان میں قدم نہیں رکھ سکتے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کیونکہ اس میدان میں ایک سو ایک جاہل کو پورے ایک سو عالم و فاضل پر سبقت حاصل ہے پس اگر ایک طرف ایک سو دانشمند کامل انسان ہوں اور دوسری طرف ایک سو ایک احمق و بیوقوف انسان ہوں خواہ مرد ہوں یا عورتیں تو ان کی جیت ہے لہٰذا نظامِ جمہوریت میں دانشمندوں کے اقتدار کا تصور بالکل ناشدنی امر ہے۔ چنانچہ اسلام کے دورِ اول میں حضرت علی علیہ السّلام ان ہی وجوہ کے ماتحت پسِ پشت ہوئے اور دوسرے لوگ پیش رو بن گئے۔ معاویہ جیسا انسان اقتدار پر قابض رہا اور امام حسن جس کو پیغمبرؐ نے جوانانِ جنت کا سردار کہا تھا وہ گوشہ نشینی پر مجبور ہو گئے اسی طرح یزید پلید کثرت کی ہمنوائی کے صدقے میں تخت نشین رہا اور امام حسین نے اپنے قلیل ہمراہیوں کے ساتھ جامِ شہادت پی لیا۔ تاریخ اسلام کے ان سابق اوراق سے وابستگی رکھنے کے بعد ہر حساس انسان جمہوری طریقِ حکومت کی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے لیکن اکثریتی رجحان ایک طوفانِ بے کراں بن کر ہر انسان کو اپنی رَو میں تنکوں کی طرح بہائے لے جا رہا ہے اور اس طوفان کا منہ موڑنا صرف مشکل نہیں بلکہ ظاہراً ناممکن بھی ہے پس کرسئ اقتدار عیاشی کی آماجگاہ ہوتی ہے جسے شاطرانہ طریقہ سے حاصل کیا جاتا ہے عوام کی خدمت کے لئے نہیں بلکہ عوام پر حکومت کرنے کے لئے اور انسانیت کی بھلائی و خیر خواہی کے لئے نہیں بلکہ اپنی بھلائی و بہبود کے پیشِ نظر انسانوں کو غلام بنانے کے لئے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ حکمران رعایا کی جانب سے مطمئن ہوتا ہے اور نہ رعایا حکمران کی جانب سے سکون حاصل کرتے ہیں۔ اور یہ دو طرفی بے چینی مستقبل قریب میں نئے اقتدار کو جنم دے کر دم لیتی ہے۔

دورِ حاضر میں اسلامی حکومت کا تصوّر

اقتدار کی منتقلی میں بے راہ روی کی جو ابتداء مسلمانوں میں روزِ اول سے ہوئی اس کا خمیازہ ان کو ہمیشہ بھگتنا پڑا۔ اگر رسالت مآبؐ کی وصیت کے پیشِ نظر حضرت علی کی نامزدگی پر اکتفا کیا جاتا اور

اس کے مقابلہ میں جمہوری طریق کار کو رائج نہ کیا جاتا تو ایک طرف اُمتِ اسلامیہ دورِ اول کے گھناؤنے واقعات سے دامن بچا لیتی اور دوسری طرف اقتدار کی منتقلی کے پُرامن ذرائع ہاتھ سے نہ چھوٹتے۔

اب اگر یہ سوال کیا جائے کہ دَورِ حاضر میں اسلامی حکومت کونسی متصور ہوگی تو اس کا جواب صرف یہ ہی ہو سکتا ہے کہ جمہوری تقاضوں کے پیش نظر اگر حکومتِ اسلامیہ کے قیام کا نعرہ بلند کر کے عام رجحانات کو اپنے ساتھ ملا کر کوئی شخص یہ خدمت انجام دینا چاہے تو موجودہ طریق کار اور اسلامی اقدار کی کس مپرسی اور ساتھ ساتھ قیود مذہب سے آزادی کا عام تصور قطعاً اسے پنپنے نہ دے گا۔ کیونکہ دَورِ حاضر میں اقتدار حاصل کرنے کے لئے سرِ رائج الوقت ذریعہ کو اپنائے بغیر چارہ نہیں پس اقتدار کی کرسی سنبھال لینے کے بعد جس کسی کو خدا توفیق دے اور انسانی اقدار کا قدردان بن کر خدمتِ خلق کی خاطر اپنے آپ کو پیش کرے پس خدائی اُصولوں کو اپناتے ہوئے اسلامی طریق کار کو مشعل راہ بنائے۔ اور رعایا کے لئے عدل و انصاف کی راہیں ہموار کر کے اسلامی و شرعی آئین کو رائج کرنے کی جرأت کرے تو ایسا شخص اپنی ذات کے لئے بھی صحیح خیر خواہ ہوگا اور افراد رعایا کی بھلائی کی توقع بھی اس سے ہو سکے گی اور یقیناً ایسا کرنے والا اپنے اندر رعایا کی جانب سے اطمینان محسوس کرے گا اور رعایا کو بھی اس کی حکومت میں امن و سکون کا سانس لینا نصیب ہوگا اور ہر دو طرف سے جب بے چینی ختم ہو جائے گی تو مملکت چین و اطمینان کا گہوارہ ہوگی پس ایسی حکومت یقیناً اسلامی حکومت کہلانے کی مستحق ہوگی اور اس میں آباد معاشرہ اسلامی معاشرہ متصور ہوگا۔ خدا کرے ایسا دن بہت جلد آئے جب حکمران طبقہ میں یہ احساس پیدا ہو اور ملک آئے دن کے فسادات و بے چینیوں سے پاک و صاف ہو کر اچھے اور ستھرے ماحول کو جنم دینے کے قابل ہو۔

اِسلامی مساوات

یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر لمبی چوڑی بحث کی ضرورت ہے اور اس کے جزئیات پر تفصیلی تبصرہ کے بغیر کسی نتیجہ کی ٹوہ لگانا دانشمندی نہیں اگر وقت نے ساتھ دیا تو اس موضوع پر الگ ایک کتاب سپردِ قلم کی جائے گی سردست نعرۂ مساوات کے متعلق مختصر سی گذارش پیش کرنی ہے۔ جس کی تفصیل ہماری کتاب "اسلامی سیاست" میں کی گئی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مساوات کا نعرہ اور بالخصوص اسلامی مساوات نہایت جاذب طبع اور خوش کن ہے خدا کرے اس کے پیچھے پیچھے ظلم اور بے راہ روی کا ہاتھ پوشیدہ طور پر کارفرما نہ ہو۔

اللہ نے فطری اور خلقی طور پر کائنات کی کسی جنس و نوع میں مساوات کو جگہ نہیں دی بلکہ اعلیٰ و ادنیٰ افراد پر مشتمل اجناس و انواع معرضِ وجود میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو کر اربابِ دانش کے لئے کھلی ہوئی دعوتِ فکر کا انتظام اپنے اندر رکھتی ہیں۔ بنا بریں طبقہ انسان بھی اس قسم کے خلقی و فطری اختلافات کی زد سے محفوظ نہیں، خوبصورت، بدصورت، نیک بد، دراز قد، پستہ قد، ذہین، احمق محنتی، نکمے، کامل ناقص، شریف رذیل، وفادار غدار، طامع قانع، شاکر کافر، مالدار غریب اور صحت مند و بیمار غرضیکہ ہر انسانی صفت میں اعلیٰ و ادنیٰ افراد کا وجود فطری و قہری تقسیم کا مظاہرہ ہے جس سے انکار کرنا فطری اقدار کو ٹھکرانے کے مترادف ہے۔ اسی طرح دنیاوی زندگی کی بہبود کے لئے نظریاتی فرق اذہانِ انسانیہ کی فطری آزادی کی لازمی پیداوار ہے جس کے سیلِ رواں کو روکا نہیں جا سکتا نیز تحصیلِ منفعت اور کسبِ دولت کے لئے فکر و نظر اور مناسب ذرائع کے استعمال میں طرق و اسباب کی تعیین اور عملی اقدام میں افرادِ انسانیہ کے درمیان معتدبہ فرق نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جہاں ایک انسان نفع مند ہوتا ہے تو دوسرا نقصان و خسارہ کا منہ دیکھتا ہے اور دوسرے وقت میں پہلا آدمی خسارے سے دوچار ہو جاتا ہے تو دوسرا آدمی نفع مندی کے گیت گاتا نظر آتا ہے اور یہ ردّ و بدل اور نشیب و فراز انسانی زندگی کے لوازم میں سے ہے جس طرح صحت و مرض کو لازم بدن کی حیثیت حاصل ہے۔ اسی طرح ایک آدمی تنومند جسیت و چالاک ہونے کے باوجود محض نکما اور مفت خور ہوتا ہے اور اس کے مقابلہ میں ایک تپلا دبلا اور نحیف و لاغر انسان ہاتھ پاؤں ہلا کر اور بدن کو مشقت میں ڈال کر کمانا اپنا فریضہ سمجھتا ہے اور جس طرح ایک نکما انسان دوسروں کی کمائی پر للچائی ہوئی نظریں ڈالتا ہے اسی طرح باہمت انسان دوسروں کی کمائی پر نظر ڈالنا اپنی غیرت و حمیت کی موت سمجھتا ہے۔ اسی طرح ایک فضول خرچ آدمی ہزاروں روپوں کو چند لمحات میں تلف کر بیٹھتا ہے اور اس کے مقابلہ میں قانع آدمی ایک پُروقار زندگی کی خاطر کاروبار یا جائداد کی طرف اقدام کرتا ہے اور اسی قسم کے خلقی و فطری اختلافات امیر و غریب کے فرق کے موجب بنتے ہیں۔ بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ ایک زمیندار کے دو بیٹوں میں سے ایک نے اپنی عیاشی کی خاطر اپنی جائداد کوڑیوں کے داموں بیچدی اور کنگال ہو کر بسر اوقات پر مجبور ہوا اور اس کی اولاد گداگری یا مزدوری یا کسی مناسب ملازمت کی تلاش میں بھٹکتی پھری اور دوسرے نے قناعت سے وقت گذارتے ہوئے موروثی جائداد کے ساتھ ساتھ اور بھی خرید لی اور ٹھاٹھ کی زندگی گذاری اور اس کی اولاد نے بھی اُسی ٹھاٹھ سے بسر اوقات کی۔ اسی طرح تاجر کے لڑکوں میں سے جو نکما اور نکھٹو ہوا اس نے غلط کاریوں اور اوباشیوں

ین موروث روپیہ ضائع کردیا اور اس کے لائق و ذہین بھائیوں نے اپنی تجارت کو فروغ دے کر دنیا کی ریل پیل کے ساتھ فرحت و سرور کی مسندوں پر آرام سے وقت گذارا۔

ان فطری و خلقی اختلافات کو نظر انداز کرنا دانشمندی نہیں اور ان کا انکار کرنا کسی کے بس کا روگ نہیں باقی رہا ان کو ختم کر دینا یہ فطرت کے خلاف کھلی ہوئی جنگ ہے جس کو فتح کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ اب رہی اصلاح تو اس کا ہر صاحب دل کو قدر دان ہونا چاہیے لیکن کیا اصلاح کا راز اسی میں مضمر ہے کہ بڑوں کی ملکیت کو چھوٹوں میں تقسیم کر کے سب کو چھوٹا بنا دیا جائے یا چھوٹوں کے لئے اسباب کی فراوانی کر کے ان کو بڑوں کے دوش بدوش چلانے کی کوشش کی جائے ؟

مذکورہ بالا فطری و خلقی اختلافات کے علاوہ حالات و ماحول کی سازگاری یا ناسازگاری بھی بعض اوقات طبقاتی اختلافات کی باعث و موجب یا محرک و داعی بن جاتی ہے مثلاً ایک ہی باپ کے دو بیٹوں میں جو جائداد برابر تقسیم ہوئی۔ ایک کے حصہ میں زرخیز ٹکڑا آگیا اور دوسرے کے حصہ میں کمزور خطہ آیا یا ایک کے لئے اسباب آب پاشی کی فراوانی ہوگئی اور دوسرا اس سے محروم رہا۔ یا ایک کے فصل پختہ پر آفات سماویہ نے ہلا بول دیا اور دوسرا محفوظ رہا تو ایسی صورتوں میں بھی نتیجہ یہی نکلے گا کہ کوئی امیر ہوگا اور کوئی غریب ہوگا پس ان اسباب و ذرائع پر کنٹرول کرنا انسان کے بس سے باہر ہے اور ان کا سرے سے انکار کرنا محض کور باطنی ہے۔

اگر طبقاتی اختلاف کی وجوہ افراد انسانیہ کی بے راہ روی سے پیدا ہوں تو ان کی روک تھام اور موثر تدابیر سے ان کا قلع قمع حکومتِ وقت کے فرائض میں داخل ہے جس طرح کہ فطری و خلقی اختلافات کی بدولت ہونے والے طبقاتی فرق میں زبردست کی چیرہ دستیوں اور استبدادی بدمستیوں سے زیردست کی نگہداشت حکومت کے ذمہ ہے۔

پس بے راہ روی اور ناجائز ذرائع سے حاصل شدہ املاک و دولت کو ظالم منافع خوروں کے قبضہ سے نکال کر مستحقین تک پہنچانا ہر انصاف پسند طبیعت کے لئے قابلِ قبول ہے اور حکومتِ وقت اس فریضہ کو باحسن طریق انجام دے سکتی ہے جس طرح کہ حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے اپنے دورِ اقتدار میں اس قسم کی اصلاحات نافذ فرما کر آنے والی نسلوں کے لئے اقتصادیات کی بہترین مشعل روشن فرمائی۔ چنانچہ ناجائز حاصل شدہ تمام دولت و املاک کو بیت المال میں واپس کرنے کا حکم صادر فرمایا اور تمام مسلمانوں کو ان میں برابر کا شریک قرار دیا اور بعد میں آنے والی ہر اسلامی حکومت کے لئے اسوۂ حسنہ کی تشکیل فرمائی اور اس سلسلہ میں ہر بڑی سے بڑی مخالفت کو

قابل اعتنا نہ سمجھا چنانچہ امیر شام کی بغاوت کی سب سے بڑی وجہ بھی یہی ہے کہ اُس کو اپنی املاک و جاگیروں سے دست بردار ہونا پڑتا تھا پس خلیفۂ سابق کے قتل کے انتقام کا بہانہ لے کر آگے بڑھا اور بنی اُمیہ کے تمام ناجائز منافع خوروں اور جاگیرداروں نے فوراً اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور ایک متحدہ محاذ بنا کر نبرد آزما ہوگئے۔

بایں ہمہ حضرت علی علیہ السّلام نے ان لوگوں سے زمینیں اور جائدادیں نہیں چھینیں جو جائز طور پر اُن کے وارث و قابض تھے اور نہ ایسے لوگوں سے دولت چھینی جو جائز طور پر کما کر دولت مند ہوئے تھے البتہ وہ کسی زبردست کو زیردست کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کا موقعہ نہ دیتے تھے اور نہ کسی بڑے کو چھوٹے پر ظلم کرنے کی اجازت یا مہلت کے حق میں تھے بلکہ اس سلسلہ میں اپنی جانب سے معین کردہ تمام حکام دولت کو کڑی نگرانی کی ہدایت کرتے تھے پس ان کے دورِ حکومت میں ہر کمزور کے لئے قصرِ حکومت کے دروازے کھلے تھے اور وہ بلا جھجک اپنے اوپر ہونے والے مظالم کی شکایت کر سکتا تھا اور اس کی دادرسی بھی ہوتی تھی اور ظالموں کو سختی سے کنٹرول میں رکھا جاتا تھا تاکہ امیر امیر رہتے ہوئے غریبوں پر درندوں کی سی نگاہیں نہ اُٹھا سکیں اور غریب غریب رہتے ہوئے بھی امیروں کے دوش بدوش بلا خوف و خطر دنیا کی ریل پیل میں شریکِ مسرت رہیں اور امن و اطمینان سے پر سکون زندگی گذارنے کے قابل ہوں۔

پس اسلامی مساوات۔ عدل و انصاف کا دوسرا نام ہے۔ یعنی عدلیہ کے دروازے امیر و غریب دونو کے لئے یکساں طور پر کھلے ہوں۔ قانون کی تمام شقوق امیر و غریب دونو پر برابر حاوی ہوں۔ انتظامیہ کے دروازوں تک امیر و غریب دونو کے لئے رسائی پوری طرح میسر ہو اور ہر ایک کے لئے عدل و انصاف کی بساط بچھی ہو اور قانونی شکنجہ کی گرفت اس قدر مضبوط ہو کہ نہ منت و زاری سے اس کو ڈھیلا کیا جا سکے اور نہ رشوت و رعب اور نہ دھونس و دھاندلی سے اس میں نرمی پیدا کرنے کی گنجائش ہو۔

غریب کو کچلنے کی ذمّہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟

اگر اس سوال کو سرسری طور پر دیکھا جائے اور جذباتی نظریہ سے اس کا جائزہ لیا جائے تو فوراً اس کا جواب یہی دیا جاتا ہے کہ جاگیردار زمیندار اور دولت مند کارخانہ دار وغیرہ اس سنگین جرم کے مرتکب ہیں لیکن اگر ٹھنڈے دل سے اس کی تہ تک جھانک کر مکمل تفتیش کی جائے تو معلوم ہوگا کہ

جاگیر دار وکارخانہ دار اور زمیندار ودولت مند طبقہ کو اس جُرم کے ارتکاب میں ثانوی حیثیت حاصل ہے دراصل اس جُرم میں قصوروار وہ ذمہ دار افراد ہیں جن کو حکومت وقت کی جانب سے قانونِ ملک کا پاسبان قرار دیا گیا اور انتظامیہ یا عدلیہ کی کرسیاں اُن کے حوالہ کی گئیں اگر یہ لوگ قانون میں ڈھیل پیدا نہ کریں اور آہنی شکنجہ کو اپنی اغراض کے مطابق کم ور نہ کریں اور ان کے نزدیک امیر و غریب دونو باز پرس میں برابر کے شریک رہیں تو کوئی کسی پر تشدد کی نظریں کیوں ڈالے ؟ جب کسی امیر زمیندار ، جاگیر دار اور کارخانہ دار کو علم ہو کہ غریب پر ظلم کرنے کے بعد مجھے نہ قانون معاف کرے گا نہ انتظامیہ و عدلیہ میرے ساتھ رواداری کرے گی اور نہ رشوت و رعب اور نہ دھونس و دھاندلی میرے لئے مفید ثابت ہو گی بلکہ عام مجرموں کیطرح مجھے بھی جیل کی کال کوٹھری میں آہنی سلاخوں کے پیچھے سزا بھگتنے پر مجبور ہونا پڑے گا تو یقیناً غریب پر ظالمانہ برتاؤ کرنے سے پہلے مذکورہ تصورات کا خطرہ خود اس کے لئے درس بن جائے گا اور اس کے ہاتھ ظلم سے خود بخود رک جائیں گے لیکن بخلاف اس کے جب امیر کو پتہ ہو کہ ظلم کرنے کے بعد مجھے پُوچھنے والا کوئی نہیں اول تو غریب کی رپورٹ درج نہ ہو گی اور ثانیاً مجھ سے پُوچھنے کی جُرأت کسی کو نہیں ہو گی اور اگر عدالت تک نوبت پہنچی تو زر و دولت اور دھونس و دھاندلی کے حربوں سے کال کوٹھری سے بچنے کی تدبیر کی جائے گی اور بصورت قید اے کلاس یا بی کلاس مل جائے گی ۔ پس ان حالات کے ماتحت امیر و رئیس اور جاگیر دار و کارخانہ دار اگر ظلم پر آمادہ ہوں تو حکومت کی طرف سے مطمئن ہو کر اور قانونی گرفت کے خطرہ سے بالاتر ہو کر بے دھڑک غریبوں اور بے کسوں کو اپنے مظالم کا نشانہ بنا لیتے ہیں اور دل کھول کر ان کا خون مزے لے لے کر پیتے اور چوستے ہیں ۔ اور اگر غریب طبقہ جوابی کاروائی کرے تو ان کو فوراً قانونی گرفت میں لے کر کچل دیا جاتا ہے پس وہ دوسروں کے لئے باعثِ عبرت بن جاتے ہیں اور اس طرح غریبوں کی ہمت دم توڑ کر ختم ہو جاتی ہے کیونکہ نہ ان کی کوئی سنتا ہے نہ مانتا ہے اور مظلوم ہونے کے باوجود آواز بلند کرنے کی سزا بھی انہی کو بھگتنی پڑتی ہے تو معلوم ہوا کہ غریب کو کچلنے اور بے کسوں کا خون چُوسنے کی ذمہ داری ان ذمہ دار افراد پر عائد ہوتی ہے جو قانون کو سنبھال نہیں سکتے اور ظالم افراد کی چیرہ دستیوں کی روک تھام میں بے لبسی یا بے پرواہی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اس کا علاج صرف یہ ہے کہ جہاں قانون میں امیر و غریب کا فرق ہے اس کو ختم کیا جائے اور جہاں قانون کے محافظ اور عدلیہ کے ذمہ دار افراد اپنے فرائض میں کوتاہی کریں ان سے حکومت سخت طور پر باز پرس کرے کیونکہ جس طرح امراء طبقہ باز پرس سے بالاتر ہو کر غریبوں کو مظالم کا نشانہ بناتا ہے اسی طرح افسرانِ وقت بھی باز پرس سے

بالاتر ہو کر غریبوں کو کچلنے میں اُمراء کا ساتھ دیتے ہیں پس اگر حکمران طبقہ کے دل میں عوام رعایا کا درد ہو اور وہ آفیسران پر کڑی نظر رکھیں اور آفیسران وقت کے دل میں یا تو رعایا کا درد ہو یا حکومت کا خوف ہو پس وہ قانونی شکنجے میں ہر مجرم کو جکڑنے کی جرأت کریں خواہ وہ کسی طبقے سے تعلق رکھتا ہو تو مجال نہیں کہ کوئی کسی کا خون چوس سکے یا کسی کے امن و اطمینان میں خلل انداز ہو سکے۔

پس اسلامی مساوات صرف یہی نہیں کہ زمینداروں سے زمینیں کارخانہ داروں سے کارخانے دولت مندوں سے دولت اور جاگیرداروں سے جاگیریں ضبط کرکے امیر و غریب سب کو برابر کر دیا جائے کیونکہ زندوں سے رُوحِ حیات سلب کرکے سب کو مردہ بنا کر یکساں کرنے سے یہ بہتر ہے کہ مردوں میں رُوحِ حیات پھونک کر اُن کو زندوں کے دوش بدوش چلنے کا موقعہ دیا جائے اسی طرح طاقتور کو کمزور کرکے سب کو کمزوری میں برابر کرنے سے بہتر ہے کہ کمزوروں کی طاقت کو بڑھا کر سب کو طاقتور بنانے کے بعد ایک دوسرے کے دوش بدوش چلنے کے اسباب پیدا کئے جائیں۔ اور بیمار انسان کا علاج یہ نہیں کہ اُسے زہر دے کر ختم کر دیا جائے بلکہ اس کی بیماری کا سراغ لگا کر بیماری کے اسباب کی روک تھام کے لئے مناسب تدابیر اختیار کی جائیں خداوند کریم اگر چاہتا تو دنیا میں جہاں اس نے بھیڑیے اور بکریاں پیدا کی ہیں وہاں بھیڑیوں اور اس قسم کے ظالم درندوں کو پیدا ہی نہ کرتا لیکن اس نے کمزور و طاقتور دونو کو پیدا کرکے کمزوروں کی حفاظت کے لئے انسانوں کو ان کا پاسبان بنا دیا۔ اسی طرح انسانوں میں بھی کچھ شریف طبع اور کچھ درندہ مزاج افراد پیدا کر دیئے اور شریفوں و بے کسوں کی پاسبانی اس نے حکمران قوم کے حوالہ کر دی پس اس کی جانب سے عائد کردہ آئین کا تقاضا یہ ہے کہ طاقت ور سے طاقت چھیننے کے بجائے اس کو قانونِ اسلام کی گرفت سے خوف زدہ کرکے بے بسوں اور بے کسوں پر دست درازی سے روکا جائے اور یہی چیز انسانی سکون بلکہ عالمی امن کو برقرار رکھنے کا واحد اور مؤثر ذریعہ ہے۔

امیر و غریب میں تعاون

قانونی گرفت کے ساتھ ساتھ اسلام نے امیر و غریب کو ایک دوسرے کے قریب تر کرنے اور ایک دوسرے کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے جو تمدنی ذرائع اور اخلاقی ضوابط تشکیل کئے ہیں عالم کی کوئی تہذیب اور دنیا کا کوئی آئین اس سے بہتر پیش نہیں کر سکتا مثلاً ایک طرف امراء طبقہ کو تکبر اور بڑائی سے اجتناب کی دعوت دی تو دوسری طرف غرباء طبقہ کو خودداری اور خود اعتمادی کا جذبہ تعلیم کرتے ہوئے ان کو امراء کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے سے منع فرمایا۔ اسی طرح اُمراء کو غرباء پر صدقہ کرنے کا حکم دیا اور ان کے اموال سے خمس و زکوٰۃ و خیرات وغیرہ کی ادائیگی کو واجب قرار دیا اور غرباء کو امراء کے مال پر للچائی

ہوئی نظریں ڈالنے سے گریز کرنے کی دعوت دی اور مالِ حرام سے بچتے ہوئے اپنے تھوڑے حلال پر قناعت کرنے کا سبق دیا۔ ایک طرف اُمراء کو غریب طبقہ کے لوٹنے سے منع کیا تو دوسری طرف غرباء کو امراء کا مال چرانے سے باز رکھا۔

جہاں ایک طرف امراء کو ظلم سے منع کیا وہاں دوسری طرف غرباء کو صبر و ضبط اور سکون و حوصلہ کی تلقین فرمائی اسی طرح ایک طرف مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی بھائی بنا کر امیر و غریب کو ایک سٹیج پر کھڑا کیا اور ایک دوسرے سے محبّت کے برتاؤ کو ایمان کی علامت قرار دیا اور تشدّد و زیادتی سے منع فرمایا تو دوسری طرف تجاوز اور چشم پوشی کا حکم دے کر انسانیت کے لئے روحانی جنّت کا سامان مہیا فرمایا خداوندِ کریم تمام مسلمانوں کو صحیح اسلامی جذبہ سے سرشار ہونے کی توفیق دے تاکہ امیر و غریب اور حکمران و رعایا سب اللہ کی زمین میں امن و سکون کا سانس لیں۔

حضرت علی علیہ السّلام کی حکومت روشنی کا مینار تھی

اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ حضرت علی کا دَورِ اقتدار درحقیقت پوری اُمتِ اسلامیہ کے لئے روشنی کا وہ بلند مینار ہے جسے جاہ و اقتدار کی آندھیوں نے گرد آلود کرنے میں کامیابی حاصل نہ کی اور آپ کی خلافت ہی صحیح معنوں میں خلافت راشدہ کہلانے کے مستحق ہے۔ جاہ طلبی ہوسِ اقتدار عیش کوشی اور اقربا نوازی کے پرستار حکمرانوں کے لئے حضرت علی کی طرزِ حکومت خارِ چشم تھی۔ ان کے لئے اسلامی طریقِ کار کو اپنانا اور اپنی خواہشاتِ نفسیہ و جذباتِ ذاتیہ کو کچلتے ہوئے قرآنی تعلیمات کا بول بالا کرنا نہایت مشکل ترین امر تھا خصُوصًا وہ لوگ جو صحبتِ نبوی سے فیض یاب نہ ہو سکے تھے یا صحابیت کا لیبل تو اُن پر چسپاں ہو گیا تھا لیکن بہت کم وقت بارگاہِ نبوی کے شرف سے مشرف ہو سکے تھے اور ان کے دلوں سے ابھی زمانہ جاہلیت کی کافرانہ عادات کا زنگ نہیں اُترا تھا۔ حضرت علی کی حکومت میں انتشار پھیلا کر میدانِ سیاست میں آدھمکے اور بالآخر تمام اقتدار ہاتھ میں لے کر اُمتِ اسلامیہ کی گردنوں پر سوار ہو گئے۔ ان لوگوں کے لئے حضرت علی کا طرزِ جہانبانی قطعًا قابلِ عمل تو بجائے خود قابلِ برداشت بھی نہ تھا پس انہوں نے عوام الناس کے رجحانات کو بدلنے اور اپنے اقتدار کا سکہ جمانے کے لئے یہ حربہ نکالا کہ حضرت علی اور اس کے اشیاع پر سب و شتم عام کیا جائے اور ہر مجلس و محفل میں ان کو بدنام کرنے کی سعی بلیغ کی جائے چنانچہ سرکاری آرڈی ننس کے ذریعے اطرافِ مملکت میں اس حیاسوز

تحریک کو قانونی حیثیت دی گئی تاکہ رفتہ رفتہ لوگوں کے دلوں سے علی علیہ السلام کا وقار اُٹھ جائے اور ان کے طرز حکومت کی خوبی کو نظر انداز کرنے کے بعد لوگ اُموی دورِ اقتدار کی دھاندلیوں کو اسلامی سیاست کے رنگ میں ڈھال سکیں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

حقیقت بین نگاہیں بناوٹ کے گھٹاٹوپ اندھیروں کا دامن چاک کر کے شمس حقیقت کا سراغ لگا لیتی ہیں۔ اموی استبداد کی گھناؤنی تاریکیوں کی تہوں کو حقیقت رسا نظریں عدل و انصاف کی قندیلوں کے ذریعے چیرتی پھاڑتی اور اُلٹتی پلٹتی ہوئی قمرِ امامت کی ضیا پاشیوں سے ہمکنار ہو کے رہیں اور الحاد و زندقہ کے دھندلکوں میں جور و اعتساف کی طوفانی موجوں کا مقابلہ کرنے کے بعد ہمت نہ ہارنے والے محقق آخر منزلِ مقصود اور ساحلِ مراد حاصل کر کے رہے اَلصَّحَابَۃُ کُلُّھُمْ عُدُوْلٌ کی مصنوعی آڑ خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِیْ کی فرضی دیوار اور صَحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ کا جعلی حصار اگرچہ سطحی آدمیوں کو مرعوب کر کے حقیقت کی تہوں تک جھانکنے سے روک لیتا رہا لیکن جس قلب میں قندیل انصاف روشن ہو، جس کاسہ سر میں فانوس عقل منور ہو اور جس ذہن میں تحقیق و تدقیق کا مادہ موجود ہو اور پہلو میں عزمِ صمیم موجود ہو وہ اپنے نظر و فکر کو تقلید گذشتگان کا قیدی کیوں بنائے؟ اُسے حق پہنچتا ہے کہ مصنوعی آڑوں فرضی دیواروں اور جعلی حصاروں کے اندر جھانک کر عادلانہ و منصفانہ جائزہ لے۔

چنانچہ اموی اقتدار کا تختہ اُلٹتے ہی اربابِ تحقیق فکر و نظر کے تازی تیز رو پر سوار ہو کر مہمیز عدل و استقلال کے ساتھ میدان میں نکلے تو مصنوعی حصاریں ان کے پائے تحقیق کی ٹھوکر سے پاش پاش ہوئیں اور حق و باطل کی آمیزش کی خطرناک اور افسوسناک سازشوں کی قلعی کھل گئی ہر گوش حق نیوش نے سن لیا۔ ہر حق بین نگاہ نے تاڑ لیا اور ہر منصف طبع انسان نے سمجھ لیا کہ رسالت مآب کے بعد ہوس اقتدار کے متوالوں اور کرسیٔ حکومت کے پرستاروں نے اپنی جاہ پرستیوں کو شرعی غلاف میں چھپانے اور اپنے باطل طریق کار پر حق کا لیبل لگانے کے لئے فرضی احادیث کی آڑیں اُمتِ اسلامیہ کو گرویدہ بنانے کے لئے یہ پروگرام مرتب کیا تھا اور اموی دورِ اقتدار میں باطل پرستی کو مقبولِ عام کرنے کے لئے قائدِ حق اور امامِ عدل کے کردار پر پردہ ڈالنے کے لئے حضرت علی اور شیعانِ علی کو سب و شتم کا نشانہ بنایا گیا تھا تاکہ پشت بہ پشت امام حق پر گالی گلوچ کی بوچھاڑ سننے والی اُمت کبھی بھی ان کے کردارِ حق سے متاثر نہ ہو سکے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مؤرخ اسلامی تاریخ کو مرتب کر رہے تھے محدث احادیث نبویہ کو جمع کر رہے تھے مفسر قرآنی تفاسیر کو عام کرنے کے درپے تھے اور فقہا شرعی ضابطۂ حیات کو ترتیب

دے رہے تھے۔ اگرچہ اکثریت کے اذہان اموی تاریک دور کے تربیت یافتہ تھے جو حضرت علی اور شیعانِ علی کے متعلق اچھی بات سننے اور باور کرنے کے قطعاً عادی نہ تھے لیکن ہر دور میں منصف مزاج گروہ بھی ہوتا ہے اور خدا حق وصداقت کا خود پاسبان ہے وہ ایسے افراد پیدا کر دیتا ہے جو حقیقت رسا ہوتے ہیں پس اسی دورِ تالیف وتصنیف میں اگرچہ بعض مصنفین نے اموی ذہنیت کی لاج رکھی اور حضرت علی کی ہر فضیلت کو جرح وقدح کے ناخنوں سے نوچنا اپنا شیوہ بنایا لیکن بعض مصنفین نے عدل وانصاف کے تقاضوں کو اپناتے ہوئے حضرت علی کے مناقب ومحامد کے نقل کرنے میں بخل نہ کیا اور مجموعی طور پر حضرت علی کے فضائل ومناقب باوجود ناسازگار حالات کے اس قدر منظرِ عام پر آئے کہ جمہوری حکام اور عوامی سلاطین کے مناقب باوجود حالات سازگار ہونے کے اس قدر نہ آسکے اور جب پردہ اُٹھا تو ہر دیکھنے والے نے دیکھ لیا کہ جن لوگوں کو بڑے طمطراق سے خلافتِ راشدہ کا مایۂ ناز حکمران تسلیم کیا گیا وہ بھی لَوْ لَا عَلِیٌّ لَهَلَکَ عُمَر کا نعرہ لگاتا ہوا کرسیٔ اقتدار پر تشریف فرما رہا حضرت علی کی حکومت کا ہر شعبہ بلکہ آپ کی پوری زندگی کا ہر لمحہ اسلامی تعلیمات کا صحیح آئینہ دار رہے۔

کردار میں بلندی

جناب مودودی صاحب خلافت وملوکیت صفحہ ۹ میں فرماتے ہیں "کبھی کسی ایسے شخص سے بازار میں کوئی چیز نہ خریدتے تھے جو آپ کو جانتا ہوتا کہ وہ قیمت میں امیر المومنین ہونے کی بنا پر آپ کے ساتھ رعایت نہ کرے جس زمانے میں حضرت معاویہ سے ان کا مقابلہ درپیش تھا لوگوں نے ان کو مشورہ دیا کہ جس طرح حضرت معاویہ لوگوں کو بے تحاشا انعامات اور عطیے دے دے کر اپنا ساتھی بنا رہے ہیں آپ بھی بیت المال کا منہ کھولیں اور روپیہ بہا کر اپنے حامی پیدا کریں مگر انہوں نے یہ کہہ کر ایسا کرنے سے انکار کر دیا "تم چاہتے ہو میں ناروا طریقوں سے کامیابی حاصل کروں" ان سے خود ان کے بڑے بھائی حضرت عقیل نے چاہا کہ بیت المال سے ان کو روپیہ دیں مگر اُنہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارا بھائی مسلمانوں کا مال تمہیں دے کر جہنم میں جائے۔

بروایت مجاہد ابن عباس بیان کرتا ہے کہ میں نے حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے سنا کہ کانٹوں کے بستر پر بے چینی سے رات بسر کرنا اور زنجیروں میں جکڑ کر گھسیٹا جانا میرے لئے اس سے بہتر ہے کہ دربار خداوندی میں ظالم یا غاصب ہو کر پیش ہوں اور میں ظلم کا ارتکاب کیونکر کر سکتا ہوں جب کہ جانتا ہوں کہ انجام کار فنا ہے اور مدتِ مدید تک زیر خاک رہنا ہے۔ بخدا اگر

آسمان کے نیچے آباد ہونے والی اس دنیا سے سات گنا زیادہ سلطنت مجھے دی جائے اس لئے کہ ایک چیونٹی کے منہ سے ایک جو کا دانہ غصب کر لوں اور اللہ کی نافرمانی کروں تو میں ایسی حکومت کو ہرگز قبول نہ کروں گا اور میرے نزدیک اس دنیا کی حکومت اس پتے سے بھی حقیر تر ہے جو مکڑی کے منہ میں ہو۔ (تذکرہ خواص الامہ (سبط بن الجوزی)

حضرت ابوذر صحابی رسولؐ کو دورِ عثمانی میں مدینہ سے جلاوطن کر دیا گیا تھا اس لئے کہ وہ اقربا پروری ذخیرہ اندوزی اور بیت المال کے ناجائز اخراجات کو ناقابل برداشت قرار دے کر حکومت وقت کے اقدامات پر کڑی نکتہ چینی کرتے تھے جس کو حکومت برداشت نہ کر سکی۔ حضرت امیر المومنین علی علیہ السّلام نے اسی زمانۂ جلاوطنی میں حضرت ابوذر کو ایک خط تحریر فرمایا۔

اما بعد۔ اے ابوذر۔ تم نے خوشنودیٔ خدا کے لئے غصہ کیا لہٰذا اسی سے ہی اپنی امیدیں وابستہ رکھو یہ لوگ اپنی دولت کے بارے میں تجھ سے خوف زدہ تھے اور تمہیں ان لوگوں سے اپنے دین کا خطرہ تھا۔ پس ان کے لئے وہ چیز چھوڑ دو جس کا انہیں تم سے خوف ہے اور جس چیز کا تمہیں ان سے ڈر ہے اُسے لے کر بھاگ جاؤ۔ یہ لوگ درحقیقت اس چیز کے ضرورت مند ہیں (نصیحت و خیر خواہی) جو تم اپنے پاس رکھتے ہو لیکن تم اس چیز سے بے نیاز ہو (مال و دولت) جو یہ اپنے پاس رکھتے ہیں کل (بروز قیامت) راز کھلے گا کہ نفع میں کون رہا (اور خسارے میں کون؟) الخ
(تذکرہ الخواص)

حکومت اور رعایا کے لئے دستور العمل

مودودی صاحب خلافت وملوکیت صد ۹۳ پر رقمطراز ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قیس بن سعد کو مصر کا گورنر مقرر کر کے جو فرمان اہل مصر کے نام بھیجا تھا اس میں وہ فرماتے ہیں۔

خبردار ہو! تمہارا ہم پر یہ حق ہے کہ ہم اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت کے مطابق عمل کریں اور تمہارے معاملات کو اللہ کے مقرر کردہ حق کے مطابق چلائیں۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو نافذ کریں اور تمہارے درپردہ بھی تمہارے ساتھ خیر خواہی کریں۔

اس فرمان کو مجمع عام میں سنانے کے بعد قیس بن سعد نے اعلان کیا کہ "اگر ہم اس طریقہ پر تمہارے ساتھ برتاؤ نہ کریں تو ہماری کوئی بیعت تم پر نہیں ہے" حوالہ الطبری ج ۳ صد ۵۵۰۔

ایک گورنر کو حضرت علیؓ نے لکھا۔

اپنے اور رعیت کے درمیان لمبے چوڑے پردے حائل نہ کرو۔ حکام کا رعیت سے پردہ کرنا نظر کی تنگی اور علم کی کمی کا ایک شاخسانہ ہے اس پردے کی وجہ سے ان کو صحیح حالات معلوم نہیں ہوتے چھوٹی باتیں ان کے لئے بڑی بن جاتی ہیں اور بڑی باتیں چھوٹی ہو جاتی ہیں اچھائی ان کے سامنے برائی بن کر آتی ہے اور برائی اچھائی کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور حق باطل کے ساتھ خلط ملط ہو جاتا ہے۔ حوالہ ابن کثیر ج ۸ صہ۸۔

یہ حضرت علی کا محض قول ہی نہ تھا بلکہ ان کا عمل بھی اس کے مطابق تھا کوفہ کے بازاروں میں خود درہ لے کر نکلتے۔ لوگوں کو برائیوں سے روکتے بھلائیوں کی تلقین کرتے اور تاجروں کی ایک ایک منڈی کا چکر لگا کر یہ دیکھتے تھے کہ وہ کاروبار میں بددیانتی تو نہیں کر رہے ہیں اس روزمرہ کی گشت میں کوئی اجنبی آدمی ان کو دیکھ کر یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ بلاد اسلام کا خلیفہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے کیونکہ نہ ان کے لباس میں بادشاہی کی شان ظاہر ہوتی تھی اور نہ ان کے آگے کوئی چوبدار ہٹو بچو کہتا پھرتا تھا۔ حوالہ ابن کثیر ج ۸ صہ ۴-۵۔

اس مقام پر نہایت مناسب ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی ایک تقریر کا اقتباس پیش کیا جائے جس میں آپ نے سلطان و رعایا کے حقوق کے متعلق تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

"امابعد۔ مجھے خدائے تعالیٰ نے تمہارے اوپر حق ولایت عطا فرمایا ہے تمہارا میرے اوپر ویسے ہی حق ہے جیسے میرا حق تمہارے اوپر ہے۔ مقام بیان میں تو حق کا دائرہ بہت وسیع ہے لیکن مقام عمل میں بہت تنگ اور مشکل۔ اگر ایک مقام پر اس کا فیصلہ کسی کے حق میں ہے تو دوسرے مقام پر اسی کے خلاف ہونا بھی متوقع ہے اگر ایسی ذات تلاش کریں کہ ہر حق فیصلہ اسی کے ہی حق میں ہو اور اس کے خلاف کبھی نہ ہو تو وہ صرف ذات حق سبحانہ ہی ہے کیونکہ بندوں پر اس کو قدرت تامہ حاصل ہے اور قضا کے پیش نظر اس کا عمل عدل سے ہے لیکن بندوں پر اطاعت کو اپنا حق قرار دے کر اپنے فضل و وسعتِ رحمت سے اس کا بدلہ چند در چند مقرر فرمایا ہے اور وہ عطائے مزید کا اہل ہے۔ اس نے اپنے حقوق میں سے بعض حقوق بندوں کی بہبود کے لئے انہی میں سے ایک دوسرے پر عائد کر دیئے ہیں جو اپنے مقام پر ایک دوسرے کے مقابلہ میں ہیں اور اس طرح لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں کہ ایک حق کی ادائیگی دوسرے حق کے وجوب کی باعث بنتی ہے اور ان تمام حقوق میں سے

نہایت اہم بادشاہ و رعایا کے حقوق ہیں جن کو دینی وقار اور باہمی الفت کے کل نظام کو قائم رکھنے کے لئے خدا نے کل افراد پر واجب قرار دیا ہے کیونکہ رعایا کی اصلاح حکام کی اصلاح کے بغیر ناممکن ہے اور حکام کی فلاح رعایا کی استقامت کے بغیر ناشدنی ہے۔ اور جب رعایا کے دلوں میں حکام کے حقوق کا احساس ہو اور حکام رعایا کے حقوق کی پاسداری کو اپنا فریضہ سمجھیں تو حق کا بول بالا ہوگا دین کی راہیں ہموار ہوں گی اور عدل و انصاف کے جھنڈے بلند ہوں گے پس وہ دور بہترین دور ہوگا۔ اور وہ حکومت بہترین حکومت ہوتے ہوئے دوام پذیر بھی ہوگی در یں حالت مملکت کے بدخواہوں کی نظریں اور ان کے اوچھے ارادے قعر یاس و مذلت میں دب کر رہ جائیں گے۔

اور بخلاف اس کے کہ اگر رعایا حکام سے دل برداشتہ ہو اور حکام رعایا کو کچلنے کے درپے ہوں تو اس کا نتیجہ سوائے باہم آویزی کے اور کچھ نہ ہوگا پس ظلم و جور کا علم بلند ہوگا دین کمزور اور سنت متروک ہوگی خود غرضی منظر عام پر آجائے گی احکام معطل ہوں گے۔ قلوب ناصاف ہوں گے بڑی سے بڑی حق تلفی یا بڑی سے بڑی باطل کوشی کا ذرہ بھر بھی احساس نہ رہے گا۔ شرفاء ذلیل ہوں گے اور کمینوں کا وقار بڑھے گا۔

سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا انصاف پسند طبقہ کے نزدیک حکمرانوں کی فخر شعاری اور تکبر مزاجی ان کا انتہائی گھٹیا پن ہے اور میں قطعاً نہیں پسند کرتا کہ تم مجھے ثنا پسند اور اپنی تعریف کا دلدادہ خیال کرو اور بحمد اللہ میں ایسا نہیں ہوں بالفرض اگر مجھے اپنی تعریف پسند بھی ہوتی تب بھی میں اللہ کے لئے تواضع کرتے ہوئے اس کو چھوڑ دیتا کیونکہ عظمت اور کبریائی صرف ذات اقدس الٰہیہ کے لئے مناسب ہے اور بعض لوگ اپنی تعریف سن کر لذت محسوس کرتے ہیں لیکن تم میرے سامنے میری تعریفیں نہ کیا کرو تاکہ اللہ کی جانب سے اور تمہاری طرف سے جو حقوق میرے اوپر عائد ہوتے ہیں ان سے صحیح طور پر عہدہ برا ہو سکوں لہٰذا میرے ساتھ تمہارا اندازِ گفتگو ایسا نہ ہو جیسا جابر حکمرانوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے اور مجھ سے ایسی چیزوں کی بابت خوف زدہ نہ ہوا کرو جو جلد باز سے خوف و ہراس کی موجب ہوا کرتی ہیں نہ میری بے جا خوشامد کیا کرو اور نہ یہ خیال کرو کہ مجھے حق بات کہنے سے میری طبیعت پر بوجھ پڑتا ہے اور نہ میں اپنی بڑائی کا خواہشمند ہوں کیونکہ جو شخص کلمہ حق کو سن نہیں سکتا اس کے لئے عمل کرنا تو زیادہ بار خاطر ہوتا ہے لہٰذا تم لوگ حق کہنے میں کبھی مجھ سے جھجک محسوس نہ کیا کرو۔ اور نہ نیک مشورے دینے میں کوئی باک کرو کیونکہ میں بذاتِ خود قولی یا فعلی خطا سے اپنی ذات

کو مستثنا نہیں کرتا جب تک اللہ ہی کی جانب سے کفایت (عصمت) نہ ہو (یعنی عصمت اس کی ذات کا عطیہ ہے میری عین ذات نہیں ہے) میں اور تم اس رب کے عبد و مملوک ہیں جس کے علاوہ کوئی دوسرا رب نہیں ہے ہمارے نفوس کی ملکیت جس طرح اس کو حاصل ہے ہمیں حاصل نہیں اس نے ہی ہمیں ایک ناموزوں حالت سے نکال کر مناسب اور سزاوار حالت تک پہنچایا ہے اسی نے ہی راہ گم کرنے کے بعد ہدایت اور بصیرت کے راستہ پر کھڑا کیا ہے انتہی لقدر الضرورۃ۔

دین و اسلام ص۱۷۳ و ص۱۷۴

آپ کے ان کلمات میں غور کیجئے۔ کیسے اچھوتے انداز اور نرالے طرز بیان کے ذریعے سے بعد میں آنے والے حکمرانوں کے لئے ایک بہترین دستور العمل پیش فرما رہے ہیں تاکہ وہ فخر و تکبر۔ خواہش نفس و حب مال جاہ پرستی و خود ستائی اور عظمت و نخوت کے پیش نظر اپنے تئیں بھول چوک سے بلند نہ قرار دیں اور اقتدار کے نشہ میں اپنی ہر رائے درست و صائب اور ہر تصرف کو بجا و برمحل نہ سمجھیں لہٰذا مملکت کی خوشحالی و بحالی اور بقا و ارتقاء کے لئے ہر جوڑ توڑ اور ہر حل و عقد کے وقت انہیں ایسی مجلس مشاورت کی طرف رجوع کرنا چاہیے جن کے ممبر ارباب عقل و دانش بلند حوصلہ عالی ہمت دین میں مضبوط خیر خواہی کے علمبردار ملک و ملت کے وفادار، اور اغراض صحیحہ کے حامل ہوں۔ یہ بعینہٖ اسی طرح ہے جس طرح خداوند کریم نے اپنے نبی کو ارشاد فرمایا شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (معاملات میں ان سے مشورہ لیا کرو) حالانکہ ان کی ذاتِ گرامی اپنی قوم و اصحاب کے مشوروں سے بے نیاز تھی۔ آپ حامل وحی تھے اور روح الامین کی آمد و شد کا مقدس آستان آپ کی بارگاہِ فیضِ انتساب تھی اور آپ کے مصاحبین میں اکثریت ایسے بدوی لوگوں کی تھی جو علوم و معارف سے بالکل کورے بلکہ آداب مجلس تک نہ جانتے تھے بایں ہمہ آپ کو ان سے مشورہ لینے کا حکم آنے والے حکمرانوں کے لئے مہمیز عبرت اور تازیانۂ نصیحت ہے لیکن نہ ہر بادشاہ و سلطان اس مکان رفیع پر فائز ہو سکتا ہے اور نہ ہر خلیفہ مثل علی ہو سکتا ہے۔

تقویٰ اور حقوق کے متعلق آپ کے جامع کلمات

مالک اشتر کو مصر کی گورنری پر مامور فرماتے ہوئے آپ نے ان کو ایک وصیت نامہ دیا جس میں تحریر فرمایا:۔

اللہ سے تقوےٰ کرو۔ اس کی اطاعت کو ہر امر پر ترجیح دو اور ان فرائض و سنن کی اتباع کرو جو اللہ نے اپنی کتاب میں ذکر فرمائے کیونکہ اس کے بغیر سعادت ناممکن ہے اور ان کے انکار اور مخالفت میں بدبختی ہے اور دین خدا کی ہاتھ۔ دل اور زبان سے نصرت کرو۔ الخ (دین و اسلام ص۱۸۴)

حضرت حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے وصیت نامہ میں آپ نے فرمایا۔

اے فرزند میں تجھے اللہ کے تقویٰ، اس کی اطاعت، اس کے ذکر سے دل کی تعمیر اور اس کی توفیق سے تمسک کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ تیرے اور اللہ کے درمیان کے باہمی رشتہ سے اور کوئی رشتہ زیادہ قابلِ وثوق نہیں ہے بشرطیکہ تم اس کو تھامے رہو۔ دین و اسلام ص۱۸۵۔

آپ نے فرمایا۔ بیٹا اپنے اور غیر کے درمیان اپنے نفس کو میزان قرار دو۔ پس غیر کے لئے وہی چیز پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرو اور غیر کے لئے ایسی چیز ہرگز گوارا نہ کرو جو تمہیں اپنے لئے گوارا نہ ہو جس طرح تمہیں اپنی ذات پر غیر کا ظلم پسند نہیں اسی طرح اپنی طرف سے غیر پر ظلم کو روا نہ رکھو۔ اور جس طرح تمہیں غیر سے احسان مطلوب ہے اسی طرح تم خود بھی غیروں پر احسان کیا کرو اور جو چیز غیروں سے تمہیں بری معلوم ہوتی ہے وہ اپنے نفس سے دور کرو۔ صاحبانِ خیر یعنی نیک لوگوں سے قرب اختیار کرو تاکہ تمہارا شمار انہی میں سے ہو۔ اپنی مقبوضہ چیز کی حفاظت غیر کی مقبوضہ چیز کی طلب سے بہتر ہے۔ یاس و ناامیدی کی تلخی لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بہتر ہے۔ پاکدامنی کے ساتھ کما کر کھانا اس دولت مندی سے بہتر ہے جو فجور کے ذریعے حاصل ہو۔ کمزور پر ظلم کرنا بدترین ظلم ہے۔

ذلیل مددگار کا نہ ہونا بہتر ہے بخیل دوست کے ہونے میں کوئی خوبی نہیں بھائی کی قطع رحمی کے باوجود بھی اس سے صلہ رحمی کرنے کا بوجھ اپنے نفس پر ڈالو بھائی کی روگردانی کے بعد بھی اس کے ساتھ پیار و محبت سے پیش آؤ۔ اس کے بخل کے مقابلہ میں جود، اس کی سختی کے بدلہ میں نرمی اور اس کے جرم کے بعد قبول عذر کا برتاؤ کرو اور ایسا معلوم ہو کہ وہ تمہارا ولی نعمت ہے اور تم اس کے غلام ہو لیکن یاد رکھنا ایسا برتاؤ بے محل نہ ہو اور نا اہل سے نہ ہو۔

(ملخص دین و اسلام ص۱۸۹ و ص۱۹۰)

علامہ شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء مرحوم حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے ان جامع کلمات کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔ جو شخص غور و فکر اور تدبر و تفحص کرکے حقائق و معانی تک دسترس حاصل کرے اس کو یقین ہوگا کہ سوائے انہی کی ذواتِ مقدسہ کے اس صفت کا خارج میں کوئی مصداق نہیں ہے اگرچہ مکارم اخلاق میں کس قدر ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو کیونکہ اس صفت کا لازمہ یہ ہے کہ انسان حسد، خود پسندی اور تکبر جیسی صفاتِ رذیلہ سے نجات پالے گا بلکہ اس صفت کا وجود جملہ فضائل کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور من جملہ ان کے یہ بھی ہے کہ انسان اپنی دولت و ثروت و دیگر مملوکہ اشیاء میں دوسرے مسلمان بھائیوں کو اپنا شریک سمجھے لیکن جب ہم اپنے حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو دورِ حاضر کی

فضا میں اتنا بھی غنیمت ہے کہ انسان اپنے شر و فساد کو دوسروں سے روک لے ۔ نفع پہنچانا تو در کنار ہماری حالت یہ ہے کہ قہر و غلبہ کی خاطر دوسروں کو نوچنے کے در پے ہوتے ہیں اور اپنے ایمانی بھائیوں کی ہتک عزت کے لئے ہر وقت ان کے عیبوں کی قبریں کھودتے اور خوش ہوتے ہیں بنا بریں ہمیں اس قسم کے فضائل سے کیا واسطہ ؟ بلکہ اس قسم کی باتیں کرنا بھی اس زمانہ والوں کے سامنے سبکی کا موجب ہیں اور لوگ ایسی باتوں کو خرافات سمجھتے ہیں ۔ (خدا ہدایت و اصلاح کا ولی ہے)

دین و اسلام ۔ صفحہ ۱۹۱ ـ ۱۹۲

دانشمندی کے اصول

آپ نے اپنے فرزند اکبر حضرت حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو ایک نصیحت میں ارشاد فرمایا کہ مجھ سے چار اور چار باتیں یاد کر لو کہ ان پر عمل پیرا ہونے کی صورت میں نقصان نہ اٹھاؤ گے ۔

(۱) عقل ہر دولت سے بڑی دولت ہے (۲) حماقت ہر فقر سے بڑا فقر ہے (۳) خود پسندی ہر گھٹیا صفت سے گھٹیا ہے ۔ (۴) حسنِ خلق ہر ذاتی خوبی سے بڑی خوبی ہے ۔

احمق سے دوستی نہ رکھنا کہ فائدہ پہنچاتے پہنچاتے تمہیں نقصان پہنچائے گا ۔ بخیل سے دوستی نہ کرنا کہ شدید ضرورت کے وقت تم سے الگ ہو جائے گا ۔ فاجر سے دوستی نہ رکھنا ۔ کیونکہ چند ٹکوں میں تمہیں ایک دن بیچ دے گا ۔ جھوٹے سے دوستی نہ کرنا کیونکہ وہ سراب کی طرح بے حقیقت ہے (نہج البلاغہ)

آپ نے فرمایا عقلمند کی زبان اس کے دل کے پیچھے ہوتی ہے اور بے وقوف کا دل اس کی زبان کے پیچھے ہوتا ہے ۔ یعنی عقلمند سوچ کر بات کہتا ہے اور بیوقوف بات کہہ کر سوچتا ہے ۔ (نہج البلاغہ)

جس طرح حضرت علی علیہ السلام کی حکومت قیامت تک کے حکمرانوں کے لئے روشنی کا بلند مینار تھی اسی طرح آپ کی سیرت عالمی دانشوروں اور انصاف پسندوں کے لئے پُر امن زندگی میں مشعلِ راہ تھی اور آپ کے پُر از حکمت اقوال علوم حکمیہ اور معارفِ الٰہیہ کا سرچشمہ تھے ۔ اسی بنا پر یہ کہنا بے جا نہیں کہ حضرت علی علیہ السلام کے کلماتِ حکمیہ کو اوّلین و آخرین کے فصحا و بلغا کے کلام سے موازنہ کیا جائے تو آپ کا بعض اوقات ایک جملہ تمام دانشوروں کے اقوال پر بھاری ہو جاتا ہے ۔ خدا وہ دن قریب کرے جب عدل و انصاف کا بول بالا ہو اور دنیا امن و سکون کا گہوارہ بن سکے ۔

۱۳ جولائی ۱۹۷۲ء ۔ مطابق یکم جمادی الثانیہ ۱۳۹۲ھ

صبح سات بجے بروز جمعرات دار العلوم محمدیہ سرگودھا میں تحریر اختتام پذیر ہوئی ۔ والحمد للہ رب العالمین ، وھو الموفق والمعین ۔

تعارف

از قلم عماد الاعلام مولانا نذر حسین صاحب ظفر
مدرس دار العلوم محمدیہ سرگودھا

ثقۃ الاسلام والمسلمین، ناصر الملۃ والدین، العالم النبیل والفاضل الجلیل علامہ حسین بخش صاحب مدظلہ العالی کی ذاتِ گرامی قدر علمی و دینی حلقوں میں محتاجِ تعارف نہیں۔ مملکتِ خداداد پاکستان میں ایسے دینی مدارس کی اکثریت ہے جن میں اکثر و بیشتر افاضل اساتذہ و مدرسین کرام کو آپ کی شاگردی کا شرف حاصل ہے۔

آپ سید الصلحاء، عمدۃ الاتقیاء، استاذ العلماء، العالم العامل، الفاضل الکامل سرکار علامہ محمد باقر شاہ اعلی اللہ مقامہ فی فرادیس الجنان کے قابلِ فخر اور ممتاز تلامذہ میں سے ہیں۔

آپ نے قیامِ پاکستان سے پہلے شیعیانِ پاکستان کے مدارسِ دینیہ، مدرسہ محمدیہ جلالپور ننگیانہ اور پھر علی الترتیب مدرسہ صادقیہ خانپور (ریاست بہاولپور)، دار العلوم المحمدیہ سرگودھا، باب النجف جاڑا ضلع ڈیرہ اسماعیل خان جامع المنتظر لاہور اور دار العلوم الجعفریہ کربلا خوشاب میں مدرسِ اعلیٰ کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہ کر سیکڑوں تشنگانِ علوم کو مذہبِ اہلِ بیت علیہم السلام کی تعلیم دی اور بیسیوں طلبہ کو عالم و فاضل بنا کر ملتِ شیعہ اثنا عشریہ پر احسانِ عظیم فرمایا۔

حوزۂ علمیہ نجف اشرف: سرکار علامہ مدظلہ ۱۹۵۲ء میں باب مدینۃ العلم کی علمی درسگاہ "حوزۂ علمیہ نجف اشرف عراق" میں وارد ہوئے اور اپنی خداداد قابلیت و تدریسی تعلیمی تجربہ کی بدولت حضرات مجتہدین عظام و علمائے اعلام کے درسِ خارج میں حاضر ہونے لگے۔ فقہ، اصول فقہ، حدیث، اصول حدیث وغیرہا اور درسِ خارج کی تکمیل کے بعد جب اپنے وطن مالوف کی طرف مراجعت فرما ہونے لگے تو مجتہدین اعلام نے آپ کو روایت احادیث معصومین علیہم السلام کے اجازاتِ سامیہ اور مرتبہ اجتہاد پر فائز ہونے کی سنداتِ عالیہ عطا فرمائیں اور ان میں متعدد القاب میں آپکی روحانی شان اور علمی وقار کا اظہار فرمایا۔ جیسا کہ آئندہ صفحات پر اجازات و سندات کی مندرجہ عبارات سے واضح ہے۔ آپ نے نجف اشرف سے واپس آکر انتہائی نامساعد حالات کے باوجود اپنے وطنِ مالوف میں جامعہ علمیہ باب النجف جاڑا کی بنیاد رکھی اور توکت لاہوت پر بسر اوقات کرتے ہوئے مدرسہ کی تعمیری و تدریسی تمام تر خدمات کا بیڑا اٹھایا چنانچہ کامیابی نے بڑھ کر قدم چوم لئے اور آج جامعہ علمیہ باب النجف جاڑا ضلع ڈیرہ اسماعیل خان ملک بھر کے ممتاز مدارس دینیہ میں شمار ہوتا ہے اور متعدد طلبہ اس مدرسۂ عالیہ سے فارغ ہو کر نجف اشرف تکمیل علوم کے لئے گئے اور دستارِ فضیلت سر پر رکھ کر مراجعت فرمائے وطن ہوئے۔ اس وقت بھی تیس سے زیادہ ابنائے قوم اس میں زیرِ تعلیم ہیں اور تین فاضل مدرسین فرائضِ تدریس انجام دے رہے ہیں اور مدرسہ مذکورہ کے مصارف کا زیادہ تر بوجھ آپ کے کندھوں پر ہے جسے وہ بخوشی برداشت کئے ہوئے ہیں اور پورے صوبۂ سرحد میں ملتِ جعفریہ کی یہ واحد درسگاہ ہے۔ جو

تشنگانِ علومِ دینیہ کی پیاس بجھانے کی کفیل ہے۔ اس سلسلہ میں آپ کی طرف دستِ تعاون بڑھانا تمام مومنینِ پاکستان کا مذہبی و ملّی فریضہ ہے۔

آپ نے جہاں اپنی ہمّت سے مدرسۂ عالیہ باب النجف کی بنیاد رکھی اور اُسے کامیابی سے ہمکنار کرنے کی جد وجہد جاری رکھ کر منزلِ مراد حاصل کی۔ وہاں تدریسی و تعمیری مشاغل سے وقت بچاکر سلسلۂ تصنیف و تالیف کو جاری فرماکر قوم پر احسان فرمایا۔

چنانچہ سب سے پہلے قرآن مجید کی تفسیر کو آسان اردو زبان میں شائع کرنے کا تہیہ کیا اور بحمداللہ بہترین تفسیر لکھ کر قوم کو علومِ قرآنیہ سے روشناس کرایا اور اس وقت تفسیر کی بارہویں جلد زیرِ طبع ہے۔ تفسیر کا نام انوار النجف فی اسرار المصحف ہے۔ اس کے علاوہ عقائدِ شیعہ پر مبسوط و مدلل کتاب لمعۃ الانوار فی عقائد الابرار اور واقعاتِ کربلا پر مفصّل پیش کش اصحاب الیمین اسی طرح المجالس المرضیہ۔ المجالس الفاخرہ آپ کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔

زیرِ نظر کتاب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب خلافت و ملوکیت کا جوابِ لاجواب ہے۔ ہماری دُعا ہے کہ خداوندِکریم ان کو زیادہ سے زیادہ مذہبِ حقّہ کی خدمت پر موفق فرمائے اور مومنین کرام کو ان سے استفادہ کی سعادت عطا فرمائے۔

نذر حسین ظفر

مدرّس دارالعلوم محمدیّہ سرگودھا

اجازہ اجتہاد و روایت

از حجۃ الاسلام والمسلمین آیۃ اللہ فی العالمین استاد العلماء والمجتہدین العلامہ المیرزا محمد حسن الیزدی اعلی اللہ مقامہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله الذى رفع قدر العلماء وفضل مدادهم على دماء الشهداء وجعلهم ورثة الانبياء وامناء على عباده بعد الحجج والاوصياء والصلوة والسلام على اشرف الانبياء محمد وآله السفراء الامناء الى يوم الجزاء وبعد فان جناب العالم العامل والفاضل الكامل صفوة العلماء العاملين ثقة الاسلام والمسلمين المبرز من الشين آقا شيخ **حسين بخش** جاڑا ساكن ديره اسماعيل خان دامت ايام افاضاته ممن صرف فى النجف الاشرف برهة من عمره وشطرا من دهره فى اكتساب المعالم الالهية والمعالم الدينيه الفقهيه والاصولية من الاساتيد العظام والمدرسين الفخام وقد حضر بحثى ايضاً حضور تفهم وتعمق وتدقيق باحثا فاحصا مجداً مجتهداً حتى فاز بحمد الله تعالى مرتبة من الاجتهاد مقروناً بالصلاح والسداد فلله دره وعليه سبحانه اجره واجزته دامت تائيداته ان يروى عنى كلما صح لى روايته من كتب الاخبار ومصنفات علمائنا الابرار سيما الكتب الاربعة القديمة التى كان عليها المدار فى سالف الاعصار الكافى والفقيه والتهذيب والاستبصار والثلاثة المتاخرة الوافى والوسائل وبحار الانوار واجزت له احتياطاً التصدى فى الامور الشرعية الحسبية واسئل الله تعالى ان يجعله من مروجى الدين ويشيد به احكام خاتم النبيين صلوات الله عليه وآله اجمعين واوصيه بملازمة التقوى والاحتياط وان لا ينسانى من صالح الدعوات كما انى لا انساه ان شاء الله تعالى

فى ١٢ من شهر الشوال المكرم ١٣٧٥ھ

الاحقر ميرزا محمد حسين اليزدى

مہر شریف

ترجمہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس اللہ کے لئے حمد ہے جس نے علماء کا مقام بلند کیا۔ ان کی سیاہی کو شہداء کے خون پر فوقیت بخشی انہیں انبیاء کا وارث بنایا۔ اور آئمہ معصومینؑ و اوصیائے طاہرین کے بعد ان کو اپنے بندوں پر امین مقرر کیا۔ درود وسلام ہو اشرف الانبیاء پر اور ان کی آل پر جو قیامت تک اللہ کی جانب سے مخلوق کی طرف عہدۂ سفارت و امانت پر فائز ہیں۔

امابعد۔ جناب عالم عامل فاضل کامل صفوۃ العلماء العاملین ثقۃ الاسلام والمسلمین آقا شیخ حسین بخش جاڑا (ضلع ڈیرہ اسماعیل خان)، ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے معالم الٰہیہ و شرائع دینیہ کی تحصیل کے لئے عمرِ عزیز کا ایک حصّہ اور قیمتی زندگی کا ایک ٹکڑا نجف اشرف میں صرف کیا۔ عظیم اساتذہ اور بزرگ مدرسین کے فقہی اور اصولی درسوں میں شریک رہے چنانچہ وہ پوری ہمت و محنت کے ساتھ بحث وفحص کے نظریے سے تفہیم وتحقیق اور تعمق و تدقیق کے پیشِ نظر میرے درس خارج میں بھی شریک رہے۔ یہاں تک کہ بحمد اللہ صلاح و سداد کے ساتھ مرتبۂ اجتہاد پر فائز ہوئے۔ ان کی خوبیوں کا کیا کہنا۔ خدا انکو انکا نیک اجر عطا فرمائے۔

میں نے ان کو اجازت دی ہے کہ کتبِ احادیث اور علمائے اعلام کی جملہ تصانیف بالخصوص کتبِ اربعہ کافی فقیہ تہذیب واستبصار اور کتب ثلاثہ متاخرہ وافی وسائل اور بحار الانوار سے روایات نقل کریں اور امور شرعیہ حسبیہ میں پوری احتیاط اور ذمہ داری کے ساتھ تصرف کریں۔ میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ان کو دین کی ترویج کرنے والوں میں قرار دے تاکہ حضرت سیدالانبیاء خاتم النبیینؐ کے احکام کو لوگوں کے دلوں میں پختہ کر سکیں اور میں ان کو تقویٰ و احتیاط کی وصیت کرتا ہوں اور یہ کہ مجھے نیک دعاؤں سے فراموش نہ کریں جس طرح کہ میں بھی ان کو فراموش نہ کروں گا۔ ان شاء اللہ۔

میرزا محمد حسن یزدی

(مہر شریف)

آقائے یزدی مرحوم آیۃ اللہ علامہ شیخ ضیاء عراقی اعلی اللہ مقامہٗ کے شاگرد تھے اور وہ آقائے شیخ محمد کاظم خراسانی صاحب کفایۃ الاصول کے تلمیذ رشید تھے۔ پس اجازۂ روایت کے ماتحت ہمارا سلسلہ اسناد اس طرح ہوگا۔ عنہ قدس سرہ عن استادہ الاوحد وشیخہ الامجد آیۃ اللہ الشیخ ضیاء الدین العراقی عن استادہ خاتمۃ المحققین آیۃ اللہ الشیخ محمد کاظم الخراسانی الی آخرہ

(٣) اجازة الرواية المنتهية اسنادها الى الأئمة الطاهرين عليهم السلام عن الشيخ الفاضل الكامل قدوة العلماء العالمين زبدة العرفاء الكاملين آية الله العلامة الشيخ محمد محسن المدعو بآقا بزرگ الطهرانی المتوفی ١٣٨٩ھ فی النجف حصّلتها فی السادس عشر من جمیدی الثانیه سنة اربع وسبعین بعد الثلمائة والالف ١٣٧٤ھ من الهجرة۔

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله الذی اجاز لنا تحدیث الائمة واجازنا من حیث بلائه والصلوٰة والسلام علی سیدنا خاتم انبیائه وعلی الائمة الاثنی عشر المعصومین خلفائه وبعد فبما ان الحدیث احد الاصلین الاصیلین والاُسین الدلیلین المتفق علی لزوم الاخذ بهما کافة علماء الاسلام من الخاص والعام اعتنی السلف الصالح بحفظ الاحادیث وضبطها وتحملها باحدی الطرق الثمانیة التی اسهلها الاجازة وقد تاسّی بتلک السیرة المرضیة الشیخ الفاضل الکامل العالم العامل الثقة الورع المعتمد الامین جناب المولوی **حُسین بخش** بن الله بخش بن خان محمد ساکن ڈیره اسمٰعیل خان من نواحی اپنجاب الغربی فی پاکستان دام افضاله وکثر فی تلک البلاد اقرانه وامثاله فانه بعد تکمیل علومه سطحا وخارجًا فی جوار باب العلم اعنی قبة الاسلام النجف الاشرف اراد الانصراف الی موطنه لانذار قومه وارشادهم الی امور دینهم واصلاح معادهم وبحسن ظنه استجاز من هٰذا الحقیر فرجدته جدیرا بالاجابة وحریا بالاجازة فاستخرت الله تبارک وتعالی واجزته ان یروی عنی جمیع ما صحت لی روایة وصلحت منی اجازته من مسموعاتی ومروياتی عن مشائخی الاعلام حجج الاسلام وآیت الله فی الانام القاطنین فی العراق والقاهرة والطیبة والبلد الحرام قدس الله اسرارهم بجمیع طرقهم واسانیدهم المذکورة بعضها فی الاسناد المصفی وبعضها فی ذیل المشیخة وسائر الاجازات فلیرو دامت برکاته عنی عنهم لمن شاء واحب ممن استجاز وطلب راجیا عنه وعنهم ان لا ینسونی من الدعاء فی مظان الاجابة وللتبرک بذکر سند معتمد عال وهو ما ارویه عن شیخی العلامة خاتمة المجتهدین والمحدثین الحاج المرزا حُسین النوری المتوفی فی النجف فی (١٣٢٠) عن استاده واستاد الکل الشیخ العلامة المرتضی الانصاری المتوفی (١٢٨١) عن استاده وشیخه الاوحد صاحب المستند المولی احمد النراقی المتوفی (١٢٤٥) عن شیخه واستاده آیة الله بحر العلوم السید مهدی الطباطبائی المتوفی (١٢١٢) عن شیخه الاستاد الوحید الآقا محمد باقر البهبهانی المتوفی بالحائر الشریف (١٢٠٦) عن والده واستاده الاجل المولی محمد اکمل عن العلامة الاعلم المولی محمد باقر المجلسی المتوفی (١١١١) عن والده العلامه المولی محمد تقی بن مقصود علی المجلسی المتوفی (١٠٧٠) عن شیخ الاسلام والمسلمین بهاء الملّة والدین محمد العاملی المتوفی (١٠٣٠) عن والده الشیخ عزالدین حسین بن عبد الصمد الحارثی المتوفی (٩٨٤) عن استاده السعید الشیخ زین الدین الشهید فی (٩٦٦) عن مشائخه المذکورین فی اجازته لوالد البهائی المنقولة صورتها فی کتاب الاجازات

آخر مجلدات بحار الانوار نذكر واحداً منهم وهو الشيخ الفقيه على بن عبد العالى الميسى المتوفى (۹۳۸) عن الشيخ محمد بن محمد بن داؤد المؤذن الجزينى ابن عم الشهيد الاول عن الشيخ ضياء الدين على بن الشهيد عن والده العلامة السعيد الشيخ شمس الدين ابى عبد الله محمد بن محمد مكى الجزينى الشهيد فى (۷۸۶) عن استاده فخر الدين محمد المعروف بفخر المحققين المتوفى (۷۷۱) عن والده واستاده الشيخ جمال الدين ابى منصور الحسن بن يوسف بن المطهر الحلى الشهير بالعلامة المتوفى (۷۲۶) عن استاده الشيخ نجم الدين ابى القاسم جعفر بن الحسن بن يحيى بن سعيد الحلى الشهير بالمحقق الحلى المتوفى (۶۷۶) عن الشيخ تاج الدين الحسن بن على الدربى عن الشيخ ابى عبد الله محمد بن احمد بن شهريار الخازن لمشهد امير المومنين عليه السلام عن شيخه وشيخ الطائفة والى اولاده الشيخ ابى جعفر محمد بن الحسن بن على الطوسى المتوفى (۴۶۰) عن مشائخه المسطورين فى مشيخة كتاب التهذيب بطرقهم المنتهية الى المعصومين عليهم السلام منها روايته عن شيخه واستاده السعيد الشيخ ابى عبد الله محمد بن محمد بن النعمان المفيد المتوفى (۴۱۳)

عن شيخه واستاده الشيخ ابى القاسم جعفر بن محمد بن قولويه القمى المتوفى (۳۶۸) عن شيخه ثقة الاسلام الشيخ ابى جعفر محمد بن يعقوب الكلينى المتوفى (۳۲۹) باسانيده التى ذكرها فى كتابه الكافى المنتهية جميعها الى الائمة المعصومين صلوات الله عليهم اجمعين فليروِ دامت بركاته عنى بجميع هذه الاسانيد مراعيا للاحتياط مراقبا الله تعالى فى سائر الحالات داعيا لهذا الفقير الفانى فى الحياة وبعد الممات حررته وانا المذنب المسيئ محمد محسن المدعو باقا بزرگ الطهرانى فى السادس عشر من جميدى الثانيه سنة اربع وسبعين بعد الثلاثمائة والالف الهجرية.

(مهر شريف)

(۴) وصورة الاجازة والعنعنة المشتملة على اكابر العلماء واعاظم الفضلاء فى الهند

وهو ما ارويه عن سيدى وسندى استاد العلماء العاملين السيد الجليل المولى سيد محمد باقر المتوفى ۱۳۸۵ھ عن استاده المولى سيد شريف حسين جگرانوى عن استاده المحقق الكبير المولى سيد حامد حسين صاحب العبقات عن المولى المفتى السيد محمد عباس عن المولى السيد حسين المعروف (ميرن صاحب) عن المولى سلطان العلماء السيد محمد رضوان مآب كان يعد من اركيا امة محمد عن والده واستاده العالم الكامل المولى سيد دلدار على غفران مآب عن آية الله السيد مهدى بحر العلوم الطباطبائى الخ.

[illegible]

اجازۂ عالیہ

از استاد الفضلا المجتہدین وسناد الفقہاء المتورعین استاد المعقول والمنقول آیۃ العلامہ مُحمّد باقر الزنجانی مدظلہ العالی۔ واز سیّد الفقہا والمجتہدین واورع العلماء العاملین آیۃ اللہ فی العالمین السیّد التقی والسند الرضی المرضی علامۃ الدھر وفہامۃ العصر السیّد محمّد محسن الحکیم اعلی اللہ مقامہ المتوفی ۱۳۹۱ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔ الحمد للہ رب العٰلمین وافضل صلوٰتہ وازکی تحیاتہ علی من اصطفاہ من الاولین والآخرین محمد وآلہ الطیبین الطاہرین واللعنۃ الدائمۃ علی اعدائھم اعداء الدین وبعد فان جناب العالم العامل والفاضل الکامل والمہذب الصفی عماد الاعلام ثقۃ الاسلام المؤید المسدد الآقا شیخ حُسین بخش البنجابی ادام اللہ توفیقاتہٗ وتائیداتہ ممن صرف برھۃ من عمرہ وشطراً صالحاً من دھرہ فی تحصیل العلوم الشرعیۃ وتکمیل المعارف الالٰہیۃ معتکفاً بجوار سیّد المتقین وامام الموحدین امیر المومنین صلوات اللہ وسلامہ علیہ وآلہ الطاہرین مستفیضاً من الاعلام ومستفیداً من الاساتید الکرام وقد حضر شطراً من ابحاث الفقہیۃ حضور جد واجتہاد وتعمق وتامل وتدقیق واتقان وھو بحمد اللہ من الافاضل الاعیان وممن یشار الیہ بالبنان وممن یرجی منہ تائید الدین المقدس الاسلامی وترویج احکام الشریعۃ المقدسۃ اسئل اللہ تعالیٰ شانہ ان یوفقہ ویؤیدہ وینصرہ ولقد اذنت لہ فی ان یتصدی لما یجوز التصدی لہ للمجتہدین العظام والماذونین من قبلھم واجزت لہ ان یروی عنی جمیع ما صحت لی روایتہ من مصنفات اصحابنا قدس اللہ اسرارھم بحق اجازتی عن مشائخی العظام باسانیدھم المفصلۃ فی الفہارست وطرقھم المنتہیۃ الی ارباب الجوامع ومنھم الی اھل بیت الوحی صلوات اللہ علیہم اجمعین واوصیہ بملازمۃ التقویٰ وان لا ینسانی من صالح دعواتہ ان شاء اللہ تعالیٰ کتبہ المحتاج الی مغفرۃ ربہ الکریم **محمد باقر** الزنجانی ۱۳۷۲ھ

(مہر شریف)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وللہ الحمد۔ جناب الشیخ سلمہ اللہ مجاز علی النحو المذکور والنہج المسطور واللہ سبحانہ ولی التوفیق والسداد

محسن الحکیم الطباطبائی

(مہر شریف)

ان دنوں میں آقائے حکیم اعلی اللہ مقامہٗ بیمار تھے اور داخلِ ہسپتال تھے اس لئے الگ اجازہ نہ لکھ سکے اور آقائے زنجانی کے اجازہ کے نیچے تائیدی کلمات تحریر فرما دئیے۔